آدمی جِس نے اپنے آپ کو بُھلا دیا

جرمن کہانیاں



اِنتخاب و ترجمہ

منیر احمد

آدمی جس نے اپنے آپ کو بُھلا دیا

جرمن کہانیاں

اِنتخاب و ترجمہ

منیر الدین احمد

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

۱۹۹۵

نیاز احمد نے

آر۔آر پرنٹرز لاہور سے چھپوا کر

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

سے شائع کی۔

تعداد ـــــ ۵۰۰

قیمت ۲۵۰/۰۰ روپے

ISBN 969 - 35 - 0584 - 0

رفیق احمد اسد کے نام

"انسانی تاریخ مجھ پر بعض اوقات یہ تاثر چھوڑتی ہے،
جیسے وہ کسی درندے کا خواب ہو"

(فریڈریش ہیبل)

فہرست

پیش لفظ

افسانے کی صنف نسبتاً نئی ہے، بالخصوص کہانی کی ان اصناف کے مقابلے میں، جو زمانہ قدیم سے پائی جاتی ہیں، مثلاً اسطوری روایات، قصے، حکایات اور چٹکلے؛ کہانیوں کی نئی اصناف پریس کی ایجاد اور اخباروں، رسالوں اور کتابوں کی اشاعت کے نتیجے میں بتدریج وجود میں آئی ہیں، جن میں ناولٹ اور ناول کے ساتھ بجا طور پر افسانے کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ مگر جو چیز افسانے کو دوسری اصناف ادب سے ممتاز کرتی ہے، وہ اس میں ملحوظ رکھی جانے والی وحدت تاثر ہے۔ اگر ناول پھیلاؤ سے عبارت ہے، تو افسانے میں اختصار کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، یہاں تک کہ انگریزی ادب میں اس صنف کا نام ہی "مختصر افسانہ" (Short Story) قرار پا گیا ہے۔

جرمن افسانہ انگریزی افسانے سے قدرے مختلف ہے۔ مگر یہ بات بھی نہیں ہے کہ دونوں میں قطعاً کوئی رابطہ اور مماثلت نہیں پائی جاتی، یا یہ کہ وہ ایک دوسرے پر اثر انداز نہیں ہوئے۔ ہمارے وقتوں میں یہ امر ناممکن بن چکا ہے کہ کوئی ملک یا ادبی روایت اپنے آپ کو دنیا کی دوسری ادبی روایات سے قطعاً لاتعلق کر لے۔ بیسویں صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی میں نازی پارٹی کے دور اقتدار میں بھی ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ میرے دوست یواخیم زائیپل نے مجھے بتایا کہ اس نے نازی دور میں انگریزی، فرانسیسی اور سکنڈے نیوین ادب کی کتابیں جرمنی میں رہتے ہوئے پڑھی تھیں۔ نازی اقتدار کے دوران ایک وقت البتہ ایسا ضرور آیا جب بعض جرمن ادیبوں کی کتابیں جلائی گئیں یا ان کی اشاعت روک دی گئی۔ مگر غیر ملکی ادب کا داخلہ جرمنی میں بند نہ کیا جا سکا۔ کمیونسٹ ممالک میں بھی، جہاں پر ریاست کو

ذرائع ابلاغ پر پورا کنٹرول حاصل تھا، غیر ملکی لٹریچر کا داخلہ کلی طور پر نہ روکا جا سکا۔

انگریزی ادب میں افسانہ انیسویں صدی کے پہلے نصف میں پیدا ہوا، جب اخباروں میں رپورٹنگ کی غرض سے دلچسپ اور غیر عادی واقعات کو کہانیوں کے رنگ میں لکھنے کا رواج ہوا۔ امریکہ میں ایسی تحریروں کی لمبائی کی حدود تک قائم کی گئیں۔ چنانچہ افسانے کی لمبائی ایک ہزار سے بیس ہزار الفاظ تک متعین ہوئی۔ اگر تحریر اس حد سے آگے نکل جائے، تو وہ "افسانہ" نہیں رہتی، بلکہ ناولٹ (Novelette) بن جاتی ہے۔ یہاں پر اس امر کا کوئی لحاظ نہ رکھا گیا کہ ناولٹ، جو اطالوی ادب کے نویلے (Novelle) سے ماخوذ ہے، ایک ایسی صنف کا نام ہے، جس کے مواد اور بیان کے نہایت واضح خطوط مقرر شدہ ہیں۔ انگریزی سے قطع نظر دوسری یورپی زبانوں میں نویلے (جرمن) یا نویلا (فرانسیسی) کسی غیر معمولی اور ان سنے (انہونے) واقعہ کے بیان پر مشتمل ہوتا ہے، جس کے لئے پس منظر کا بیان، پلاٹ، نقطہ عروج اور کہانی کے اندر ایک یا ایک سے زیادہ "موڑ" ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ نیز یہاں پر ایک مرکزی خیال کو ہیرو کے حوالے سے بیان کرنا مقصود ہوتا ہے۔ انگریزی ادب میں ناولٹ ایک طویل افسانہ اور ناول ایک رومانی داستان کی صورت اختیار کرتا چلا گیا، اگرچہ ناول کے اندر آگے چل کر موضوعات کے اعتبار سے بہت وسعت پیدا ہوئی، جس کا عمل بدستور جاری ہے۔

جرمن ادب میں نویلے کی مقبولیت اٹھارویں اور انیسویں صدی میں اپنے نقطہ عروج پر تھی۔ اسی زمانے میں نویلے کے پہلو بہ پہلو ایک دوسری صنف نے جنم لیا، جسے داستان (Erzählung) کا نام دیا گیا۔ یہ چیز آگے چل کر جرمن ادب کا امتیازی نشان بن گئی، کیونکہ دوسری یورپی زبانوں کے ادبوں میں یہ صنف یا تو سرے سے پائی ہی نہیں جاتی، یا اس میں اور نویلے میں کوئی فرق روا نہیں رکھا گیا۔ اٹھارویں صدی کے اواخر میں یہی صورت حال جرمنی میں بھی ملتی ہے۔ چنانچہ گوئٹے کا یہ قول اس سلسلے میں نقل کیا جا سکتا ہے کہ "جرمنی میں بہت سی تحریریں نویلے کے نام سے پیش کی جاتی ہیں، جو دراصل داستانیں ہیں، یا ان کو کوئی دوسرا نام دیا جانا چاہیئے"۔ انیسویں صدی میں یہ صورت حال بہت حد تک بدل چکی تھی۔ اور

داستان نے اپنی علیحدہ شناخت قائم کر لی تھی ، بلکہ اس حد تک دوسری صنفوں پر فوقیت حاصل کر لی تھی کہ بجائے خود ادیب کو "داستان گو" (Erzähler) کا نام دیا جانے لگا۔ آگے چل کر جب مختصر افسانہ (Short Story) جرمن زبان میں لکھا جانے لگا، تو اس کو داستان (Erzählung) کے نام سے ہی پکارا گیا۔ اس کے باوجود آج تک جرمن زبان میں مختصر داستان (Kurzerzählung) کی اصطلاح کو رائج نہیں کیا جا سکا۔ اس کے مقابلے میں مختصر افسانہ کا تھوڑا بہت استعمال ہونے لگا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جرمن زبان میں کہانی اور تاریخ کے لئے ایک ہی لفظ Geschichte استعمال ہوتا ہے۔

داستان کا میدان جولان دراصل نویلے اور مختصر کہانی کے درمیان تصور کیا جاتا ہے۔ نویلے میں واقعات ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں۔ اور ان کا رخ ایک مرکزی نقطے کی طرف ہوتا ہے، جہاں پر پہنچتے پہنچتے ایک ہنگامی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے، جس کا حل ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں داستان میں واقعات پارہ پارہ ہوتے ہیں، جن کا آپس کا ربط بے حد ڈھیلا، بلکہ اکثر اوقات نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ یہاں پر کرداروں کو دھیرے دھیرے پیش کیا جاتا ہے اور ان کی شخصیت کو آشکار کرنے میں طوالت سے کام لیا جاتا ہے۔ عام طور سے داستان میں اختصار کے مقابلے میں طول طویل بیانیہ طرز تحریر کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس وجہ سے داستانیں افسانے کے مقابلے میں کہیں زیادہ لمبی ہوتی ہیں۔ نویلے بھی اگرچہ افسانے سے زیادہ لمبا ہوتا ہے، مگر اس میں زبان زیادہ گھڑی ہوئی ہوتی ہے، جب کہ داستان میں قلم کو آزادی سے چلنے دیا جاتا ہے۔ جو بات نویلے میں ایک فقرے میں کہی جاتی ہے، اس کے لئے داستان میں تین فقرے استعمال کرنے کو عیب نہیں سمجھا جاتا۔ البتہ دونوں صنفوں میں جگہ اور وقت کے تعین کو ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ایک اور مماثلت ان میں یہ ہے کہ ان کا خاتمہ اپنے اندر کہانی میں اٹھائے گئے سوال یا پیش کردہ مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل لئے ہوئے ہوتا ہے۔ نویلے میں افتتاحیہ، نقطہ عروج اور اختتامیہ بنیادی اکائیاں ہیں۔ ان میں کہانی اپنے منطقی نتیجے پر پہنچ کر ختم ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں نویلے ایک مکمل کہانی پر مشتمل ہوتا ہے۔

جرمن افسانے کا منبع دراصل اس زبان کے ادب میں پائے جانے والی کئی ایک اصناف ہیں، جن کا گذشتہ صدیوں میں رواج تھا۔ ان میں سے بعض اب بھی بدلی ہوئی صورت میں پائی جاتی ہیں۔ مگر اکثر و بیشتر ان کا دوسری اصناف میں ادغام ہو چکا ہے۔ مثلاً مضحکہ خیز یا بہروپیہ کہاوت (Schwank)، جو سولہویں صدی میں مقبول تھی۔ افسانوی ادب میں سرایت کر گئی ہے اور آج اس کا سراغ لگانا مشکل ہو چکا ہے۔ اس کے بالمقابل اسطوری قصے (Legend)، چٹکلے (Anecdote) اور تمثیل (Parable) سے قدم قدم پر واسطہ پڑتا ہے۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ انگریزی شارٹ اسٹوری کے خالقوں میں شمار ہونے والے واشنگٹن ارونگ (Washington irving) نے جرمن اسطورہ اور تمثیلوں کو باقاعدہ طور پر تختہ مشق بنایا تھا۔ صنف افسانہ کو امریکہ اور انگلستان میں مقبول بنانے میں جو کردار اخبارات نے ادا کیا تھا، وہ جرمنی میں کیلنڈروں نے کھیلا۔ جہاں پر اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں کیلنڈر بہت مقبول تھے، اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پبلشروں نے کیلنڈروں میں کہانی چھاپنے کو رواج دیا۔ ان کہانیوں کے ذریعے جو بیشتر صورتوں میں اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کے پیغام کی علمبردار ہوتی تھیں، گھر گھر پڑھی جانے لگیں۔ ان کہانیوں کے مصنفوں میں کئی ایک معتبر ادیبوں کے نام بھی آتے ہیں۔ بیسویں صدی میں برتھولٹ بریشٹ نے باقاعدہ طور پر "کیلنڈر کہانیوں" کو اپنے تربیتی پیغام کو پھیلانے کے لئے استعمال کیا۔ اسی طرح بریشٹ کے ہاں چٹکلے کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ اگر وہ ایک طرف اصلاح معاشرہ کا مبلغ ہے، تو دوسری طرف اس کے اندر ایک ڈرامہ نگار اور ایکٹر کوٹ کر بھرا ہوا ہے، جو ہنسنا اور ہنسانا چاہتا ہے۔ البتہ اکثر صورتوں میں قاری کی ہنسی کہانی کے ختم ہونے تک اس کے گلے میں پھانس بن کر رہ جاتی ہے۔

ناولٹ اور داستان کے مقابلے میں افسانہ نامکمل کہانی سنانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔ اس کا نقطہ آغاز ہنگامی اور غیر متوقع ہوتا ہے، بالکل ایسے جیسے کوئی چلتی گاڑی پر چھلانگ لگا کر سوار ہو جائے۔ افسانہ نگار اپنے قاری کو نہ تو ابتداء میں کہانی کا پس منظر بتاتا ہے اور نہ ہی اپنی کہانی کو ترتیب وار اور منطقی طریق سے

سناتا ہے ۔ بعض اوقات وہ کہانی کو وہاں سے شروع کرتا ہے ، جہاں پر اسے دراصل ختم ہونا چاہیئے ۔ اس طرح وہ متواتر ماضی ، حال اور مستقبل کو آپس میں گڈمڈ کرتا چلا جاتا ہے ۔ اور پھر کسی مقام پر یکدم کہانی کو ختم کر کے قاری کو اکیلا چھوڑ دیتا ہے ، بغیر یہ بتانے کے کہ اس کے بعد کہانی نے کیا موڑ لیا ۔ کہانی کاغذ پر تو ختم ہو جاتی ہے ' مگر قاری کا پیچھا نہیں چھوڑتی اور اسے کہانی کو آگے چلانے پر ، بلکہ اس کو اختتام تک سوچنے پر مجبور کرتی ہے ۔ داستان گو عام طور سے کہانی سناتے ہوئے کنجوسی سے کام نہیں لیتا ۔ جب کہ افسانہ نگار بولنے سے زیادہ خاموشی اختیار کرنے کو ترجیح دیتا ہے ۔ یہاں تک کہ افسانہ گاہے گاہے زیر زمین چلنے لگتا تھا ۔

جہاں جرمن افسانے کو نویلے سے علیحدہ تشخص پیدا کرنے میں بہت جلد کامیابی ہوئی ، وہاں پر اسے داستان سے الگ مقام بنانے پہ بہت وقت لگ گیا ۔ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی تک اس پر داستان گو ادیبوں کا تسلط رہا ۔ چنانچہ تھوماس من کے افسانے داستانوں کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں ۔ یہی حال دوسرے ابتدائی جرمن افسانہ نگاروں کے ہاں نظر آتا ہے ۔ انیسویں صدی کا داستان گو اپنے آپ کو خالق کی جگہ پر سمجھتا تھا ، اور اپنی کہانیوں میں ایک نئی دنیا پیدا کرنے کو اہمیت دیتا تھا ۔ اس کی پوری پوری کوشش ہوتی تھی کہ اس دنیا کی تمام جزئیات پر اس کا قابو قائم رہے ۔ کرداروں کی زندگی کے ساتھ وہ حسب مرضی کھیلتا تھا ۔ وہ ان کی ہر حرکت اور ہر کام ، بلکہ ان کے احساسات اور جذبات تک کو جاننے کا دعویٰ کرتا تھا ۔ چونکہ وہ سب کچھ جانتا تھا ، اس لئے وہ اسبارے میں لکھ سکتا تھا ۔

بیسویں صدی میں ادیب ایسا کوئی دعویٰ نہیں کرتا ۔ وہ ایک ایسی دنیا کا نقشہ پیش کرتا ہے ، جسے ہم نہیں جانتے ، نہ جان سکتے ہیں اور نہ ہی ہم اس کو بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ۔ اس وجہ سے وہ کہانی کو ایک کردار اور اسکی دنیا تک محدود کر لیتا ہے ۔ وہ ہر چیز کو اس کردار کی نظر سے دیکھتا ہے ، جو نہ تو ہر بات کو جان سکتا ہے اور نہ ہی اس میں پوری زندگی کا احاطہ کرنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے ' چنانچہ اوائل صدی سے جرمن ادب میں بیرونی ایکشن کی اہمیت کم ہوتی چلی گئی اور اس کی جگہ باطنی خود کلامی (Monologue) لیتی چلی گئی ۔ کہانی ، جو پہلے واقعات

کی بیساکھیوں کے سہارے پر چلتی تھی ، وہ اب احساسات ، تاثرات اور اندرونی ہیجانات کی طرف توجہ دینے لگی ۔ بلکہ ادب غیر حقیقی دنیا کی طرف متوجہ ہوا ، اگرچہ اس کا مقصود اب بھی حقیقی دنیا کو ہی سمجھنا ہے ۔

بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں ، جب کہ جرمن ادب میں افسانہ اپنا علیحدہ تشخص پیدا کر رہا تھا ، اس کے اندر ایک اندیشے اور شک کی لہر دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے ۔ جس کے اثرات سب سے زیادہ نمایاں فرانز کافکا کی تحریروں میں ملتے ہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ نفسیات کے رواج کے زیر اثر جرمن ادب میں انسانی سائیکی کے مطالعہ کو اہمیت دی جانے لگی ۔ اور پہلی بار کھل کر جنسی مسائل کو پیش کیا جانے لگا ۔ معاشرے پر تنقید ، جس میں بالخصوص جارحانہ قومیت اور اس کے نتیجے میں ہونے والی جنگ کو مرکزی مقام دیا گیا ، ایک باقاعدہ تحریک کا رنگ اختیار کر گئی ۔ یہی وجہ تھی کہ جب نازی پارٹی نے اقتدار سنبھالا ، تو سب سے پہلے ادب پر شب خون مارا گیا اور ادیبوں کو قوم پرستوں اور غیر قوم پرستوں میں باٹتا گیا ۔ درجنوں ادیبوں کو ملک سے ہجرت کرنی پڑی ۔ ان میں سے بہتیرے ہمیشہ کے لئے غیر ملکوں میں بس گئے ۔ اور جو واپس لوٹے ، وہ اپنے ساتھ دوسری زبانوں اور ثقافتوں کے اثرات لے کر آئے ۔ مگر جہاں تک مختصر افسانے کا تعلق ہے ، اس میں ان لوگوں سے زیادہ نئی نسل کے ادیبوں کا حصہ ہے ، جنہوں نے دوسری عالمگیر جنگ کے بعد لکھنا شروع کیا ۔ ان کے موضوعات میں جنگ کے تجربات کو ابتداً اولیت حاصل تھی ، آگے چل کر عصری انسان کے اکلاپے اور اس کی بے بسی کی داستان ، مستقبل کا خوف اور سرد جنگ کے موضوعات اہمیت اختیار کرتے چلے گئے ۔ فرانز کافکا ، جو دوسری جنگ عظیم کے خاتمے تک جرمنی میں غیر معروف تھا ، کیونکہ اس کی کتابوں کے چھاپنے کی اجازت نہ تھی ، پہلی بار جرمن ادب میں ابھرا ۔ اور اگرچہ سب نے اسے پڑھا اور ہر کوئی اس سے متاثر ہوا ، مگر اس کی پیروی اس رنگ میں ، جیسی مثلاً اردو ادب میں کی گئی ، جرمن ادب میں نظر نہیں آتی ۔ اس کے باوجود جرمن ادب میں اس کی کہانیوں کی اثر پذیری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد جرمن ادب میں ایک غیر معمولی تبدیلی یہ آئی کہ

اس کا سکوپ بڑھتا چلا گیا۔ چنانچہ ادیب، جنہوں نے جنگ میں حصہ لیا تھا، دوسرے ملکوں اور قوموں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور جن کو ہجرت کے جہنم میں سے گزرنا پڑا تھا، ان کی کہانیوں میں بین الاقوامیت اس طرح سرایت کر گئی ہے، جیسے سمندر کے پانی میں نمکیات گھل مل جاتے ہیں۔ اس انتخاب پر ایک نظر ڈالنے سے قاری جان جائے گا کہ موضوعات کے تنوع کے ساتھ ساتھ جرمن ادب میں ایک آفاقی وسعت پیدا ہو چکی ہے، جس کی مثال دوسرے عصری ادبوں میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔

میری سابقہ کتاب "معاصر جرمن ادب" میں انیس افسانے شامل تھے، جن کے تخلیق کاروں میں بین الاقوامی شہرت رکھنے والے ادیبوں فرانز کافکا، برتھولٹ بریشٹ، ٹراون، بلوخ، بورشرٹ، بُیل وغیرہ کو نمائندگی دی گئی تھی۔ ان میں سے بعض "منتخب جرمن ادب" میں اپنی دوسرے کہانیوں کے ساتھ شامل ہیں۔ البتہ قاری کو اس انتخاب میں دوسرے معروف ناموں (انا زیگرس، ایلیاس کانیتی، زیگفریڈ لینز) کے ساتھ اور بہت سے غیر معروف نام ملیں گے، جن کو جرمنی سے باہر بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ اس انتخاب میں تیس افسانے شامل ہیں اور اس امر کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ اس میں سابقہ مشرقی اور مغربی جرمنی کے ساتھ ساتھ آسٹریا اور سوئیٹزرلینڈ کو نمائندگی دی گئی ہے، جہاں پر جرمن زبان بولی اور لکھی جاتی ہے۔ ٹراون ان ادیبوں کی نمائندگی کرتا ہے، جو جرمنی سے ہجرت کر کے دوسرے ملکوں میں جا بسے تھے اور اپنے وطن واپس نہیں لوٹے یا بے وطنی میں مر گئے۔ البتہ ٹراون شاید پہلا ایسا ادیب تھا، جس نے پہلی جنگ عظیم کے بعد جرمنی کو خیر باد کہا تھا۔ کانیتی اگرچہ عثمانی ترکی کے وقت میں بلگاریہ میں پیدا ہوا، مگر اس نے اپنے لئے جرمن کو ادبی زبان کے طور پر اختیار کیا۔ اس کی "گٹھڑی" کو میں نے مراکش کے جامع الفناء میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ میں بھی دیر تک کھڑا اس انسانی ہیولے کو دیکھتا رہا تھا اور میرے دل میں بھی ویسے ہی جذبات پیدا ہوئے تھے، جن کی بناء پر یہ لازوال افسانہ لکھا گیا۔ اس بے حد مختصر افسانے میں ایلیاس کانیتی اپنے فن کی معراج پر ہے، جس کی بدولت اسے ادب کا نوبل پرائز دیا گیا تھا۔ وہ پہلا غیر ملکی جرمن ادیب ہے، جسے یہ

انعام ملا۔ اس مجموعے میں کوئی دوسرا ادیب شامل نہیں ہے، جس کو یہ انعام ملا ہو، اگرچہ ان میں سے قریب قریب ہر ادیب کسی نہ کسی ادبی انعام کا مستحق قرار پا چکا ہے۔ ماریو سیننیشی یوگوسلاویہ میں پیدا ہوا، مگر ہنگری کا رہنے والا تھا۔ اس نے جرمنی کو اپنا وطن بنایا اور جرمن ادب کو لازوال کہانیوں کا تحفہ دیے کر مرا۔ وہ ایک زمانے میں ہمبرگ کے مضافاتی قصبہ پنے برگ میں ہمارا ہمسایہ تھا۔ ہمارے تعلقات اس کے بچوں اور اس کی بیوی مائیکے کے ساتھ، جو اس دوران میں مصوری میں نام پیدا کر چکی ہے، آج بھی دوستانہ ہیں۔

اس مجموعہ کی ترتیب افسانہ نگاروں کی پیدائش کے سن کے اعتبار سے کی گئی ہے۔ اس طرح قارئین کو جرمن افسانے میں بیسویں صدی کے دوران ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھنے میں آسانی رہے گی۔ بالخصوص اسلوب کے اندر آنے والا انقلاب اور مواد میں پیدا ہونے والا تنوع اس طریق سے دکھایا جا سکتا ہے۔ البتہ زندگی کے بارے میں افسانہ نگاروں کے نظریات کو سمجھنے کے لئے قارئین کو متن کی سطح سے نیچے اتر کر اس دریا میں غوطہ لگانا ہوگا، جو زیرِ زمین چلتا ہے۔ اب یہ چیز میں قارئین کی ذاتی استطاعت پر چھوڑتا ہوں کہ وہ کس قدر گہرا غوطہ لگاتے ہیں اور کون سے گوہر لے کر ابھرتے ہیں۔

اگر قارئین کو اس انتخاب میں بعض مشہورِ عالم جرمن ادیبوں کے نام نظر نہ آئیں، تو اس سے یہ نتیجہ نہ نکالا جائے، کہ مجھے ان سے کوئی بیر ہے۔ عین ممکن ہے کہ ان کے افسانے میرے اگلے انتخاب میں شامل ہوں گے۔ میں اس سلسلے کو جاری رکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں، و باللہ التوفیق

منیر الدین احمد

۲۸۔ اگست ۱۹۹۴ء
کمر فیلڈ

فرانز کافکا

Franz Kafka

مختصر داستان

"ہائے ہائے" چوہے نے کہا: "دنیا دن بدن تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ ابتداء میں وہ اس قدر وسیع تھی کہ مجھے ڈر لگتا تھا۔ میں چلتا گیا اور خوش ہوا، جب میں نے بہت دور دائیں اور بائیں دیواریں دیکھیں۔ مگر یہ طویل دیواریں اس قدر سرعت کے ساتھ ایک دوسرے کی جانب لپک رہی ہیں کہ اب میں آخری کمرے میں آن پہنچا ہوں اور وہاں پر کونے میں ایک پنجرہ دھرا ہے۔ جس کا میں نے رخ کر رکھا ہے"۔

"تمہیں چاہیئے کہ اپنی دوڑ کی سمت کو بدلو"۔ بلی نے کہا اور اسے ہڑپ کر گئی۔

١٦

ب ۔ ٹراون
B. Traven

مہا کارخانہ دار

ریاست اواساکا کے ایک چھوٹے سے ریڈ انڈین گاؤں میں ایک روز ایک امریکن وارد ہوا، جو ملک اور اس کے باسیوں کا مطالعہ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ادہر ادہر پھرتے پھراتے وہ ایک انڈین کسان کی جھونپڑی پر پہنچا، جو اپنی واجبی سی آمدنی میں اس طرح اضافہ کرتا تھا کہ اپنے فالتو وقت میں، جو مکئی کے کھیت میں کام کاج سے بچ جاتا تھا، چھوٹی چھوٹی پٹاریاں بناتا تھا۔

یہ پٹاریاں ریشے سے بنی جاتی تھیں، جسے مختلف رنگوں میں، جنہیں انڈین پودوں اور لکڑیوں سے نکالتا تھا، رنگا جاتا تھا۔ اس آدمی کو ہمہ رنگ ریشے کو اس قدر فنی مہارت سے بننا آتا تھا کہ جب پٹاریاں بن جاتی تھیں، تو یوں لگتا تھا کہ وہ مجسموں کی تصویروں، نقش ونگار، پھولوں اور جانوروں سے ڈھکی ہوئی ہوں۔ یہ امر کہ نقش ونگار پٹاریوں پر چڑھائے نہیں جاتے تھے، بلکہ پوری کاریگری سے بنے جاتے تھے، اس کو وہ شخص بھی پٹاریوں کے اندرونے میں ایک نظر ڈالنے سے جان جاتا تھا، جسے ان باتوں کی کوئی شد بد نہ ہو۔ کیونکہ اندر تمام نقش ونگار عین ویسے ہی دکھائی دیتے تھے، جیسے باہر سے۔ پٹاریوں کو انسان سلائی کے ڈبے کے طور پر یا زیور رکھنے کے لئے استعمال کر سکتا تھا۔

جب انڈین صناعی کے ان نمونوں کے لگ بھگ بیس نگ تیار کر لیتا تھا اور وہ اپنی کھیتی باڑی کو ایک روز کے لئے چھوڑ سکتا تھا، تو وہ منہ اندھیرے رات کے دو بجے شہر کی سمت میں چل دیتا تھا، جہاں پر وہ پٹاریوں کو منڈی میں فروخت کے لئے رکھتا تھا۔ منڈی کی فیس اسے دس سینتاوس دینی پڑتی تھی۔

اگرچہ اس کو ہر پٹاری کے بنانے پر کئی روز لگ جاتے تھے، وہ کبھی پچاس

سینتاوس سے زیادہ نہ مانگتا تھا۔ اور اگر خریدار کہتا تھا کہ قیمت بہت زیادہ ہے اور بھاؤ کرنے لگ جاتا تھا، تو انڈین پینتیس، تیس بلکہ پچیس سینتاوس پر آجاتا تھا، بغیر یہ جاننے کے کہ یہ بہتوں بلکہ اکثر فنکاروں کی قسمت میں لکھا ہوا ہے۔

بہت دفعہ یہ بھی ہوتا تھا کہ انڈین اپنی ساری پٹاریاں، جنہیں وہ منڈی میں لایا ہوتا تھا، نہیں بیچ پاتا تھا، کیونکہ میکسیکو کے بے شمار باسی یہ دکھانے کے لئے کہ وہ مہذب ہیں، ایسی چیزیں خریدنا زیادہ پسند کرتے ہیں، جو ایک بڑے کارخانے میں بیس ہزار نگ روزانہ کے حساب سے بنائی جاتی ہیں، مگر ان پر ویانا یا ڈریسڈن کی آرٹ گیکری کی مہر لگی ہوتی ہے، بجائے اپنے وطن کے ایک انڈین کی بنائی ہوئی چیزوں کے انوکھے پن کی قدر دانی کرنے کے، جو دو نگ بھی ایسے نہیں بنا سکتا، جو ایک جیسے ہوں۔

اگر انڈین اپنی ساری پٹاریاں فروخت نہ کر پاتا تھا، تو وہ باقی ماندہ کو لے کر دوکانوں کا چکر لگاتا تھا، جہاں پر اس کے ساتھ کبھی سخت سست الفاظ کے ساتھ، لاپرواہی سے، دھتکارنے والے یا اکتاہٹ کے اشارے سے سلوک کیا جاتا تھا، جس طرح در در پھیری کرنے والوں، کتب فروشوں یا تصویروں کے فریم بیچنے والوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

انڈین اس سلوک کو سہتا تھا، جیسے سبھی فنکار، جو دراصل تن تنہا اپنے فن کی قدر وقیمت کو جانتے ہیں، اسے برداشت کرتے ہیں۔ وہ نہ تو غمگین ہوتا تھا یا غصے میں آتا تھا اور نہ ہی اس کا مزاج اس وجہ سے بگڑتا تھا۔

اس در در کی پھیری کے دوران اسے اکثر محض بیس، بلکہ پندرہ اور دس سینتاوس کی پیش کش کی جاتی تھی اور اگر وہ اس معمولی رقم کے بدلے فروخت کرتا تھا، تو بیشتر اوقات یوں ہوتا تھا کہ عورت پٹاری کو لے کر بغیر اس کو ٹھیک سے دیکھنے کے اور پھر اس کی موجودگی میں پاس کے میز پر پٹخ دیتی تھی، یوں، جیسے کہہ رہی ہو: "یہ رقم تو بالکل فضول خرچ ہو گئی۔ مگر میں اس غریب انڈین کو کچھ کمائی کرنے دینا چاہتی تھی۔ وہ آخر اتنے دور سے آیا ہے"۔ "کہاں کے رہنے والے ہو تم؟"۔ "تلاکوتیپک کے۔ کیا تم میرے لئے چند فیل مرغ نہیں لا سکتے؟ خوب وزن دار، مگر

سستے، وگرنہ میں نہیں لوں گی "۔

امریکن فنکاری کے ان چھوٹے چھوٹے نمونوں کی نعمت سے اس طرح مالا مال نہیں ہیں، جیسے میکسیکو کے باسی، جو ماسوائے چند لوگوں کے نہیں جانتے اور سمجھتے کہ ان کے ملک میں کون کون سی بیش بہا چیزیں پائی جاتی ہیں۔ گو ایک عام امریکن ان بے مثل چیزوں کی کماحقہ قدر و قیمت کو نہیں جانتا، اس لئے بیشتر صورتوں میں وہ فوراً سمجھ جاتا ہے کہ یہاں پر عوامی فن کا نمونہ پایا جاتا ہے اور چونکہ اس کے اپنے ملک میں اس کا فقدان ہے، اس لئے وہ آناً فاناً پہچان کر قدر و قیمت کا اندازہ لگا لیتا ہے۔

انڈین اپنی جھونپڑی کے باہر زمین پر اکڑوں بیٹھا ہوا پٹاریاں بن رہا تھا۔

امریکن نے پوچھا: "دوست، ایک پٹاری کا دام کیا ہے؟"

"پچاس سینتاوس، سینیور" ۔ انڈین نے جواب دیا۔

"خوب، میں ایک خریدتا ہوں اور مجھے پتہ ہے کہ میں اس سے کس شخص کو خوش کر سکتا ہوں" ۔ اس کا خیال تھا کہ ایک پٹاری کی قیمت دو پیسو (ایک پیسو میں ایک سو سینتاوس ہوتے ہیں) ہو گی۔

جب یہ حقیقت اس پر کھل گئی تو اس کو فوراً کاروبار کی سوجھی۔

اس نے پوچھا: "اگر میں آپ سے دس پٹاریاں خریدوں، تو فی پٹاری کیا قیمت ہو گی" ۔

انڈین نے کچھ دیر تک سوچا اور کہا: "تب ایک پٹاری کی قیمت پینتالیس سینتاوس ہو گی" ۔

"آل رائیٹ، بہت خوب۔ اور اگر میں ایک سو خریدوں، تو فی پٹاری کیا قیمت ہو گی؟"

انڈین نے کچھ دیر تک حساب لگایا: "تب ایک پٹاری کی قیمت چالیس سینتاوس ہو گی" ۔

امریکن نے چودہ پٹاریاں خریدیں۔ بس اتنی پٹاریاں انڈین کا کل اسٹاک تھیں۔

جب امریکن نے گمان کر لیا کہ وہ میکسیکو کو دیکھ چکا تھا اور تمام معلومات حاصل کر چکا تھا، جو میکسیکو اور وہاں کے باسیوں کے بارے میں جاننے کے لائق تھیں، تو وہ نیویارک واپس لوٹ گیا۔ پھر اپنے کام کاج کے دوران اسے پٹاریاں یاد آئیں۔

وہ چاکولیٹ کے تھوک کے بیوپاری کے پاس گیا اور اسے کہا: "میں آپ کو ایک پٹاری کی پیش کش کرتا ہوں، جسے اعلیٰ درجے کی چاکولیٹ کے لئے بے حد انوکھے تحفے کی پیکنگ کے لئے استعمال میں لایا جا سکتا ہے"۔

چاکولیٹ کے تھوک کے بیوپاری نے پٹاری کو بڑے ماہرانہ انداز میں دیکھا بھالا۔ اپنے شریک کاروبار کو اور پھر اپنے مینجر کو بلا بھیجا۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ اور بیوپاری نے کہا: "میں کل آپ کو قیمت بتاؤں گا، جو میں ادا کرنے کے لئے تیار ہوں یا آپ دام بتانا چاہتے ہیں؟"

"میں، نے آپ کو بتایا ہے کہ میں آپ کی پیش کش کو دیکھ کر بتا سکوں گا کہ آیا آپ کو پٹاریاں مل سکتی ہیں یا نہیں۔ میں انہیں صرف اس فرم کے پاس فروخت کروں گا، جو مجھے سب سے زیادہ داموں کی پیش کش کرے گی"۔

اگلے روز میکسیکو کا ماہر دوبارہ بیوپاری کے پاس گیا۔ بیوپاری نے کہا: "میں اس پٹاری کو عمدہ ترین چاکولیٹ سے بھر کر چار یا شاید پانچ ڈالر قیمت مانگ سکتا ہوں۔ یہ بہت انوکھی اور خوبصورت ترین پیکنگ ہے، جو آج تک ہم نے مارکیٹ میں پیش کی ہے۔ میں اس کے لئے اڑھائی ڈالر فی پٹاری دینے کو تیار ہوں۔ وصولی کی بندرگاہ نیویارک، کسٹم ڈیوٹی اور مال برداری کا خرچہ میرے ذمہ، پیکنگ آپ کی ہو گی"۔

ماہر میکسیکو نے حساب لگایا۔ انڈین نے اسے ایک سو پٹاریوں کی خریداری کی صورت میں چالیس سینتاوس کی پیش کش کی تھی۔ یہ بنے بیس سینٹ۔ وہ انہیں اڑھائی ڈالر میں بیچے گا۔ اس طرح اس کا منافع ہر نگ پر دو ڈالر تیس سینٹ ہو گا۔ گویا بارہ سو فیصد"۔

"میرا خیال ہے کہ میں آپ کو مال اس قیمت پر دے سکتا ہوں"۔ اس نے کہا۔

اس پر بیوپاری نے جواب دیا: "مگر ایک ضروری شرط کے ساتھ۔ آپ کو مجھے اس پٹاری کے کم از کم دس ہزار نگ مہیا کرنے ہوں گے۔ اس سے کم تعداد میرے لئے بیکار ہے۔ کیونکہ اس صورت میں پبلسٹی کا خرچ بھی نہیں نکلے گا، جو مجھے اس نئی چیز کے لئے کرنی ہو گی۔ اور پبلسٹی کے بغیر میں یہ قیمت وصول نہیں کر سکتا"۔

"منظور ہے"۔ ماہر میکسیکو نے کہا۔ اسے اندازاً چوبیس ہزار ڈالر کی کمائی ہو گی، جس میں سے سفر خرچ منہا ہو جائے گا۔ اور نزدیکی ریلوے اسٹیشن تک کی مال برداری کا خرچہ۔

وہ فوراً میکسیکو کے لئے روانہ ہو گیا اور انڈین کے پاس پہنچا۔

"میں آپ کے لئے ایک بہت بڑا کاروبار لے کر آیا ہوں"۔ اس نے کہا: "کیا آپ دس ہزار پٹاریاں بنا سکتے ہیں؟"

"جی ہاں، میں انہیں بخوبی بنا سکتا ہوں۔ جتنی آپ کا دل چاہے۔ اس پر بس کچھ وقت لگے گا۔ ریشے کو احتیاط کے ساتھ تیار کرنا ہوتا ہے۔ اس پر وقت لگ جاتا ہے۔ پٹاریاں جتنی آپ چاہیں میں بنا سکتا ہوں"۔

امریکن نے سوچا تھا کہ انڈین جب اس بڑے آرڈر کو سنے گا، تو نیم پاگل ہو جائے گا، کسی امریکن موٹر ڈیلر کی طرح، جس نے بیک وقت پچاس ڈوج برادرز بیچ دی ہوں۔ مگر انڈین نے ذرہ بھر جوش وخروش کا اظہار نہ کیا۔ وہ اپنے کام کو چھوڑ کر اٹھا تک نہیں۔ اور اطمینان کے ساتھ اپنی پٹاری کو بنتا رہا، جسے اس نے ہاتھ میں اٹھا رکھا تھا۔

امریکن نے سوچا کہ شاید مزید پانچ سو ڈالر کمائے جا سکتے تھے، جن سے سفر خرچ نکل آئے گا، کیونکہ اتنے بڑے آرڈر کے ذریعہ یقیناً فی پٹاری کی قیمت کو کسی قدر دبایا جا سکتا تھا۔

"آپ نے مجھے کہا تھا کہ آپ پٹاری چالیس سینتاوس میں دے سکتے ہیں، اگر میں ایک سو کا آرڈر دوں"۔ اس نے کہا۔

"جی ہاں، یہ میں نے کہا تھا"۔ انڈین نے تصدیق کی۔ "جو بات میں نے کہہ دی ہے، اس پر قائم رہوں گا"۔

"خوب" امریکن نے کہا: "مگر آپ نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ اگر میں ایک ہزار کا آرڈر دوں، تو قیمت کیا ہو گی"۔

"آپ نے اس بارے میں مجھ سے نہیں پوچھا تھا سینیور"۔

"درست ہے۔ مگر میں اب آپ سے قیمت پوچھتا ہوں۔ اگر میں ایک ہزار یا دس ہزار کا آرڈر دوں"۔

اب انڈین نے اپنے کام کو حساب لگانے کے لئے روک دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا: "یہ مشکل کام ہے۔ اس کا حساب میں اتنی جلدی نہیں لگا سکتا۔ اس پر میں ایک رات گذاروں گا اور کل آپ کو بتا سکوں گا"۔

امریکن اگلے روز انڈین کے پاس نئی قیمت سننے کو آیا۔

"کیا آپ نے ایک ہزار اور دس ہزار نگوں کی قیمت کا حساب لگا لیا ہے؟"

"جی ہاں، میں نے لگا لیا ہے سینیور۔ اس پر میں نے بہت محنت کی ہے اور احتیاط برتی ہے صحیح حساب لگانے میں۔ اگر مجھے ایک ہزار نگ بنانے ہوں گے، تو قیمت فی نگ دو پیسو ہو گی۔ اور اگر مجھے دس ہزار نگ بنانے ہوں گے، تو قیمت فی نگ چار پیسو ہو گی"۔

امریکن کو یقین تھا کہ اس نے بات کو ٹھیک سے نہیں سمجھا تھا۔ شاید اس کا سبب اس کی کمزور ہسپانوی زبان تھی۔

غلطی کا ازالہ کرنے کے خیال سے اس نے پوچھا: "دو پیسو فی نگ ایک ہزار کی تعداد پر اور چار پیسو دس ہزار کی صورت میں۔ مگر آپ نے مجھے خود کہا تھا کہ ایک سو نگ کی صورت میں چالیس سینتاوس کی لاگت آئے گی"۔

"یہ بات درست ہے۔ میں آپ کے پاس ایک سو کی تعداد میں فی نگ چالیس سینتاوس میں فروخت کروں گا"۔ انڈین بالکل پر سکون رہا، کیونکہ اس نے ہر چیز کا حساب لگایا تھا اور جھگڑا کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ "سینیور، آپ کو خود تسلیم کرنا پڑے گا کہ مجھے ایک سو کے مقابلے میں ایک ہزار نگ بنانے پر کہیں زیادہ کام کرنا پڑے گا۔ اور ایک ہزار کے مقابلے میں دس ہزار پر اس سے بھی زیادہ محنت کرنی پڑے گی۔ یہ بات ہر عقل مند انسان سمجھ سکتا ہے کہ مجھے ایک ہزار کے

لئے کہیں زیادہ ریشے کی حاجت ہو گی۔ اور کہیں زیادہ وقت رنگوں کو تلاش کرنے میں اور ان کو پکانے میں لگے گا۔ ریشہ بنا بنایا تھوڑا ہی پڑا ہوتا ہے۔ اس کو خوب اچھی طرح اور احتیاط کے ساتھ سکھانا ہوتا ہے۔ اور اگر مجھے اتنی ہزار پٹاریاں بنانی ہوں گی، تو میرے مکئی کے کھیت کا اور میرے چوپایوں کا کیا بنے گا؟ اس صورت میں میرے بیٹوں، بھائیوں اور بھتیجوں اور چچا کو بننے میں میرا ہاتھ بٹانا پڑے گا۔ تو ان کے کھیتوں اور چوپایوں کا کیا بنے گا؟ یہ بہت مہنگا پڑے گا۔ میں نے آپ کے ساتھ رعایت کرنے اور جس قدر ممکن ہو سستا مال دینے کے بارے میں سوچ بچار کیا ہے، جان لیں کہ یہ آخری حرف ہے۔ دو پیسو فی نگ ایک ہزار کی صورت میں اور چار پیسو دس ہزار کی صورت میں"۔

امریکن آدھے دن تک انڈین کو یہ سمجھانے کے لئے بحث کرتا رہا کہ حساب کتاب میں کوئی غلطی تھی۔ اسے ایک نئی کاپی کے سارے صفحے ہندسوں سے بھرنے پڑے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ کس طرح انڈین فی نگ چالیس سینتاوس کے حساب سے ایک بڑی دولت کما سکتا تھا۔ اور کس طرح اخراجات، مال پر اٹھنے والی لاگت اور مزدوری کا حساب لگایا جاتا ہے۔

انڈین ہندسوں کو قدر افزائی سے دیکھتا رہا اور اسے حیرت آتی تھی کہ امریکن کتنی سرعت کے ساتھ ہندسوں کو لکھتا تھا، ان کو جمع کرتا تھا، ان کی تقسیم کرتا تھا اور انہیں ضرب دیتا تھا۔ مگر در حقیقت اس بات سے وہ ذرہ بھر متاثر نہ ہوا، کیونکہ وہ ہندسوں اور حروف کو نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اور امریکن کی ماہرانہ اور کاروباری نکتہ نظر سے نہایت اہم تقریر سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکتا تھا، ماسوائے یہ جاننے کے کہ امریکن کچھ کہے بغیر گھنٹوں تک بول سکتے ہیں۔

جب امریکن نے جان لیا کہ اس نے اپنے حساب کتاب سے انڈین کو قائل کر لیا تھا، تو اس نے اس کے کندھے کو تھپکایا اور پوچھا: "اچھا میرے دوست، پھر قیمت کیا ہو گی؟"

"دو پیسو فی نگ ایک ہزار کی صورت میں اور چار پیسو دس ہزار کی صورت میں"۔ انڈین پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا اور اس نے مزید کہا: "اب مجھے اپنے کام کی طرف

توجہ دینی چاہیئے۔ معاف کیجیئے سینیور"۔

امریکن غصے سے بھرا ہوا نیویارک واپس لوٹ گیا اور اس نے چاکولیٹ کے بیوپاری کو اپنا معاہدہ منسوخ کرنے کے لئے صرف اس قدر کہا: "میکسیکو کے باسیوں کے ساتھ آدمی کاروبار نہیں کر سکتا۔ ان سے کوئی امید نہیں رکھی جا سکتی"۔

اس طرح نیویارک ان ہزاروں خوبصورت آرٹ کے نمونوں کے ریلے سے بچ گیا۔ اور اس بات سے بچاؤ ہو گیا کہ یہ بے حد دلکش پٹاریاں، جن میں ایک انڈین پرندوں کے نغموں کو، جو اس کے ارد گرد تھے، اور پھولوں اور کونپلوں کے رنگوں کو، جنہیں وہ روز جھاڑیوں میں دیکھتا تھا اور ان گائے گیتوں کو، جو اس کی روح میں گونجتے تھے، ان کے اندر بننا جانتا تھا، مسلے اور بھنچے جانے کے بعد پارک ایونیو کے کوڑے کرکٹ کے ڈبوں میں جگہ پاتیں، کیونکہ چاکولیٹ کو نکال کر کھائے جانے کے بعد ان کی کوئی قدر و قیمت باقی نہ رہی تھی۔

برتھولٹ بریشٹ

Bertolt Brecht

درندہ

انسان کا طرزِ عمل کس قدر ذو معنیٰ ہو سکتا ہے۔ اس کا مظاہرہ حال ہی میں موژوپوم رس فلم اسٹوڈیوز میں پیش آنے والے ایک واقعہ سے ہوا، جو شاید غیر اہم تھا اور اس کے کوئی اثرات بھی مرتب نہ ہوئے۔ اس کے باوجود وہ اپنے اندر ایک ہیبتنا کی رکھتا ہے۔ فلم "سفید عقاب" کی تصویر کشی کے دوران، جو جنوبی روس میں جنگ سے قبل ہونے والے منظم قتل ہائے عام کے بارے میں تھا اور اس وقت کی پولیس کے طریق کار کو تنقید کا نشانہ بناتا تھا، ایک بوڑھا آدمی کام دیئے جانے کی درخواست لے کر آیا۔ وہ بیرونی دروازے والے دربان کی چوکی کے اندر گھس گیا اور دربان سے کہنے لگا کہ وہ کمپنی کی توجہ مشہور گورنر کے ساتھ اپنی غیر معمولی ہم شکلی کی طرف مبذول کروانی چاہتا تھا۔ (موراٹووان قتل ہائے عام کا مخترع تھا۔ اسے اس متذکرہ فلم میں، ہیرو کا رول ادا کرنا تھا)۔

دربان نے اگرچہ اس کا مذاق اڑایا، مگر چونکہ وہ بوڑھا آدمی تھا، اس لئے اسے فوراً دروازے سے باہر نہ کیا۔ اور یوں وہ لمبا اور دبلا پتلا شخص ٹوپی کو ہاتھ میں اٹھائے ہوئے ایکسٹروں اور اسٹوڈیوز کے کارکنوں کے درمیان کھویا ہوا سا کھڑا تھا، واضح طور پر اپنی اس رسوائے زمانہ خونخوار کتے کے ساتھ مشابہت کے سبب کچھ دنوں کے لئے روٹی اور سر چھپانے کی جگہ حاصل کرنے کی کمزور امید لئے ہوئے۔

ایک گھنٹے کے لگ بھگ آدمی اسی طرح کھڑا رہا، متواتر دوسروں کے لئے جگہ بنانے کی خاطر جگہ کو بدلتے ہوئے۔ آخر میں ایک ڈائس کے پیچھے دھکیلا ہوا کھڑا تھا، جب اچانک اس کی طرف توجہ دی گئی۔ اس وقت ایکٹر کینٹینوں میں وقت گذاری کر رہے تھے یا کھڑے گپیں ہانک رہے تھے۔ ماسکو کا مشہور ایکٹر کو خالوو، جو موراٹوو

کھیل رہا تھا، دربان کی چوکی میں ٹیلی فون کرنے کے لئے گیا۔ ٹیلی فون کے آلے کے پاس کھڑے ہوئے اسے مسکراتے ہوئے دربان نے ٹھونکا مارا، اور گھوم کر اس نے آدمی کو حاضرین کے بلند و بالا قہقہوں کے درمیان ڈائس کے پیچھے کھڑے ہوئے دیکھا' کوخالوو تاریخی تصویروں کی روشنی میں میک اپ کئے ہوئے تھا اور سب نے "غیر معمولی مشابہت" کو تسلیم کر لیا، جس کا ذکر ڈائس کے پیچھے کھڑے ہوئے آدمی نے دربان سے کیا تھا۔

مزید نصف گھنٹے کے بعد بوڑھا ڈائریکٹروں اور کیمرہ مینوں کے درمیان مندر میں بارہ سالہ یسوع مسیح کی طرح بیٹھا ہوا تھا اور ان کے ساتھ اپنے کام کے معاہدہ کے بارے میں گفت و شنید کر رہا تھا۔ بات چیت اس وجہ سے بہت سہل ہو گئی تھی کہ کوخالوو کو شروع سے ہی پسند نہ تھا کہ اپنے عوامی انداز کو ایک وحشی درندے کی ایکٹنگ کر کے گنوائے۔ اس نے فوراً اس بات سے اتفاق کیا کہ "ہم شکل" کے ساتھ ایک تجربہ کر لیا جائے۔

موژوپوم رس اسٹوڈیوز میں یہ امر کچھ ایسا غیر معمولی نہ تھا کہ تاریخی کردار ایکٹروں کی بجائے مشابہت رکھنے والوں کو دے دیئے جاتے تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ ڈائریکشن کے خاص طریق کار سے معاملہ برتا جاتا تھا۔ اور اس طرح نئے موراٹوو کو سیدھا سادا کھیلے جانے والے تاریخی واقعہ کا حال بیان کر دیا گیا۔ اور ٹسٹ کے طور پر اس کو موراٹوو عین اس رنگ میں کھیلنے کو کہا گیا، جس طرح وہ اس کو تصور کرتا تھا۔ امید کی جاتی تھی کہ اصلی موراٹوو کے ساتھ اپنی جسمانی مشابہت کی بنا، پر اس کا طرز عمل بھی ویسا ہی ہو گا۔

اس سین کا انتخاب کیا گیا، جس میں موراٹوو یہودیوں کے ایک وفد سے ملاقات کرتا ہے، جو اس سے مزید قتلوں کو روکنے کی درخواست کرتا ہے (مسودہ کا صفحہ ۱۷۔ وفد انتظار کرتا ہے۔ موراٹوو آتا ہے۔ ٹوپی اور تلوار کو کھونٹی پر لٹکاتا ہے۔ میز کی طرف جاتا ہے۔ صبح کے اخبار کی ورق گردانی کرتا ہے، وغیرہ)۔ ہلکا سا میک اپ کئے ہوئے قیصر کے گورنر کی وردی پہنے ہوئے "ہم شکل" فلم بنائے جانے والے کمرے میں داخل ہوتا ہے، جس کا ایک حصہ گورنر کے محل میں تاریخی کمرے کی نقل

ہے ، اور ڈائریکٹری سے متعلقہ جملہ لوگوں کے سامنے اس موراٹوو کو کھیلتا ہے "جس طرح وہ اس کو تصور کرتا ہے "۔ وہ اس کو ذیل کے طریق پر تصور کرتا ہے:

(وفد انتظار کرتا ہے۔ موراٹوو کی آمد)۔ "ہم شکل" تیزی کے ساتھ دروازے سے اندر داخل ہوتا ہے۔ ہاتھ سامنے والی جیبوں میں، آگے کو بے ڈھنگے انداز میں جھکا ہوا۔ (ٹوپی اور تلوار کو کھونٹی پر لٹکاتا ہے)۔ ڈائریکشن کی اس ہدایت کو "ہم شکل" نے عیاں طور پر بھلا دیا ہے۔ وہ بغیر لٹکانے کے فوراً میز پر بیٹھ جاتا ہے۔ (صبح کے اخبار کی ورق گردانی کرتا ہے)۔ "ہم شکل" یہ کام بے خیالی میں کرتا ہے۔ (تفتیش شروع کرتا ہے)۔ اس نے مؤدبانہ جھکے ہوئے یہودیوں کی طرف دیکھا تک نہیں۔ وہ اخبار کو خاصی دیر کے بعد رکھتا ہے۔ اسے پتہ نہیں چلتا کہ وہ کیونکر وفد کی تفتیش کو شروع کرے۔ بس الجھ کر رہ جاتا ہے اور ڈائریکشن کی طرف لاچاری سے تکتا ہے۔

ڈائریکشن والے ہنستے ہیں۔ ایک اسسٹنٹ اٹھتا ہے، ہاتھوں کو پتلون کی جیبوں میں ٹھونستے ہوئے سین کے اندر داخل ہوتا ہے۔ "ہم شکل" کے پاس، میز پر بیٹھ جاتا ہے اور اس کی مدد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

"اب سیب کھانے کی باری آتی ہے"۔ وہ ہمت بڑھاتے ہوئے کہتا ہے۔ "موراٹوو سیب خوری کے لئے مشہور تھا۔ اس کی گورنری حیوانی احکامات جاری کرنے کے علاوہ سیب خوری پر مشتمل تھی۔ سیبوں کو وہ اس دراز میں رکھتا تھا۔ یہ دیکھیں سیب پڑے ہیں"۔ وہ "ہم شکل" کے بائیں ہاتھ کی طرف میز کی دراز کھولتا ہے۔ "اب وفد پیش ہوتا ہے اور پہلا شخص بولنا شروع کرتا ہے، تو آپ اپنا سیب کھانے لگتے ہیں۔ برخوردار"۔ "ہم شکل" نے نوجوان کی باتوں کو بے حد توجہ سے سنا ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ سیبوں نے اس کو متاثر کیا تھا۔

جب سین کو دوبارہ فلمایا جاتا ہے، تو موراٹوو سچ مچ بائیں ہاتھ سے آہستگی کے ساتھ ایک سیب کو دراز میں سے نکالتا ہے۔ اور جب کہ وہ دائیں ہاتھ سے کاغذ پر حروف بنانے شروع کرتا ہے، سیب کھاتا جاتا ہے۔ بر سبیل تذکرہ بالکل حرص کے ساتھ نہیں، بلکہ عادتاً۔ جب کہ وفد گذارش کی پیشی میں لگا ہوا ہے، وہ واقعہ میں

صرف سیب خوری میں مصروف ہے ۔ کچھ دیر کے بعد جب کہ وہ بالکل نہیں سن رہا ہے
ایک یہودی کے فقرے کے عین درمیان میں دائیں ہاتھ سے رد کرنے کا اشارہ کرتا ہے ، جو فقرے کو کاٹ دیتا ہے اور سارے معاملے کا خاتمہ کر دیتا ہے ۔

اب " ہم شکل " استفسارانہ طور پر ڈائریکٹروں کی طرف تکتا ہے اور سرگوشی میں کہتا ہے : " انہیں کون باہر لے جائے گا ؟ "

چیف ڈائریکٹر بیٹھا رہتا ہے : " ہاں ، تو کیا آپ ختم کر چکے ہیں ؟ "

" جی ہاں ۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ باہر لے جائے جائیں گے " ۔

چیف ڈائریکٹر نے مسکراتے ہوئے رخ موڑ کر دیکھا اور کہا : " درندوں کا معاملہ اتنا آسان نہیں ہے ۔ آپ کو کسی قدر زیادہ محنت کرنی ہوگی " ۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ سارے سین کو دوبارہ دہرانے لگا ۔

" کوئی درندہ ایسا نہیں کرتا " ۔ وہ کہتا ہے : " یہ طرز عمل ایک چھوٹے سرکاری ملازم کا ہے ۔ دیکھیں آپ کو ہمیشہ سوچنا چاہیئے ۔ سوچنے کے بغیر کام نہیں چلتا ، آپ کو اس خونخوار کتے کا تصور کرنا چاہیئے ۔ آپ کو اسے اپنی چھنگلی میں رکھنا چاہیئے ۔ پھر ایک بار کمرے میں داخل ہوں " ۔

اب اس نے سین کو ڈرامائی نکتہ نظر سے ترتیب دینا شروع کیا ۔ کہیں پر وہ زور پیدا کرتا گیا اور کہیں پر کردار بندی ۔ " ہم شکل " کچھ ایسا اناڑی پن کا مظاہرہ نہ کرتا تھا ۔ وہ سب کچھ کرتا گیا ، جو اسے کہا جاتا رہا اور کچھ ایسا برا بھی نہیں ۔ وہ کسی بھی دوسرے آدمی کی طرح ایک درندے کی نقل کرنے کے قابل لگتا تھا ۔ مگر معلوم ہوتا تھا کہ اس کے اندر تصور کی کمی تھی ۔ نصف گھنٹے کی محنت کے بعد سین کی ہیئت یہ تھی ۔

(موراٹو کی آمد) شانے پیچھے کو اکڑائے ہوئے ۔ سر کی حرکتیں بے ڈھبی ۔ دروازے میں سے ہی جھکے ہوئے یہودیوں پر ایک عقابی نظر ۔ (ٹوپی اور تلوار کو کھونٹی پر لٹکاتا ہے) ۔ اوور کوٹ نیچے گر جاتا ہے ، وہ اسے پڑا رہنے دیتا ہے ۔ (میز کی طرف جاتا ہے ۔ صبح کے اخبار کی ورق گردانی کرتا ہے) ۔ وہ تھیٹر کی خبریں ڈھونڈتا ہے ۔ ہاتھ کے ساتھ ایک گانے کی تھاپ دینے کا ہلکا سا اشارہ کرتا ہے ۔ (تفتیش

شروع کرتا ہے) اس طرح کہ وہ یہودیوں کو ہتھیلی کی پشت کے اشارے سے تین میٹر پیچھے بھیجتا ہے۔

"آپ کو اس کی سمجھ نہیں آئے گی۔ یہ جو آپ کر رہے ہیں، یہ نہیں چلے گا"۔ چیف ڈائریکٹر نے کہا۔ "یہ تو عام سا تھیٹر ہے۔ ایک پرانی طرز کا بدمعاش۔ میرے دوست یہ وہ چیز نہیں ہے، جسے ہم آج ایک درندے سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ موراٹوو نہیں ہے"۔

ڈائریکشن کا عملہ اٹھ کھڑا ہوا اور کو خالوو کے ساتھ باتیں کرنے لگا، جس نے سب کچھ دیکھا تھا۔ سب بیک وقت بول رہے تھے۔ گروپ بن گئے اور درندے کی خصلت پر بحث ہونے لگی۔

جنرل موراٹوو کی تاریخی کرسی پر آگے کو جھکا ہوا، بے ڈھبے انداز میں بھلا دیا جانے والا "ہم شکل" کرب کے عالم میں سامنے کی جانب گھورتا ہوا بیٹھا تھا۔ اس کے باوجود وہ سن رہا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ گفتگو کو خوب سمجھ رہا تھا۔ وہ معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

یہودی وفد کے ایکٹر بھی بحث و تمحیص میں حصہ لے رہے تھے۔ کچھ دیر تک دو اکسٹروں، اس شہر کے دو پرانے یہودی باسیوں، کی بات پر کان دھرا گیا، جو اس وقت متذکرہ وفد کے رکن رہ چکے تھے۔ بوڑھوں کو لیا گیا تھا، تاکہ فلم کو اصل کے قریب تر لایا اور طبعی بنایا جاسکے۔ عجیب بات یہ تھی کہ ان کے نزدیک "ہم شکل" کا سب سے پہلا کھیل برا نہ تھا۔ وہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ غیر متعلقہ لوگوں کو کیسا لگا تھا، مگر ان پر اس وقت اس عادی اور دفتری طریق کار نے ایک دہشتناک اثر چھوڑا تھا۔ اس انداز کو "ہم شکل" نے اصل کے بے حد مماثل پیش کیا تھا۔ اس کا پہلے شاٹ کے دوران بالکل میکانیکی انداز میں سیب کھانا بھی۔ ہاں ان کی پیشی کے دوران موراٹوو نے سیب نہیں کھایا تھا۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے اس بات کو رد کر دیا۔ "موراٹوو ہمیشہ سیب کھایا کرتا تھا"۔ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا: "کیا آپ وفد میں شامل بھی تھے؟"

یہودیوں نے، جو اس شبے کا شکار نہیں بننا چاہتے تھے کہ اس وقت کے موت

کے سزاواروں میں شامل نہ تھے، گھبرا کر اس مفروضے کا سہارا لیا کہ موراٹو و نے شاید ان کی پیشی سے تھوڑا پہلے یا کچھ بعد سیب کھائے تھے۔

اس لمحے اس گروپ میں، جو چیف ڈائریکٹر اور کو خالو و کے گرد کھڑا تھا، ہلچل پیدا ہوئی۔ "ہم شکل" اپنے سامنے کھڑے ہوئے لوگوں کو ایک طرف دھکیلتے ہوئے چیف تک پہنچ گیا تھا اور اپنے لاغر چہرے پر جلد بازی اور حرص کے نمایاں اظہار کے ساتھ انہیں گھور رہا تھا۔ اس نے واضح طور جان لیا تھا کہ لوگ اس سے کیا چاہتے تھے، اور اپنی روٹی کو کھو دینے کے ڈر سے اسے ایک خیال سوجھا تھا۔ اس نے ایک تجویز پیش کی۔

"میرا خیال ہے، مجھے پتہ ہے کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ اسے ایک درندے کے طور پر پیش کرنا ہوگا۔ دیکھیں ہم اس کو سیبوں کے ذریعہ دکھا سکتے ہیں۔ یہ تصور کریں کہ میں ایک سیب اٹھاتا ہوں اور یہودی کی ناک کے سامنے رکھتا ہوں "کھاؤ" میں کہتا ہوں۔ اور جب کہ وہ ... "توجہ کرو" وہ یہودیوں کے وفد کے قائد کا رول کھیلنے والے ایکٹر سے کہتا ہے "جب کہ تم سیب کھاتے ہو، خیال کرو، موت کے خوف کے سبب وہ واضح ہے کہ تمہارے حلق میں پھنسا رہ جاتا ہے، مگر تمہیں سیب کھانا پڑے گا، اگر میں، گورنر، اسے تمہیں دیتا ہوں، دوستانہ رنگ میں، میری جانب سے یہ ایک دوستانہ عمل ہے، ہے ناں"۔ وہ چیف ڈائریکٹر کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ "میں ایسے میں بس یونہی موت کے فرمان پر دستخط کرتا ہوں۔ اور وہ، جو سیب کھا رہا ہے، اس چیز کو دیکھ رہا ہے"۔

چیف ڈائریکٹر ایک لمحے تک اس کو گھورتا رہا۔ بوڑھا اس کے سامنے جھکا ہوا کھڑا تھا۔ دبلا پتلا اور ہیجان کے عالم میں اور بجھا ہوا۔ ایک پورے سر کے لگ بھگ بڑا، اس طرح کہ وہ اس کے کندھوں پر اوپر سے جھانک سکتا تھا۔ اور ایک لمحے تک ڈائریکٹر نے جانا کہ بوڑھا اس کا مذاق اڑانا چاہتا تھا، کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس نے بوڑھے کی چمک اٹھنے والی آنکھوں میں ایک تیز اور ناقابل گرفت تضحیک، یکسر رذیل اور کمینہ دیکھی تھی۔ مگر پھر کو خالو و نے بولنا شروع کر دیا۔

کو خالو و نے بات کو غور سے سنا تھا۔ "ہم شکل" کے تجویز کردہ سیب والے

سین نے اس کی اداکارانہ قوت واہمہ کو جگا دیا تھا۔ "ہم شکل" کو بازو کی ایک بے درد حرکت سے ایک طرف دھکیلتے ہوئے اس نے کارکنوں سے کہا: "بہت خوب، وہ یہ کہنا چاہتا ہے"۔ اور اس نے ان کو سین کھیل کر دکھانا شروع کیا۔ ایسے انداز میں کہ ان کا کلیجہ قالبوں میں مسوس ہو کر رہ گیا۔ جب کوخالوو پسینہ پسینہ موت کے فرمان پر دستخط کر چکا، تو سارا اسٹوڈیو تالیاں بجانے لگا۔

مشعلیں لائی گیئں۔ یہودیوں کو اطلاع کر دی گئی۔ فلم بننے لگی۔ کوخالوو موراٹوو کی اداکاری کر رہا تھا۔ ابھی پھر ایک بار یہ ثابت ہو گیا تھا کہ کسی خونخوار کتے کے ساتھ محض ہم شکلی طبعی طور پر کچھ بھی اہمیت نہیں رکھتی۔ اور یہ کہ سچ مچ کی درندگی کو دکھانے کے لئے فن کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

قیصر کے سابقہ گورنر موراٹوو نے دربان کی چوکی سے اپنی ٹوپی اٹھائی۔ انکساری کے ساتھ دربان کو سلام کیا اور اکتوبر کے مہینے کی سردی میں دشواری کے ساتھ واپس شہر کی طرف چل دیا، جہاں پر وہ محتاجوں کے محلے میں غائب ہو گیا۔ اس نے اس روز دو سیب کھائے تھے اور ایک حقیری سی رقم پیدا کر لی تھی، جو رات کو سونے کے لئے جگہ حاصل کرنے کے لئے کافی تھی۔

۲۱

انا زیگرس

Anna Seghers

پناہ

ستمبر ۱۹۴۰ء کی ایک صبح کو، جب کہ پیرس کے میدان پلاس دے لا کونکورڈ پہ جرمنی کے مقبوضہ ملکوں والا بڑا ہک دار کراس کا جھنڈا لہرا رہا تھا اور دوکانوں کے سامنے سڑکوں جتنی لمبی قطاریں تھیں، ایک عورت، خرادی کی بیوی اور تین بچوں کی ماں، بنام لوئیزے مونیئے کو پتہ چلا کہ چودھویں محلے کی ایک دوکان سے انڈے خریدے جا سکتے تھے۔

وہ فوراً چل دی، ایک گھنٹے تک قطار میں کھڑی رہی، پانچ انڈے حاصل کر سکی، خاندان کے ہر فرد کے لئے ایک انڈا۔ اس دوران میں اسے یاد آیا کہ اس کی اسکول کے دنوں کی سہیلی انیٹے ویلار، ہوٹل کی ملازمہ، اس گلی میں رہتی تھی۔ ویلار اسے مل تو گئی، مگر سخت گھبراہٹ کے عالم میں، جو اس خاموش اور باسلیقہ عورت کے لئے غیر معمولی بات تھی۔

ویلار نے کھڑکیوں اور سلفچیوں کو صاف کرتے ہوئے، جس میں مونیئے اس کا تھوڑا بہت ہاتھ بٹاتی رہی، سنایا کہ کل دوپہر کے وقت گستاپو نے ایک مسافر کو گرفتار کر لیا تھا، جس نے ہوٹل میں اپنے آپ کو ایلزاس کا رہنے والا درج کروایا تھا، جب کہ وہ، جیسا کہ اس دوران میں پتہ چلا ہے، چند برس قبل ایک جرمن کنسنٹریشن کیمپ سے بھاگا ہوا تھا۔ کھڑکی کے شیشوں کو پونچھتے ہوئے ویلار نے بتایا کہ مسافر کو قید خانے میں لے جایا گیا تھا، جہاں سے اسے جلد جرمنی واپس پہنچا دیا جائے گا۔ اور غالباً دیوار کے سامنے کھڑا کر کے گولی مار دی جائے گی۔ مگر مسافر سے بڑھ کر جو چیز اسے پریشان کر رہی تھی، کیونکہ مرد آخر مرد ہوتے ہیں اور جنگ ہے، وہ مسافر کا بیٹا تھا۔ اس جرمن مسافر کا بارہ سالہ بیٹا اس کے ساتھ کمرے میں

رہتا تھا، وہاں پر اسکول میں جاتا تھا، فرانسیسی اس جیسی بولتا تھا، ماں مر چکی تھی اور ان کے خاندانی حالات الجھے ہوئے تھے، جیسا کہ اکثر غیر ملکیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ لڑکے نے اسکول سے واپسی پر باپ کی گرفتاری کے بارے میں خاموشی کے ساتھ بغیر آنسو بہانے کے سنا تھا۔ مگر جب گسٹاپو کے افسر نے اس کو حکم دیا کہ وہ اپنی چیزیں باندھ لے، تاکہ اسے اگلے روز لے جایا جاسکے اور واپس جرمنی میں اس کے رشتہ داروں کے پاس پہنچایا جائے، تو اس نے یکدم چلاکر جواب دیا کہ وہ اپنے آپ کو موٹر کار کے سامنے پھینک دے گا، بجائے اس کے کہ اسے اس خاندان کے پاس پہنچایا جائے۔ گسٹاپو افسر نے کہا کہ سوال جانے یا نہ جانے کا نہیں تھا، بلکہ رشتہ داروں کے پاس جانے کا یا تربیتی قید خانے میں جانے کا تھا۔ لڑکے کو لنیٹے پر بھروسہ تھا۔ اس نے رات کے وقت اسے اپنی مدد کرنے کو کہا تھا۔ اس نے اسے صبح سویرے ایک چھوٹے سے کیفے میں پہنچا دیا تھا، جس کا مالک اس کا دوست تھا۔ اب وہ وہاں پر بیٹھا ہوا تھا اور انتظار کر رہا تھا۔ اس نے سمجھا تھا کہ لڑکے کو چھپانا آسان کام ہوگا۔ مگر اس نے اس وقت تک صرف انکار ہی سنا تھا۔ خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ ہوٹل کی مالکہ جرمنوں سے بے حد ڈرتی تھی اور اس وجہ سے لڑکے کے بھاگ جانے پر ناخوش تھی۔

مونیئے نے ساری بات کو خاموشی سے سنا۔ اس کے خاتمے پر اس نے کہا: "میں ایک بار لڑکے کو دیکھنا چاہتی ہوں"۔ اس پر ویلار نے اس کو کیفے کا نام بتایا اور اس بات کا اضافہ کیا: "تمہیں لڑکے کو کپڑے پہنچانے سے ڈر تو نہیں لگتا؟"

کیفے کا مالک، جس کے سامنے اس نے ویلار کے رقعے کے ذریعہ اپنی شناخت کروائی، اسے بیلیارڈ والے کمرے میں لے گیا، جو صبح کے وقت بند رہتا تھا۔ لڑکا وہاں پر بیٹھا ہوا صحن میں جھانک رہا تھا۔ لڑکے کا قد اتنا تھا، جتنا اس کے بڑے بیٹے کا تھا۔ کپڑے بھی اس نے اس جیسے پہنے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں کالی تھیں۔ اس کے ناک نقشے میں کوئی ایسی چیز نہ تھی، جس سے اس کا ایک غیر ملکی کا بیٹا ہونے کا پتہ چل سکتا تھا۔ مونیئے نے اسے بتایا کہ وہ اس کے لئے کپڑے لے کر آئی تھی۔ اس نے شکریہ ادا نہ کیا۔ بس تیکھی نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ مونیئے اس

وقت تک ایک ماں تھی، جیسی دوسری مائیں۔ قطاروں میں لگنا، کچھ نہ ہونے کے باوجود کھانا تیار کرنا، تھوڑی چیز سے زیادہ چیز بنانا، گھر بار کے کام کاج پر مستزاد گھر پر کمائی کا کام کرنا۔ یہ ساری باتیں جیسے بالکل عادی باتیں تھیں۔ اب لڑکے کی نظروں کے تحت اس میں ایکا ایکی یہ فطری جذبہ بے تحاشا تقویت پکڑ گیا اور اس کے نتیجے میں اس کی طاقت بڑھ گئی۔ اس نے کہا: "آج شام کو سات بجے (مارکیٹ) کے ہالوں کے پاس والے کیفے بیاردمیں آجانا"۔

اس نے جلدی سے گھر کا رستہ لیا، کیونکہ تھوڑی سی چیزوں کو قابل اشتہا بنا کر میز پر رکھنے پر وقت لگ جاتا تھا۔ اس کا مرد گھر آچکا تھا۔ اس نے جنگ کا ایک سال ماگینو دفاعی لائن پر گذارا تھا۔ تین ہفتے پہلے اس کو ملٹری سے ریلیز کیا گیا تھا۔ ایک ہفتہ قبل اس کی ورکشاپ کھل گئی تھی۔ اس کو نصف دن کا کام دیا گیا تھا۔ دن کے بیشتر فارغ حصے کو وہ ریستوراں میں گذارا کرتا تھا۔ پھر وہ اپنے آپ پر غصے سے بھرا ہوا گھر لوٹتا تھا، کیونکہ اس نے اپنے تھوڑے سے پیسوں میں سے کچھ ریستوراں میں خرچ کر دیئے ہوتے تھے۔

عورت، جو اس قدر فکر مند تھی کہ اس کے مزاج کی طرف توجہ نہ دے سکتی تھی، فوراً انڈوں کو پھینٹنے کے ساتھ ساتھ اپنا ماجرا سنانے لگی، جس کا مقصد اپنے مرد کو تیار کرنا تھا۔ مگر جب وہ اس مقام پر پہنچی کہ غیر ملکی لڑکا ہوٹل سے روپوش ہو گیا تھا اور پیرس میں پناہ تلاش کر رہا تھا۔ تو مرد نے اس کی بات کو ان الفاظ سے کاٹا: "تمہاری سہیلی لینیٹے نے اس قسم کی بے ہودگی میں مدد دے کر بے حد بے وقوفی کا کام کیا ہے۔ میں اس کی جگہ پر لڑکے کو کمرے میں بند کر دیتا۔ جرمن کو خود اپنے جرمنوں کے ساتھ نپٹنا چاہیئے... اس نے خود تو اپنے بیٹے کے لئے کوئی انتظام نہیں کیا' افسر ٹھیک کرتا ہے اگر وہ لڑکے کو اس کے گھر واپس بھیجتا ہے۔ ہٹلر نے ساری دنیا پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اور محض باتیں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں"۔ اس پر عورت جو اتنی سمجھ بوجھ رکھتی تھی، فوراً دوسری باتیں کرنے لگی۔ اس نے پہلی بار واضح طور پر محسوس کیا کہ اس کے مرد میں کیا تبدیلی آچکی تھی۔ وہ پہلے وقتوں میں ہر ہڑتال اور ہر جلوس میں شامل ہوا کرتا تھا۔ اور چودہ جولائی کو اتنے جوش و خروش کا اظہار کرتا

تھا، جیسے وہ پھر ایک بار تن تنہا باستی (قلعے) پر حملہ کرے گا۔ وہ دیو مالا کے کرسٹوفورس کی طرح تھا... بہت سے لوگ اس سے مشابہت رکھتے ہیں... جو ہر اس شخص کا ساتھ دیتا ہے، جو اسے سب سے بڑھ کر طاقت ور لگتا ہے۔ اور اپنے آقا سے بڑھ کر طاقت کا مظاہرہ کرتا ہے، یہاں تک کہ بالآخر شیطان کی غلامی میں جا پہنچتا ہے۔
... مگر نہ تو عورت کی فطرت میں اور نہ ہی اس کے مصروف دن میں اس بات پر واویلا کرنے کی گنجائش تھی۔ بہر صورت مرد اس کا خاوند تھا اور وہ اس کی عورت تھی اور پھر وہ غیر لڑکا تھا، جو اب اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس لئے وہ شام کے وقت ہالوں کے پاس والے کیفے میں گئی اور اس نے بچے سے کہا: " میں تمہیں کل اپنے ہاں لے جا سکوں گی "۔ لڑکے نے پھر تیکھی نظروں سے اس کی جانب دیکھا اور کہا: " اگر آپ کو ڈر لگتا ہے، تو ضروری نہیں ہے کہ آپ مجھے اپنے ہاں پناہ دیں "۔ عورت نے خشک رنگ میں جواب دیا کہ بات صرف ایک دن انتظار کرنے کی تھی۔ اس نے کیفے کی مالکہ سے لڑکے کو، جو اس کا رشتہ دار تھا، ایک رات اپنے ہاں رکھنے کی درخواست کی، اس میں کوئی عجوبہ بات نہ تھی۔ کیونکہ پیرس پناہ گزینوں سے بھرا ہوا تھا۔

اگلے روز اس نے اپنے مرد کو بتایا: " مجھے میری چچازاد بہن ملی تھی۔ اس کا مرد پیتھیویئے میں زخمیوں کے ہسپتال میں پڑا ہے۔ وہ چند روز کے لئے اس کو دیکھنے جائے گی۔ اس نے اتنی دیر تک مجھے اپنے بچے کو پاس رکھنے کو کہا ہے "۔ مرد نے، جو غیروں کو اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر دیکھنا پسند نہ کرتا تھا، جواب دیا: " کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مستقل انتظام بن جائے "۔ اس نے لڑکے کے لئے ایک گدا تیار کیا، رستے میں اس نے اس سے پوچھا: " تم کس وجہ سے واپس نہیں جانا چاہتے ہو؟ " اس نے جواب دیا: " اگر آپ کو ڈر لگتا ہے، تو آپ اب بھی مجھے یہیں پر چھوڑ کر جا سکتی ہیں، اپنے رشتہ داروں کے پاس میں واپس نہیں جاؤں گا۔ میری ماں اور میرے باپ دونوں کو ہٹلر نے گرفتار کروا لیا تھا۔ انہوں نے اشتہار لکھے، چھاپے اور تقسیم کئے تھے۔ میری ماں مر گئی ہے۔ آپ دیکھ سکتی ہیں کہ میرا سامنے کا ایک دانت ٹوٹا ہوا ہے۔ اسے انہوں نے اسکول میں توڑ دیا تھا۔ کیونکہ میں ان کا (پارٹی) گیت دوسروں کے ساتھ مل کر گانے پر آمادہ نہ ہوتا تھا۔ میرے رشتہ دار بھی نازی ہیں۔ وہ مجھے

سب سے زیادہ دکھ دیتے تھے۔ وہ میرے باپ اور میری ماں کو گالیاں دیتے تھے"۔
اس پر عورت نے اس سے اس بارہ میں مرد اور بچوں کے سامنے خاموشی اختیار کرنے کی درخواست کی۔

بچوں کو غیر لڑکا نہ تو کچھ ایسا پسند آیا نہ ہی ناپسند۔ وہ الگ تھلگ رہتا تھا اور ہنستا بالکل نہیں تھا۔ مرد کو لڑکا شروع سے ہی پسند نہ آیا تھا۔ اس نے کہا کہ اس کو لڑکے کی نظریں اچھی نہ لگتی تھیں۔ اس نے اپنی عورت کو برا بھلا کہا، جو اپنے راشن میں سے بچے کو دیتی تھی۔ اور اس کی چچازاد کو برا بھلا کہا۔ دوسروں پر اپنے بچوں کا بوجھ ڈالنا قطعاً ناقابل برداشت عمل تھا۔ ایسی شکایتیں بالآخر نصیحتوں میں ڈھل جایا کرتی تھیں۔ جنگ ہاری جا چکی تھی۔ جرمنوں نے ملک پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان کے اندر ڈسپلن پایا جاتا تھا۔ انہیں انتظام کا ڈھنگ آتا تھا۔ جب ایک بار لڑکے سے دودھ کا جگ گر گیا، تو وہ اس پر جھپٹا اور اس کو مارنے لگا۔ عورت نے بعد میں لڑکے کو دلاسا دینا چاہا، تو اس نے کہا: "یہاں پر وہاں کے مقابلے میں کہیں بہتر ہے"۔

"میں" مرد نے کہا" پھر ایک بار صحیح قسم کا پنیر کھانے کے اختتام پر کھانا چاہتا ہوں"۔ وہ شام کو سخت غصے کے عالم میں گھر لوٹا: "ذرا تصور کرو کہ میں نے کیا دیکھا ہے۔ ایک بہت بڑا جرمن ٹرک پنیر سے لدا پھندا۔ وہ جس چیز پر ان کا جی چاہتا ہے خریدتے ہیں۔ وہ کروڑوں کے حساب سے کرنسی نوٹ چھاپتے ہیں اور انہیں خرچ کرتے ہیں"۔

دو تین ہفتوں کے بعد مونیئے اپنی سہیلی لینیٹے سے ملنے گئی، جسے اس کا آنا بالکل پسند نہ آیا۔ اس نے اشارہ کیا کہ وہ اس محلے میں نہ آیا کرے۔ گسٹاپو نے گالیاں اور دھمکیاں دی تھیں۔ انہوں نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ لڑکے نے کس کیفے میں انتظار کیا تھا۔ اور یہ امر بھی کہ وہاں پر ایک عورت اسے ملنے آئی تھی۔ اور یہ کہ دونوں نے اس جگہ کو مختلف وقتوں میں چھوڑا تھا..... اپنے گھر کے راستے میں مونیئے نے پھر ایک بار اس خطرے کے بارے میں غور وخوض کیا، جس میں اس نے اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو ڈالا تھا۔ وہ اس فیصلے کے بارے میں سوچتی رہی، جو اس نے جذبات کے ایک ریلے کے تحت کیا تھا۔ گھر کے راستے نے اس فیصلے کے

درست ہونے کی تصدیق کر دی۔ کھلی ہوئی دوکانوں کے سامنے قطاریں، بند دوکانیں پھٹوں کے ساتھ بھڑی ہوئیں۔ جرمن موٹر کاروں کے، جو سڑکوں پر دوڑتی پھرتی تھیں، بجتے ہوئے ہارن۔ دروازوں پر ہک دار کراس۔ یہاں تک کہ اپنے باورچی خانے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے غیر لڑکے کے بالوں پر دوسری بار خوش آمدید کا ہاتھ پھیرا۔

مرد اس پر چنگاڑا کہ اس کو وہ بچہ بہت پیارا تھا۔ وہ اپنی بد مزاجی کو غیر بچے پر اتارنے لگا تھا۔ اس لئے کہ اپنے بچوں کے بڑے ہونے میں دیر تھی۔ اور اس کی تمام امیدیں ناکامی میں تبدیل ہو کر ایک غیر واضح اور غیر آزاد مستقبل کا آئینہ دار بن چکی تھیں۔ چونکہ بچہ بہت محتاط تھا اور بے حد خاموش، اور شکایت کا کوئی موقعہ نہ دیتا تھا' اس لئے وہ اس کو بلاوجہ مارنے اور وجہ یہ بیان کرنے لگا کہ لڑکے کی نظروں میں سے سرکشی جھلکتی ہے۔ خود اس کی اپنی رہی سہی خوشی بھی اس سے چھین لی گئی تھی۔ وہ اپنے فالتو وقت کا ایک بڑا حصہ ریستوراں میں گزارا کرتا تھا۔ جس سے اس کو کسی قدر ذہنی سکون ملتا تھا۔ اب اس گلی میں واقع لوہار کی دوکان پر جرمنوں نے قبضہ جما لیا تھا۔

گلی جو اب تک خاموش اور ہک دار کراس سے آزاد تھی۔ یکبارگی جرمن مکینکوں سے بھر گئی۔ جرمن کاروں کی وہاں پر بھر مار ہونے لگی، جن کی مرمت کی جاتی ہوتی تھی۔ اور نازی فوجیوں نے ریستوراں پر قبضہ کر لیا اور وہاں پر خوب گل چھرے اڑانے لگے۔ مونیئے کا مرد اس نظارے کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ عورت اس کو اکثر باورچی خانے کے میز پر بیٹھا ہوا پاتی تھی۔ ایک بار اس نے اس سے پوچھا، جب وہ قریب قریب ایک گھنٹے تک اپنے سر کو بازو پر تھامے ہوئے بیٹھا رہا تھا کہ اس نے کس بارے میں غور و فکر کیا تھا۔ "کسی خاص بات کے بارے میں نہیں اور دنیا جہاں کی چیزوں کے بارے میں۔ اور ایک بالکل غیر متعلق چیز کے بارے میں۔ ذرا تصور کرو، میں نے ابھی اس جرمن کے بارے میں سوچا ہے، جس کے بارے میں تمہاری سہیلی لینیٹ نے بتایا تھا۔ مجھے پتہ نہیں کہ تمہیں وہ بات یاد بھی ہے یا نہیں، جرمن، جو ہٹلر کے خلاف تھا۔ جرمن، جس کو جرمنوں نے گرفتار کر لیا تھا۔

میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس کے ساتھ کیا بیتی۔ اس کے ساتھ اور اس کے بیٹے کے ساتھ "۔ مونییئے نے جواب دیا: " ابھی حال میں ہی میری ملاقات ویلار کے ساتھ ہوئی تھی۔ وہ جرمن کو قید خانے میں لے گئے تھے۔ شاید اسے اس عرصے میں مار دیا گیا ہو گا۔ بچہ غائب ہو گیا تھا۔ پیرس وسیع ہے۔ اس کو کہیں پر کوئی ٹھکانہ مل گیا ہو گا"۔

چونکہ کوئی شخص نازی فوجیوں کے ساتھ بیٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے اکثر لوگ بوتلیں لے کر مونییئے کے باورچی خانے میں آ جاتے تھے۔ یہ چیز انہیں پہلے وقتوں میں اوپری اور شاید بری لگتی۔ ان میں سے بیشتر مونییئے کے کام کے ساتھی تھے اسی کارخانے کے۔ اور وہ کھل کر باتیں کرتے تھے۔ مالک کارخانہ نے اپنا دفتر جرمن کمشنر کے سپرد کر دیا تھا، جو آتا اور جاتا تھا، جب اس کا جی چاہتا تھا۔ جرمن ماہرین چیزوں کو پرکھتے تھے، تولتے تھے. پرزے اتارتے تھے۔ اب تو آفس میں اس بات کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش بھی نہ کی جاتی تھی کہ کام کس کے لئے کیا جاتا تھا۔ تکمیل شدہ آلات، جو ادھر ادھر سے چوری کردہ کلوں سے بنائے جاتے تھے، ان کو مشرقی ملکوں میں بھیج دیا جاتا تھا۔ دوسری قوموں کا گلا گھونٹنے کی خاطر۔ یہ تھا گویا کہانی کا انجام۔ تخفیف شدہ تنخواہیں، بیگار کی مال برداری۔ مونییئے نے اپنی کھڑکیوں کے کواڑ بھیڑ لئے تھے۔ اور باتیں بھی اب دھیمی آواز میں کی جانی لگی تھیں۔ غیر بچہ اپنی نظروں کو جھکا کے رکھتا تھا، جیسے اسے خطرہ ہو کہ اس کی نظریں بہت چبھتی تھیں۔ اور یہ کہ وہ اس کے دل کا بھید فاش کرنے کا باعث بن سکتی تھیں۔ وہ اس قدر پیلا تھا، اس قدر دبلا ہو گیا تھا کہ مونییئے اس کو بدمزاجی سے تکتا تھا اور اس اندیشے کا اظہار کرتا تھا کہ لڑکا کہیں کسی بیماری کا شکار نہ ہو، جو اس کے بچوں کو بھی لگ سکتی تھی۔ مادام مونییئے نے خود اپنے نام ایک خط لکھا تھا، جس میں اس کی چچیری بہن نے اس سے بچے کو مزید کچھ عرصے تک کے لئے اپنے پاس رکھنے کی درخواست کی تھی، کیونکہ اس کا مرد سخت بیمار تھا۔ اور وہ خود کچھ عرصے کے لئے اس کے قریب کرائے کا کمرہ لے کر رہنا چاہتی تھی۔ " وہ اپنے بیٹے کا پکا انتظام کر رہی ہے " موسیو مونییئے نے تبصرہ کیا۔ مادام مونییئے نے ترت بچے کی تعریف کی کہ وہ بے حد بیبا تھا۔ ہر صبح چار بجے مارکیٹ ہال میں چلا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر آج ہی اس نے گائے کے ماس کا یہ ٹکڑا راشن کارڈ

کے بغیر پیدا کر لیا تھا۔

اس گلی میں موسیئے کے ہمسائے میں دو بہنیں رہتی تھیں، جو شروع سے ہی بڑی رزیل تھیں۔ اب تو وہ ریستوراں میں چلی جاتی تھیں۔ اور جرمن کاریگروں کی گود میں بیٹھا کرتی تھیں۔ سپاہی نے اس بات کو جان لیا تھا اور دونوں کو تھانے میں لے گیا تھا۔ وہ روتی دھوتی اور پھوں پھاں کرتی رہیں۔ اس نے ان کا اندراج بازاری عورتوں کی فہرست میں کر لیا تھا۔ ساری گلی اس بات پر خوش ہوئی تھی۔ مگر اب دونوں بہنوں کی رذالت پہلے سے بڑھ گئی تھی۔ اب جرمن کاریگر ان کے گھر میں آنے جانے لگے تھے۔ انہوں نے حویلی پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان کا شور شرابا موسیو موسیئے کے باورچی خانے میں سنا جانے لگا تھا۔ موسیو موسیئے اور اس کے ملاقاتیوں کی مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔ اور موسیو موسیئے نے جرمنوں کی نظام کی پابندی کی تعریف چھوڑ دی تھی۔ اس کی زندگی نہایت شائستہ، ایماندارانہ اور تنظیمی احتیاط کے ساتھ برباد کی جا چکی تھی، کام کی جگہ پر، گھر کی چار دیواری میں۔ اس کی چھوٹی موٹی خوشیاں، اس کی آسائش کا سامان، اس کی عزت، اس کا آرام، اس کا کھانا، اس کی سانس لینے کی ہوا۔

ایک روز موسیو موسیئے اپنی عورت کے ساتھ اکیلا تھا۔ ایک لمبی خاموشی کے بعد اس کے منہ سے نکلا: "ان کے ہاتھ میں طاقت ہے، تم کیا کہتی ہو۔ یہ شیطان کتنا طاقت ور ہے، کیا دھرتی پر کوئی نہیں پایا جاتا، جو ان سے بڑھ کر طاقت رکھتا ہو۔ ہم کمزور ہیں، ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ہم منہ کھولتے ہیں، اور وہ ہمیں جان سے مار ڈالتے ہیں، مگر وہ جرمن تعریف کیے جانے کے قابل ہے، جس کے بارے میں ایک بار تمہاری سہیلی لنیٹے نے بتایا تھا، تم اسے شاید بھول چکی ہو۔ میں نہیں بھولا ہوں، اس نے کتنا رسک لیا تھا۔ اور اس کا بیٹا۔ تمہاری چچیری لپنے بیٹے سمیت اپنے آپ کو خود کیچڑ میں سے کھینچ کر نکالے، مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ اس جرمن کے بیٹے کو میں اپنے گھر میں پناہ دینے کو تیار ہوں۔ مجھے اس سے خوشی ہو گی۔ اس کی دیکھ بھال میں اپنے بیٹوں سے بڑھ کر کروں گا۔ میں اس کو بہتر خوراک دوں گا۔ ایک ایسے لڑکے کو اپنے ہاں پناہ دینا۔ اور یہ حرامی یہاں پر آتے اور جاتے ہیں۔ اور انہیں پتہ ہی نہیں

کہ میں کیسی قربانی دے رہا ہوں ۔ اور میں کیسا انسان ہوں ۔ اور میں نے کس کو چھپا رکھا ہے ۔ ایسے لڑکے کو میں کھلے دل کے ساتھ پناہ دینے کو تیار ہوں "۔ عورت نے منہ موڑ لیا اور کہا: " تم نے اسے پناہ دے رکھی ہے "۔

میں نے یہ کہانی چودھویں محلے میں واقع اپنے ہوٹل میں اس انیٹے کی زبانی سنی، جس نے وہاں پر ملازمت کر لی تھی، کیونکہ اس کو پرانی جگہ پر خطرے کا احساس بڑھ گیا تھا۔

ماری لوئیزے کاشنٹز
Marie Luise Kaschnitz

ساعۃ الصفر

آپ یقیناً سمجھتے ہیں کہ میری مراد کس دن سے ہے ۔ صفر یہاں پر ق کے بدل میں ہے ۔ ق برابر قیامت ۔ دنیا کا خاتمہ تو شاید نہیں ، مگر اس سے ملتا جلتا ۔ ہمارا شہر غائب ، تمام مکانات ، مدارس ، لائبریریاں ، تمام مرد اور عورتیں اور بچے ۔ ہر چیز ، جس کی خاطر ہم زندہ تھے ۔ اور ہو سکتا ہے کہ کہیں پر انسانوں جیسا کوئی ہیولہ ابھی گھسٹ رہا ہو ، مگر بہت دنوں تک نہیں ۔ اور جسے ابھی جنم لینا تھا ، وہ اپنے تخم میں سڑ جاتا ہے ۔

یہ ص کا دن مجھ پر چھایا ہوا ہے ۔ میں اس کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں ۔ مگر میرے خاندان میں اور میرے دوستوں میں بھی میں اکیلی ہوں ، جو ایسی باتیں سوچتی ہوں ۔ میں اس بارے میں بات بھی نہیں کر سکتی ہوں ۔ اخ ، اب جانے بھی دو ، فوراً کہا جاتا ہے ، اول تو اس کی نوبت نہیں آئیگی ، اور اگر آ بھی گئی ، تو ہمیں وقت پر خبر مل جائیگی ۔ چونکہ میں اس بارے میں بول نہیں سکتی ہوں ، اس لئے مجھے لکھنا ہوگا ۔ مجھے اس ص کے دن کو بیان کرنا ہوگا ، جو واضح ہے عین اسی طرح چڑھتا ہے ، جیسے سبھی دن ۔ اور اسی طرح آگے بڑھتا ہے ، جیسے دوسرے دن ۔ انہیں خود پتہ چل جائیگا ۔ اس روز کیسا موسم ہوگا ۔ واضح ہے کہ مجھے اس بات کا علم نہیں ہے ۔ مگر ہم فرض کرتے ہیں کہ موسم اچھا ہے ۔ فرض کیا کہ گرمیوں کا موسم ڈھل رہا ہے ، سورج مکھی کے پھول کھلے ہوئے ہیں ۔ ہم بالکل ناتیار بھی نہیں ہیں ۔ بحران کا ماحول چھایا ہوا ہے ، سیاسی بحران ، پہلے کی طرح ۔ ہاں ہاں جیسے سال کے اس حصے میں پہلے بھی کئی بار پیدا ہو چکا ہے ۔

میں اس روز سویرے جاگ جاتی ہوں ۔ کرٹن کی چادروں کی ایک جھری میں

ہے ماہ ستمبر کے صاف ستھرے آسمان کو دیکھتی ہوں اور پھر گھڑی پر نگاہ ڈالتی ہوں۔ ابھی سات بجے ہیں۔ میں اپنے مرد کو مزید آدھا گھنٹہ سونے کی مہلت دے سکتی ہوں مگر چونکہ میرے دل میں وہ مخصوص پیش اندیشہ ہے، میں ایسا نہیں کرتی ہوں۔ بلکہ اسے دھیرے سے جگاتی ہوں اور کہتی ہوں: "تمہارے پاس ابھی وقت ہے، مگر یہ بات بچوں سے تعلق رکھتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا بچوں کو مدرسہ جانا چاہیئے یا نہیں؟"

میرا مرد بستر میں اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ آنکھیں رگڑتا ہے "کیوں؟" پوچھتا ہے "مدرسہ کیوں نہیں۔ کیا وہ بیمار ہیں یا کوئی متعدی مرض پھیل گیا ہے۔ یہ بات تم مجھے کل بھی بتا سکتی تھیں، مگر تم نے کچھ نہیں کہا"۔

"کیونکہ" میں نے جواب دیا "کوئی متعدی مرض نہیں پھیلا اور بچے بیمار بھی نہیں ہیں۔ اور چونکہ مجھے کل شام کو اس بات کا علم نہیں تھا، جسے میں اب جانتی ہوں۔ یہ کہ آج ہمارا آخری دن ہے۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ ہمیں یکجا رہنا چاہیئے"۔

"ہمارا آخری دن" میرا مرد حیرت سے دہراتا ہے "کیوں، کیسے؟" پھر وہ ہنسنے لگتا ہے اور کہتا ہے "تم خواہ مخواہ پاگل نہ بنو۔ ہر بات سدھر جائیگی۔ آخر ہر کوئی جانتا ہے کہ اس کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اور یہ کہ خاتمے پر نہ کوئی فاتح ہوگا نہ مفتوح"۔

"یہ بات تم پہلے بھی کئی بار کہہ چکے ہو"۔ میں پلنگ کی پٹی پر بیٹھے ہوئے اور جرابیں پہنتے ہوئے جواب دیتی ہوں۔ "یہ بات سچ ہو سکتی ہے، مگر اس کا سچ ہونا ضروری نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ہر کوئی اس حقیقت سے واقف ہے اور اپنے طرز عمل کو اس کے مطابق ڈھالتا ہے۔ اور آج وہ دن آن پہنچا ہے۔ آج ہمارا آخری دن ہے"۔

میرا مرد محبت بھری نظروں سے پہلو سے میری طرف تکتا ہے۔ پھر تجویز پیش کرتا ہے کہ لیٹر بکس سے اخبار لایا جائے۔ میں جانتی ہوں کہ اخبار میرا معاون نہیں ہو سکتا، کیونکہ جب تک "وقوعہ" ہو نہیں جاتا، کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ اور کیونکہ دنیا کا کوئی اخبار کبھی نہیں لکھے گا کہ اب تمہیں مرنا ہوگا، اس لیئے تیار ہو جاؤ"۔

"تم نے دیکھ لیا"۔ میرا مرد اخبار کو لانے اور اس میں سے بعض چیزیں، ٹیلی

گرام بتلہ ٹیلی فون پر بڑی طاقتوں کے مابین ہونی والی گفتگو بھی سنانے کے بعد کہتا ہے ۔ "حل نظر آ رہا ہے ۔ وہ اسے تلاش کر لیں گے ۔ علاوہ ازیں بچوں کو میں نے جگا دیا ہے" ۔

"مگر انہیں اسکول تو جانا نہیں ہے" ۔ میں کہتی ہوں ۔ "اور تم بھی میری خاطر دفتر نہ جاؤ" .... "میں تو ضرور جاؤں گا" ۔ میرا مرد کہتا ہے ، جو ریلوے میں ملازم ہے ۔ "اور بچے بھی جائیں گے ۔ تم انہیں کیا کہوگی کہ کیوں نہیں" ۔ اور ساتھ ہی وہ اپنے الیکٹرک شیور کو پلگ بورڈ میں ٹھونس دیتا ہے ۔ شیور کی بھنبھناہٹ خاصی اونچی ہے اور مجھے پتہ ہے کہ میرا مرد اب میری بات کو نہیں سمجھ سکتا ۔

میں نے کپڑے پہن لئے ہیں اور بچوں کے کمرے میں جاتی ہوں ، جہاں پر عام طور سے اس وقت دلگیری کا عالم چھایا ہوتا ہے ۔ بچے یا تو ابھی بستروں میں لیٹے ہوتے ہیں اور آدمی کو ان کا لحاف زبردستی کھینچنا پڑتا ہے یا انہوں نے بغیر دھونے دھانے کے کپڑے پہن لئے ہوتے ہیں ۔ فرہنگ کی کتاب یا ریاضی کی کاپی کھولے بیٹھے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس وقت ہمیں نہ چھیڑو ، ناشتے کے لئے ہمارے پاس یوں بھی وقت نہیں ہے ۔

بچے ، دس اور بارہ سال کی عمریں ، دونوں لڑکے ۔ اپنی عمروں کے مطابق چومنے چاٹنے سے دل آزار ۔ اتنی صبح ان سے ایک بوسہ ملنے کی تو میں امید ہی نہیں رکھ سکتی ۔ مگر اس روز ، جس کا میں ذکر کر رہی ہوں ، وہ بھاگ کر آتے ہیں اور مجھ سے لپٹ جاتے ہیں ۔ میرا تو کلیجہ ہی نکل جاتا ہے ۔ "تم کیوں" میں پھولے ہوئے سانس سے کہتی ہوں "اٹھ گئے ہو ، جب کہ آج تمہیں اسکول نہیں جانا ہے" ۔ "چھٹی بڑا لڑکا کہتا ہے "تمہارا دماغ چل گیا ہے" ۔ ہاں وہ یوں کہتا ہے ، بلکہ انگلی سے ماتھے کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ اور پھر پتہ چلتا ہے کہ آج کلاس میں دو گھنٹوں تک فلمیں دکھائی جائیں گی ۔ جب کہ منجھلے کی کلاس میں واضح طور پر کوئی منصوبہ چل رہا ہے ، آدھی چھٹی کے وقت سگریٹ نوشی کا یا خدا ہی جانے کاہے کا ۔ بہر صورت ایک دلچسپ دن ، جس کو مس نہ کرنا چاہیئے ۔

"تمہیں آج اسکول نہیں جانا ہے" ۔ میں دلیری سے کہتی ہوں اور بستروں کو

درست کرنے لگتی ہوں تا کہ مجھے بچوں کی آنکھوں سے آنکھیں نہ ملانی پڑیں۔ "تمہیں اس بات کا کیسے پتہ چلا ہے"۔ آرنو، جو بڑا ہے، پوچھتا ہے۔ اور میں کہتی ہوں "میں نے سنا ہے" اور ساتھ ہی پچھتانے لگتی ہوں، کیونکہ بچوں کے دلوں میں شک پیدا ہو سکتا ہے۔ "بہتر ہے کہ میں خود فون پر پوچھ لوں" آرنو سنجیدگی سے کہتا ہے اور دروازے کو کھولنے لگتا ہے۔ اور اب مجھے مشکل پڑتی ہے اسے یہ کہہ کر روکنے کی کہ "نہیں جانے دو" اور "تمہاری بات درست ہی ہو گی"۔ آرنو سر کو جھٹکتا ہے اور عورتوں کے بارے میں کچھ سوچتا ہے۔ اور میرا مرد بھی کچھ سوچتا ہے۔ اور بعد میں جب بچے ایک طوفانی ناشتے کے بعد بھاگ جاتے ہیں، وہ کہتا ہے "تم آج بہت عجیب ہو۔ اس طرح میں نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا"۔ کیونکہ میرے آنسو شہد لگی روٹی پر گرتے ہیں، اور بالوں کو بھی میں نے ابھی تک نہیں سنوارا ہے۔

"تم ٹھیک کہتے ہو" میں جواب دیتی ہوں "میں بھی اپنے آپ کو اس طرح نہیں جانتی ہوں۔ اس وجہ سے ہی تو ضرور کوئی نہ کوئی بات ہے۔ اور کاساندرا (۱) کی بات پر بھی تو کوئی ایمان نہیں لایا تھا"۔ اور چونکہ میں اب قدیم تاریخ کا ذکر کر رہی ہوں، اس لئے میں اپنے مرد کو پومپیائی کے مردوں کے بارے میں بتاتی ہوں، جنہیں لاوے نے اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔ اور جنہیں انسان میوزیم میں ہر قسم کی بھاگنے کی پوزیشنوں میں دیکھ سکتا ہے اور افسوس سے کہہ سکتا ہے، اچانک موت کے شکار۔ اور آخر میں میں کہتی ہوں "یہی کچھ ہمارے ساتھ پیش آئے گا"۔

اس کہانی سے میرا مرد بہت گھبرا جاتا ہے۔ وہ میری طرف رنجیدگی سے تکتا ہے۔ اور شتابی سے اپنی کافی پی جاتا ہے۔ اور اب خوش قسمتی سے ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے، جسے عام طور سے میں اٹھاتی ہوں۔ مگر میرا مرد خود ریسیور کو اٹھا لیتا ہے۔ "ہاں، میں بول رہا ہوں"۔ وہ کہتا ہے "نہیں، میں ابھی روانہ نہیں ہوا ہوں۔ میں آپ کو خود لینے آتا ہوں۔ آپ سڑک پر آ رہے ہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اتنی جلدی بھی کیا ہے"۔ میں سوچتی ہوں کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔ کوئی کولیگ یا اس کی سیکرٹری۔ بہر صورت زندگی کی ایک آواز۔ ایک آواز، جو کہتی ہے کہ زندگی جاری و ساری ہے۔ ہر چیز چل رہی ہے، آج اور کل۔ موت کا کوئی وجود نہیں ہے۔

"ہاں بھئی۔ مجھے معاف کرنا" ۔ میرا مرد کہتا ہے اور مجھے بوسہ دیتا ہے۔ "اور ایسی ہولناک چیزوں کے بارے میں نہ سوچتی رہنا۔ یہ تمہیں تباہ کر دیں گی۔ تم تو بالکل زرد دکھائی دے رہی ہو"۔ وہ وعدہ کرتا ہے کہ جونہی اسے کسی نئی بات کا پتہ چلا، تو وہ مجھے فون کر دے گا۔ پھر وہ رخصت ہوتا اور باہر کار کی چابیاں کیل پر سے اتارتا ہے۔ میں ہر روز کی طرح دھیمی کھڑکھڑاہٹ سنتی ہوں۔ اور روز کی طرح اس کے تیز قدموں کی چاپ زینے پر، اور لمحہ بھر کے لئے مطمئن ہو جاتی ہوں۔ وہ درست کہتا ہے، میں اپنے آپ کو دیوانہ بنا رہی ہوں۔ میں سب کو دیوانہ بنا رہی ہوں۔

پہلا پہر گذرتا ہے، جیسے وہ ہمیشہ گذرا کرتا ہے۔ ہماری مالی حالت خاصی اچھی ہے، مگر ہمارے ہاں ملازم نہیں ہیں۔ میں بستروں کو ہمیشہ کی طرح بناتی ہوں اور ہمیشہ کی طرح گرد پونچھتی ہوں۔ پھر سودا سلف لانے جاتی ہوں اور خریداری کرتے وقت کانوں کو کھلا رکھتی ہوں، یہ سننے کے لئے کہ لوگ دوکانوں میں کیا باتیں کرتے ہیں۔ مگر وہ بس عادی باتیں کرتے ہیں۔ خوبصورت خزاں کا موسم اور چھٹیاں کیسے گذریں، اور سیبوں کا دام کم ہونا چاہیئے۔ جب میں کوشش کرتی ہوں گفتگو کو سیاسی حالات کی طرف لانے کی، تو انہیں ایکا ایکی بے حد جلدی پڑ جاتی ہے۔ ہاں معاف کیجئے، مجھے ابھی مچھلیوں والی دوکان میں جانا ہے، مجھے ابھی اسٹیشن پر جانا ہے اپنی خالہ کو لینے کے لئے، مجھے ابھی ہیر ڈریسر کے پاس جانا ہے۔ لوگ جو اس طرح کی باتیں کرتے ہیں اور بھاگ جاتے ہیں، ان کے ساتھ میری بس شناسائی ہے، مگر اس شخص کو اڈے پہ میں خوب جانتی ہوں۔ یہ پادری ہے، جس کے پاس میرے بچے دینی تعلیم پاتے ہیں۔ اسے اپنا مخصوص مذہبی لباس پہن کر پھرنا پسند نہیں ہے۔ اس کے سر پر باسک ٹوپی ہے۔ مگر یہ چیز میرے رستے میں روک نہیں بن سکتی کہ میں اس سے ایک دینی سوال پوچھوں۔ صبح بخیر پادری صاحب۔ میں کہتی ہوں۔ اور وہ جواب دیتا ہے: "صبح بخیر مسز رائٹر، بچے کیسے ہیں۔ مدرسے کی طرف سے اوٹینگ میں امید کرتا ہوں، کون کہہ سکتا ہے کہ یہ موسم عمدہ رہے گا۔ شاید یہ آخری دن ہے"۔ "ہاں" میں بے حد فکر مندی سے کہتی ہوں "آخری دن، عین ممکن ہے۔ ہمیں کیا کرنا چاہیئے پادری صاحب۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں، ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟"

پادری حیرت سے میری طرف تکتا ہے۔ مگر وہ بدھو نہیں ہے، کچھ بھانپ جاتا ہے اور کہتا ہے "آپ کو فکر نہیں کرنی چاہیئے مسز رائٹر، ہماری جان خدا کے ہاتھ میں ہے"۔ "یہی بات تو ہے، جو میں چاہتی ہوں، فکر کرنا"۔ میں کہتی ہوں۔ مگر اتنے میں برقی ٹرام دندناتی ہوئی آجاتی ہے۔ اور وہ آدمی اپنی باسک ٹوپی کو اتارتا ہے اور ٹرام کے لدے پھندے فٹ بورڈ پر کود جاتا ہے۔ ایک پادری، جو زندگی میں رچا بسا ہے۔ سبھی لوگ زندگی میں رچے بسے ہیں۔ میری فیملی اور پادری، صرف میں نہیں۔ باوجود اس امر کے کہ میں نے ابھی ابھی بچھڑے کے پٹھے کا گوشت اور نصف پونڈ کھمبیاں خریدی ہیں۔ انسان قیافہ لگا سکتا ہے کہ میں کیا پکانا چاہتی ہوں۔ ایک قسم کا الوداعی کھانا سویٹ ڈیش سمیت۔ مگر شاید میں اپنے آپ کو صرف مصروف رکھنا چاہتی ہوں۔ اور یوں بھی خاصی دیر ہو گئی ہے۔ جب میں گھر پہنچوں گی، تو بارہ بجنے والے ہوں گے۔ شاید میرے مرد نے، میں سوچتی ہوں، اس عرصے میں فون کیا ہوگا اس وقت وہ ایک میٹنگ میں ہے، بہتر ہوگا کہ میں اسے باہر بلواؤں، اگرچہ یہ بات اسے نہیں بھاتی۔

"ہاں کیا بات ہے"۔ وہ پوچھتا ہے، جب وہ بالآخر فون پر آتا ہے اور وہ بھی بے حد جھنجھلاہٹ کے ساتھ۔ میں کہتی ہوں: "کوئی بات نہیں، مجھے صرف دیر ہو گئی تھی اور میں نے شاید تمہارے فون کو مس کیا ہے"۔ "میرا فون" میرا مرد حیرت سے کہتا ہے "میں کاہے کو فون کرتا"۔ اور میں پوچھتی ہوں اس بارے میں، جو اس لمحے میرے ذہن میں آتا ہے اور مجھے بے حد اہم لگتا ہے: "کیا گاڑیاں چل رہی ہیں" میں کانپتی ہوئی آواز میں پوچھتی ہوں۔ "ہاں، برخوردار" میرا مرد کہتا ہے "میں کیسے جانوں، ہماری میٹنگ ریلوے اسٹیشن کی عمارت میں تو نہیں ہو رہی۔ یقیناً گاڑیاں چل رہی ہیں۔ تم کس لئے پوچھ رہی ہو۔ کیا تم سفر پر جانا چاہتی ہو یا کسی اور وجہ سے؟"

"بس یونہی" میں کہتی ہوں اور ریسیور کو رکھ دیتی ہوں۔ نصف گھنٹہ گذرتا ہے، جس کے دوران میں باورچی خانے میں مشغول اپنے مرد کے الفاظ کو دہراتی ہوں، جو کبھی ڈھارس بندھاتے ہیں اور پھر بے حد فکر مند کرنے لگتے ہیں۔ بالآخر میں

برداشت نہیں کر سکتی اور اسکول کی طرف چل دیتی ہوں ۔ گوٹنبرگ اسکول ، جس میں دونوں بچے پڑھتے ہیں ۔ حسن اتفاق سے بڑے گیٹ کے سامنے ہیڈ ماسٹر کھڑا ہے ، وہ داروغہ سے بات کر رہا ہے ۔ بین طور پر سیڑھیوں کا جنگلہ اکھڑ رہا ہے ، اس کا استحکام درکار ہے ۔ ہیڈ ماسٹر لوہے کی سلاخوں کو جھٹکتا ہے اور فکر مند صورت بنائے ہوئے ہے ۔

" صبح بخیر ، ہیڈ ماسٹر صاحب " میں کہتی ہوں " آپ نے بچوں کو گھر بھیجنا مناسب نہیں سمجھا ۔ آپ کو یقیناً اچھی خبریں ملی ہوں گی ، بہت خوب " ۔ " کس وجہ سے " ہیڈ ماسٹر سخت حیرت سے پوچھتا ہے " بچوں کو گھر بھجوایا جائے " ۔ وہ یوں میری طرف تکتا ہے ، جیسے میری عقل ماری گئی ہو ۔ اور میں فوراً کہتی ہوں : " ہاں ، کس وجہ سے ۔ آپ کی بات درست ہے " ۔ میں اس کے پاس سے گذر جاتی ہوں اور وہ بد گمانی سے میرے پیچھے تکتا ہے ۔ داروغہ بھی بد گمانی سے میرے پیچھے تکتا ہے ۔ مگر وہ مجھے منع نہیں کر سکتے اسکول میں جانے سے اور اپنے بچوں کی لینے سے ۔ گھنٹی بجنے والی ہو گی ۔ آخری پیریڈ ختم ہونے والا ہے ۔ اتنے میں ایک پورا گروہ جمناسٹک ہال میں سے نکلتا ہے ۔ میں اپنے بڑے بیٹے کو پہچان لیتی ہوں اور خوشی کے مارے سرخ ہو جاتی ہوں ۔ اگر وہ گھڑی اب آجائے ، میں سوچتی ہوں ، تو ہم نے ایک دوسرے کو دیکھ تو لیا ہے ۔

لڑکا دوسروں کے ہمراہ میرے پاس سے بھاگتا ہوا گذر جاتا ہے ۔ مگر ابھی سارے کونے سے مڑے ہی تھے کہ وہ واپس آتا ہے اور غصے سے کہتا ہے : " تم یہاں کیا تلاش کر رہی ہو ۔ کیا تم مجھے شرمندہ کرنا چاہتی ہو ۔ اوپر کلاوس کی چھٹی کلاس میں جاؤ ۔ مگر اسے بھی یہ بات اچھی نہیں لگے گی ۔ ہم یہاں کوئی ننھے بچوں کا اسکول تھوڑا ہی ہیں " ۔

" نہیں ، نہیں " میں کہتی ہوں اور واپس لوٹ جاتی ہوں ۔ خدا کا شکر ہے کہ ہیڈ ماسٹر دروازے پر اب نہیں کھڑا ہے ۔ میں نے چونکہ دوپہر کا کھانا تقریباً تقریباً پکا لیا ہے ، اس لئے میں آہستہ آہستہ گھر کی طرف جاتی ہوں ۔ کونے والی دوکان میں ایک اخبار خریدتی ہوں ، جس میں وہی کچھ لکھا ہے ، جو صبح والے اخبار میں لکھا تھا ۔ بہت

سے لوگ چل پھر رہے ہیں ۔ عورتیں سرخ اور نیلے کپڑوں میں ملبوس ۔ پھولوں والی دوکان پر ان کی بھیڑ ہے اور وہ سورج مکھی کے پھول خرید رہی ہیں اور انہیں احتیاط سے تھامے ہوئے ہیں ۔ اس دن کی شام ان میں سے کسی کو دیکھنی نصیب نہیں ہو گی ۔ یہ کیسی شرمناک بات ہے، میں سوچتی ہوں اور اس لفظ کو بار بار دہراتی ہوں؛ یہ لفظ جو بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک جیسا ہے اور جو میرے دماغ میں گرجنے لگتا ہے ۔

میں اتنے میں اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ جاتی ہوں اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جاتی ہوں ۔ بچے میرے پیچھے بھاگتے ہوئے آتے ہیں ۔ انہیں بھوک لگ رہی ہے اور وہ بے حد خوش ہیں ۔ بڑے کو بھول چکا ہے کہ میں اسکول میں گئی تھی ۔ "اس بے ہودہ ریڈیو کو نہ آن کرو" وہ کھانا کھانے کے بعد کہتا ہے "اس کی بجائے میری مدد کرو ۔ ہمیں جرمن میں مضمون لکھنا ہے: ویلہلم ٹل، کیا گیسلر کا قتل بدلہ لینے کے لئے تھا یا نہیں ؟" (۲) "ہاں" میں کہتی ہوں اور اس کے خوبصورت کشادہ ماتھے کو تکتی ہوں، اس کی مضبوط باہوں کو ۔ "شاید وہ اسی غرض سے تھا ۔ میں ابھی بس خبریں سننا چاہتی ہوں ۔ تم لکھنے کے لئے بیٹھ جاؤ" ۔ میں اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالتی ہوں ۔ خبروں کا وقت ہو گیا ہے، مگر خبریں نہیں آتیں ۔ ان کی جگہ پر گانے نشر ہوتے ہیں ۔ "تو ٹل کا معاملہ کیا تھا" آرنو پوچھتا ہے ۔ "تمہارا کیا خیال ہے" ۔ اور ٹل، میں سوچتی ہوں ۔ اجاڑ گلی، ہم اجاڑ گلی میں سے گذر رہے ہیں ۔ تمہیں چلے جانا چاہیئے ۔ تمہارا وقت ہو چکا ہے ۔ اور ہمارا بھی وقت تقریباً ختم ہو چکا ہے ۔ صرف اس بات کا کسی کو پتہ نہیں ہے ۔ نہیں، ایک شخص کو اس بات کا پتہ ہے ۔ اس نے گانے نشر کرنے کا حکم دیا ہے خبروں کی جگہ پر ۔ ایک شخص جانتا ہے اور وہ ہمیں موت کے منہ میں دھکیل رہا ہے ۔

"تم میرا" ہمارا منجھلا بیٹا پکارتا ہے "ہاتھ بٹا سکتی ہو مچھلیوں کا حوض صاف کرنے میں ۔ باپ کا کہنا ہے کہ مچھلیوں کا سانس گھٹ جاتا ہے اور اگر وہ مر گئیں تو وہ مجھے نئی مچھلیاں خرید کر نہیں دے گا" ۔ مچھلیوں کے حوض میں پانی گدلا ہے، جس میں انسان کو خوبصورت مچھلیوں کی جگہ دھندلے سائے تیرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

سانس کا گھٹنا، میں سوچتی ہوں ۔ شاید ہماری موت بھی سانس کے گھٹنے سے ہو گی ۔ جس شخص کی موت کا فیصلہ ہو چکا ہو، وہ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں کیا کرتا ہے بہر صورت نہ تو وہ جرمن مضمون لکھتا ہے اور نہ مچھلیوں کے حوض کے لیس دار شیشوں کو صاف کرتا پھرتا ہے ۔ "میں تمہیں کچھ پڑھ کر سناتی ہوں " ۔ میں کہتی ہوں اور کتابوں کی الماری کی طرف لپکتی ہوں ۔ گوئٹے: ہوائے نفس کا سہ المیہ ، یہ بچوں کے لئے ٹھیک نہیں ۔ ژاں پول ، ہیسپیروس ۔ کچھ بھی ہو ، بس جلدی سے پیشتر اس کے کہ وہ مخالفت میں کچھ کہہ سکیں ۔ اور میں پڑھنے لگتی ہوں ، شتابی سے مگر اٹک اٹک کر ۔ بچے اس کو بھلا کہاں سمجھیں گے ۔ مگر ضروری بھی تو نہیں کہ وہ اسے سمجھیں ۔ بس وہ چند الفاظ ساتھ لیتے جائیں ، جنہیں ایک شاعر نے لکھا ہے ۔ اپنے رستے پہ تاریکی کی جانب ، جس پہ ہم غولوں کی صورت میں رواں ہوں گے ۔ قوموں کی قومیں ، سائے سایوں کے پہلو میں ۔ سب چہروں سے عاری ۔ میں پڑھتی ہوں اور منجھلا مچھلیوں کو ایک چھوٹے سے جال سے پکڑتا ہے اور مربے کے مرتبان میں ڈالتا جاتا ہے' یہ کام اس کی توجہ کو پوری طرح جذب کئے ہوئے ہے ۔ اور بڑا فٹ بال کے کھلاڑیوں کی تصویریں بلاٹنگ پیپر پر بنا رہا ہے ۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ میری قطع کلامی کرتا ہے اور ادب سے کہتا ہے "بہت خوب امی جان ، مگر مجھے اب ٹل سے نپٹنا ہو گا ۔ اب میرے پاس اس کے لئے مزید وقت نہیں ہے " ۔ "ہاں " میں کہتی ہوں اور سوچتی ہوں کہ تم اپنا حساب کتاب آسمان کے ساتھ طے کرو ۔ مگر انسان آخر میں اسے کوئی چیز پیش نہیں کر سکتا ، سوائے واجب الادا چیزوں کی فہرست کے ۔ اس کام کے لئے انسان کا گورنر کیسلر ہونا ضروری نہیں ہے ۔

" کیا وقت ہے " ۔ میں پوچھتی ہوں اور بچوں کو سب کچھ بتا دینے کے قریب ہوں ۔ مگر یہ بتانا بھی تو سخت کڑا کام ہے ۔ اس لئے میں اپنے مرد کے گھر لوٹنے تک انتظار کرنے کا فیصلہ کرتی ہوں ۔ شاید اس نے کوئی نئی خبر سنی ہو ۔ وہ پانچ بجے کے کچھ بعد آتا ہے ۔ اسے کسی نئی خبر کا علم نہیں ہے اور میرے فون کا وہ ذکر نہیں کرتا ۔ میں اب کھڑکی کے پاس کھڑی ہوں ۔ تمام کاریں صرف ایک ہی سمت میں جا رہی ہیں ، شہر سے باہر کی طرف ۔ اور ایک بھی کار شہر کی طرف نہیں جا رہی ۔ وجہ واضح

ہے، میں سوچتی ہوں ۔ مگر بھاگ جانے میں کوئی تک نہیں ہے ۔ اور میرے مرد کو سول سرونٹ ہونے کی وجہ سے یوں بھی اس کی اجازت نہیں ہے ۔ کسی شخص کو بھاگنے کی اجازت نہیں ہے ۔ کسی کو افراتفری پھیلانے کی اجازت نہیں ہے ۔

افراتفری کے جذبات کے ذکر کی کوئی وجہ نہیں ہے ۔ اور جہاں تک کاروں کا تعلق ہے، مجھے یقیناً غلط فہمی لگی ہے ۔ کس قدر آسانی کے ساتھ انسان اس قسم کی باتیں سوچنے لگتا ہے ۔ چھ بجے کے قریب ایک واقف کار جوڑا فون کرتا ہے، ہمیں اگلی شام کو دعوت دینے کے لئے ۔ ہمارے پاس موسیقی کی محفل کے ٹکٹ ہیں ۔ میں ٹکٹ آفس میں فون کر کے پوچھتی ہوں کہ کیا محفل موسیقی منعقد کی جائے گی اور ایک آواز جواباً پوچھتی ہے : کس وجہ سے نہیں ۔ میرا مرد کام ساتھ لایا ہے اور اب رائیٹنگ ٹیبل پر بیٹھا ہے ۔ بچے اب صحن میں فٹ بال کھیل رہے ہیں ۔ میں چند ایک پرانے فوٹو البم ڈھونڈھ نکالتی ہوں اور لپنے مرد کے کمرے میں اٹھا لاتی ہوں ۔ "یہ تھے ہم" میں کہتی ہوں "شادی کے چند روز بعد ۔ یہ رہا بڑا، جب وہ ایک سال کا تھا ۔ یہ ہماری پوزیٹانو میں تعطیلات کی تصویر ہے ۔ یہ دیکھو ہم چٹانوں پر چڑھ رہے ہیں ۔ وہاں پر ہم کشتی میں سیر کر رہے ہیں" ۔ ہر چسپاں شدہ تصویر بے تحاشا یادوں کو تازہ کرتی ہے ۔ لینڈ اسکیپ، باتیں، جھگڑے اور محبت کا اظہار ۔ دن اور راتیں ۔ ساری زندگی پھر ایک بار جاگ اٹھتی ہے ۔ اور میں یہی چاہتی ہوں ۔ میں لپنے مرد سے پیار کی کانا پھوسی نہیں کر سکتی ۔ مگر میں اسے ہمارے آخری روز پوری حیات پیار و محبت سے بھرپور دکھا سکتی ہوں ۔ میں دھیرے سے پہلا البم اس کی فائلوں کے اوپر دھکیل دیتی ہوں، جنہیں میرا مرد لپنے سامنے پھیلائے ہوئے ہے ۔ "ہاں، ہاں" وہ خوش اخلاقی سے کہتا ہے اور چند ایک پرانی تصویروں کو تکتا ہے ۔ مگر پھر وہ گھڑی پر نظر ڈالتا ہے اور پوچھتا ہے "کیا ہم یہ کچھ شام کو نہیں کر سکتے یا اتوار کے روز ۔ مجھے ابھی کام کرنا ہے" ۔

میں نے بھی گھڑی پر دیکھا ہے ۔ سات بجنے والے ہیں ۔ غروب آفتاب کا گولہ یا ناقوس شام ۔ سورج غروب ہو چکا ہے، دن کا خاتمہ ہوا ۔ میں قدرتی طور پر جانتی ہوں کہ وہ ابھی نہیں ٹلا ہے اور ابھی ہر چیز ممکن ہے ۔ مزید آدھا گھنٹہ ۔ پھر میرا مرد

بچوں کو شام کے کھانے پر بلاتا ہے ۔ اور چونکہ بچے قدرتی طور پر فوراً نہیں آتے ، اس لئے کھانے سے قبل خفگی کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں اور جھگڑا ہوتا ہے ۔ بچوں کے درمیان بھی ، باپ بیٹے ، قائن اور ہابل ۔ اس طرح ہمارا خاتمہ ہو گا ۔ ہونٹوں پر ایسے کلمات لئے ہوئے ۔ دنیا کے ابدی رنج و حسد کے ساتھ ۔

ہم شام کو ہمیشہ ٹھنڈا کھانا کھاتے ہیں ۔ اور واضح ہے کہ ہم کھانے سے قبل دعا نہیں مانگتے ۔ اس وجہ سے جب میں اپنی کرسی کے پاس کھڑی رہ جاتی ہوں اور ہاتھ باندھتی ہوں ۔ تو بچے بے حد حیران ہوتے ہیں اور میرا مرد ناپسندیدگی سے میری جانب تکتا ہے ۔ میں اس کے باوجود سعی کرتی ہوں اور ایک چھوٹی سی دعا دہراتی ہوں ، جسے ہم نے بچپن میں سیکھا تھا ۔ پھر میں بے شمار دوسری باتیں کہتی ہوں ، الجھے ہوئے الفاظ میں اور لال بھبھوکا سر کے ساتھ ۔ میں شکریہ ادا کرتی ہوں ہم سب کی حیات کا اور درخواست کرتی ہوں مغفرت والی موت کی ۔ میں دیکھتی ہوں کہ میرا مرد میری بات کاٹنی چاہتا ہے اور واضح ہے کہ وہ اسے کاٹتا ہے اور بلند آواز میں کہتا ہے : " اب ہم کھانا شروع کرتے ہیں " اور بیٹھ جاتا ہے ۔ بچے بھی بیٹھ جاتے ہیں ۔ وہ اطمینان کا سانس لیتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ کیا ہم کھانے کے بعد ان کے ساتھ مل کر کھیلیں گے ، مثال کے طور پر موٹر گاڑیوں کے مارکوں کا چہار آہنگ ، جسے میں بے حد کند مغز کھیل سمجھتی ہوں ۔ مگر میرا مرد کہتا ہے : " ہاں ۔ پہلے ہم صرف خبریں سننا چاہتے ہیں " ۔ وہ میری طرف تکتے ہوئے کہتا ہے ، غالباً وہ سوچ رہا ہے کہ اس سے مجھے اطمینان ہو جائے گا ۔ وگرنہ کون جانے یہ پھر کیا کر گذرے ۔ اس نے ایک مشکل دن گذارا ہے

" ہاں " میں کہتی ہوں ۔ " ہم کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں ، مگر اس میں کامیابی نہیں ہو گی ۔ دوپہر کو بھی خبریں نہیں آئیں ۔ ان کی بجائے گانے ، ایک اطالوی گانا بھی : فیرنزے ان اون مانٹو دی ستیلا ۔ مگر خبریں کوئی نہیں " ۔ " ہم ابھی دیکھ لیتے ہیں " ۔ میرا مرد کہتا ہے : " ٹھیک آٹھ بج رہے ہیں " ۔ اب ہم سب دیوان خانے میں جاتے ہیں ، جہاں پر ریڈیو دھرا ہے ۔ ہم کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں اور سیٹ کی بتی کے ہرے ہونے کا انتظار کرتے ہیں ۔ اور اس امر کا کہ جانی پہچانی آواز

بولنے لگے ۔ بتی ہری ہو جاتی ہے ، مگر آواز نہیں نکلتی ۔ اس کی بجائے ایک سیٹی کی آواز ، بالکل ناقابل بیان ، گریہ وزاری کی بھنبھناہٹ ، جو اونچی ہوتی ہے اور مدہم پڑتی ہے ۔ ایک سائرن کی طرح ۔ مگر اس سے مختلف اور شاید ریڈیو میں سے نہیں آرہی ، بلکہ باہر سے آرہی ہے اور انسان کو بالکل پاگل بنائے دیتی ہے ۔ میں لپنے مرد کی طرف تکتی ہوں ۔ وہ ریڈیو پر جھکا ہوا ہے اور بٹنوں کو گھما رہا ہے ۔ اس کے ہاتھ بالکل سفید ہیں اور رگیں ماتھے سے ابھری پڑتی ہیں ۔ بچے بھی گھبرا گئے ہیں اور پوچھتے ہیں : " باپو یہ کیا ہے ۔ ماں یہ کیا ہے " ۔ اور منجھلا اپنی انگلیوں کو میرے بازو میں کھباتا جا رہا ہے ۔

" کیا چیز " میں کہتی ہوں ایکا ایکی شادمانی سے " یہ بے ہودہ سیٹی ۔ کوئی خرابی ہو گی ۔ ہم اس کی طرف توجہ نہیں دیتے ۔ ہم چہار آہنگ کھیلتے ہیں ۔ جاؤ کارڈ لے آؤ ۔ اور آج انعام بھی ملیں گے ۔ پہلا انعام ، دوسرا انعام ، تیسرا انعام ۔ میں نے ایک مخصوص دراز میں کچھ رکھا ہوا ہے ، میں اسے لینے جاتی ہوں ۔ اور پیارے کلاوس ، تم لتنے میں کرسیاں لگا دو " ۔ میرا مرد میری طرف تکتا ہے ، ایک سہمی ہوئی نگاہ ۔ مگر میں اب اس کی طرف توجہ نہیں دوں گی ۔ میں پہلے ایک وقت میں ایسا کرنا چاہتی تھی ، مگر اب میں ایسا نہیں کرنا چاہتی ۔ میں نے ایک اور رائے قائم کر لی ہے ۔ یہ رائے کہ اب حیات کو صرف حیات بچا سکتی ہے ۔ میں دیوان خانے کی الماری کی طرف جاتی ہوں ۔ ایک ستاروں والا نیلا غبارہ رکھا ہوا ہے ، ایک بیڑی اور فائر بریگیڈ کار ، اتنی بڑی کہ مجھے اسے چھپانا پڑتا ہے ۔ میں انعاموں کو باتھ روم کے تولئے میں لپیٹ لیتی ہوں ۔ " ادھر آنا ذرا " میرا مرد گھٹی ہوئی آواز میں پکارتا ہے ۔ ہاں گھٹی ہوئی آواز میں ۔ میں دیوان خانے میں ہنستی ہوئی جاتی ہوں لپنے مضحکہ خیز پیکٹ کو بازو کے نیچے دبائے ہوئے ۔ سیٹی کی آواز سنائی دیتی ہے ، مگر انسان اسکو شور شرابے سے دبا سکتا ہے ۔ ہمارے پاس گراموفون ریکارڈ ہیں ، بلکہ ہمارے پاس وہ گانا بھی ہے : فیرنزے ان اون مانٹو دی ستیلا ۔ میں ریکارڈ کو لگا کر سوئی کو اس پر رکھ دیتی ہوں ۔ ریکارڈ کی آواز خاصی اونچی ہے آرکسٹرا سمیت ۔ اور لتنے میں بڑے نے کارڈ تقسیم کر دیئے ہیں اور پکارتا ہے : " کون شروع کرے گا ۔ میں ، اور باپو کیا تمہارے ٹرک کے

نیچے گولیا تھ ہے "۔ اور میرا مرد جواباً چلاتا ہے: " افسوس ہے، نہیں "۔
ہاں، تو اس طرح ٹھیک ہے اور کاساندرہ کا معاملہ اس وجہ سے دوسرا تھا، کیونکہ اس کا نہ تو مرد تھا اور نہ بچے، جنہیں وہ دھوکہ دے سکتی۔ جس طرح اب میں اپنے مرد اور بچوں کو دھوکہ دے رہی ہوں۔ اگرچہ منطقی طور پر مجھے کہنا چاہیئے، دیکھ لیا ناں۔ اب تم کو مرنا ہوگا۔ تم نے میری بات پر اعتبار کیوں نہ کیا تھا۔ مگر میں یہ بات نہیں کہتی ہوں۔ اور اس لمبے دن کے خاتمے پر معاملہ یہاں تک آن پہنچا ہے کہ میں خود اپنے آپ کو دھوکہ دے رہی ہوں۔ اب کچھ نہیں ہوگا، میں سوچتی ہوں۔ دن تو قریب قریب گذر چکا ہے۔ اور میں بلند آواز میں پروگرام بنانے لگتی ہوں: " کیا کل اتوار نہیں ہے۔ نہیں شاید نہیں ہے۔ مگر اتوار تو خیر آئے گا ہی۔ تب ہم سمندر پہ چلیں گے۔ سنتے ہو، ہم بہت دور باہر چلیں گے "۔ اور بچے چلا کر کہتے ہیں: " کیا ہم فولڈنگ کشتی اور نہانے کے لئے جانگیے ساتھ لے جا سکتے ہیں "۔ مجھے پتہ ہے کہ نہانے کے لئے پانی بہت سرد ہے، مگر میں کہتی ہوں " ہاں "۔ غالباً اس لمحے میں وہ وقوعہ ہوگا، جس کو میں بیان نہیں کر سکتی۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں۔ ہم سب دھک سے رہ جاتے ہیں اور اچھل پڑتے ہیں اور ادھر دوڑتے ہیں اور ادھر دوڑتے ہیں، پھر اس طرح لوگ ایک روز ہمیں پائیں گے، میرا مطلب ہے ہمارے ڈھانچوں کو دبکی ہوئی گردنوں اور پھیلی ہوئی انگلیوں کے ساتھ۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ انہوں نے انگلیوں میں کیا پکڑ رکھا تھا، شاید تاش کے پتے۔ مگر اس وقت تو کوئی شخص موجود ہی نہیں ہوگا، جب ہمارے پنجر ملیں گے اور جو ہمارے خاندان یا کسی بھی دوسرے خاندان کے بارے میں ایسی باتیں سوچ سکے گا۔

******

(۱) کاساندرہ یونانی دیومالا کی شہزادی تھی۔ دیوتاؤں نے اسے پیش گوئی کی طاقت دے رکھی تھی۔ مگر اس پر لعنت بھیجی تھی کہ لوگ اس کی باتوں پر اعتبار نہ کریں۔ کاساندرہ نے ٹرویا کے باسیوں کو لکڑی کے گھوڑے کو، جسے یونانی حملہ آور شہر کی فصیل سے باہر چھوڑ گئے تھے، اندر لانے سے منع کیا تھا اور پیش گوئی کی تھی کہ اس کے نتیجے میں ان پر تباہی آئے گی۔ اس کی بات کسی نے نہ سنی اور گھوڑے کو کھینچ کر فصیل کے اندر لایا گیا۔ رات کے وقت

یونانی فوجیوں نے، جو گھوڑے کے اندر چھپے ہوئے تھے، باہر نکل کر فصیل کے دروازے کھول دیئے اور اپنی فوج کی مدد سے، جو دھویں کا سگنل ملنے پر واپس لوٹ آئی تھی، ٹرویا پر قبضہ کر یہ شہر کے تمام مردوں کو قتل کر دیا گیا اور عورتوں کی بے حرمتی کی گئی اور انہیں لونڈیاں بننے پر مجبور کر دیا گیا

(۲) ویلہلم ٹل سوئیٹزرلینڈ کی جد و جہد آزادی کا سورما تھا۔ گیسلر آسٹریا کی حکومت کی طرف سے گورنر تھا۔ اس نے لوگوں کو حکم دیا تھا کہ اس کی ٹوپی کو، جسے ایک درخت پر لٹکایا گیا تھا، آن کر سلامی دیں۔ ٹل نے اس کی خلاف ورزی کی، جس پر اس کو حکم ملا کہ اپنے بیٹے کے سر پر رکھے ہوئے سیب کو تیر مار کر اڑائے۔ ٹل اس امتحان میں کامیاب رہا۔ اس نے بعد میں موقعہ ملنے پر گیسلر کو قتل کر دیا تھا۔

ایلیاس کانیتی
Elias Canetti

گٹھڑی

میں جھٹپٹے میں شہر کے درمیان واقع بڑے میدان میں گیا۔ اور جس چیز کو میں وہاں پر ڈھونڈھ رہا تھا، وہ اس کی رنگینی اور گہما گہمی نہ تھی۔ ان سے میں واقف تھا۔ مجھے زمین پر دھری ہوئی براؤن گٹھڑی کی تلاش تھی، جو ایک آواز بھی نہیں، صرف ایک سر پر مشتمل تھی۔ یہ تھا ایک گہرا، لمبائی میں کھینچا ہوا بھنبھناتا ہوا "اے ... اے ... اے ... اے ... اے ... اے" ۔ وہ نہ کم ہوتا تھا، نہ بڑھتا تھا۔ مگر وہ کبھی نہیں رکتا تھا۔ اور میدان کی ہزاروں قسموں کی آوازوں اور شور و پکار میں ہمیشہ سنائی دیتا تھا۔ یہ جامع الفناء کا سب سے زیادہ غیر مبدل سر تھا۔ جو پوری شام کے دوران اور ہر شام کو ایک جیسا رہتا تھا۔

دور سے ہی میں اس کو سننے کی کوشش کرتا تھا۔ ایک بے قراری مجھے وہاں لئے جاتی تھی، جس کے لئے میرے پاس کوئی صحیح قسم کی توجیہہ نہیں ہے۔ میں بہر صورت میدان میں جاتا تھا۔ اتنی بے شمار چیزیں مجھے وہاں پر کھینچتی تھیں۔ اور مجھے کبھی یہ شک نہ ہوا کہ میں اسے وہاں پر نہ پاؤں گا، ان تمام چیزوں سمیت، جو اس سے ملزوم تھیں۔ صرف اس آواز کے بارے میں، جو صرف ایک اکیلے سر تک محدود ہو چکی تھی، مجھے ڈر لگتا تھا۔ وہ زندگی کی سرحد پر تھی۔ زندگی جو اس کو پیدا کرتی تھی، وہ سوائے اس ایک سر کے اور کچھ بھی نہ تھی۔ میں اس کو اشتیاق سے اور ڈرتے ہوئے سننے کی کوشش کرتا تھا۔ اور پھر میں اپنے رستے پر ہمیشہ ایک خاص مقام پر پہنچتا تھا، عین اسی جگہ پر، جب میں اس کو اچانک سنتا تھا۔ جیسے کسی کیڑے کی آواز "اے ... اے ... اے ... اے ... اے ... اے"۔

میں محسوس کرتا تھا کہ کس طرح ایک ناقابل فہم طمانیت میرے بدن میں

پھیل جاتی تھی ۔ اور جب کہ اس وقت تک میری چال کسی قدر ڈھیلی اور مذبذب ہوتی تھی، میں یکدم پورے وثوق کے ساتھ سر کی طرف بڑھنے لگتا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ کہاں پر تھا۔ میں اس چھوٹی سی زمین پر دھری ہوئی براؤن گٹھڑی کو جانتا تھا، جس کا میں نے کبھی سوائے ایک گہرے رنگ کے کھردرے کپڑے کے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ میں نے کبھی اس منہ کو نہیں دیکھا تھا، جس میں سے وہ " اے ... اے ... اے ... اے " نکلتی تھی۔ کوئی آنکھ نہیں۔ کوئی گال نہیں ۔ چہرے کا کوئی حصہ نہیں' میں کبھی نہ کہہ سکتا تھا کہ کیا وہ چہرہ کسی اندھے کا تھا یا وہ دیکھ سکتا تھا۔ براؤن، میلا سا کپڑا ایک ٹوپی کی طرح تھا، جو سر پر سے نیچے تک پہنچتی تھی اور سب کچھ چھپائے ہوئے تھی۔ وہ انسانی ہیولہ ... اس میں کوئی شک نہیں ... زمین پر دبکا ہوا بیٹھا ہوتا تھا اور کمر کو کپڑے کے نیچے جھکائے ہوئے ہوتا تھا۔ انسانی ہیولہ بے حد مختصر تھا۔ وہ ہلکا لگتا تھا اور کمزور۔ بس اس قدر انسان اندازہ لگا سکتا تھا۔ مجھے پتہ نہیں کہ وہ کتنا بڑا تھا، کیونکہ میں نے اسے کبھی کھڑے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ جو کچھ اس میں سے زمین پر پڑا تھا، وہ اس قدر دبکا ہوا تھا کہ اگر وہ سر کبھی رک جاتا، تو انسان لاعلمی میں اس سے ٹکرا جاتا۔ میں نے اسے کبھی آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میں نے اسے کبھی جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ مجھے علم نہیں ہے کہ آیا اسے وہاں پر لایا جاتا تھا اور رکھ دیا جاتا تھا یا وہ خود اپنی ٹانگوں پر چلتا تھا۔

جگہ جو اس نے اپنے لئے تلاش کی تھی، وہ قطعاً محفوظ نہ تھی۔ وہ میدان کا کھلا حصہ تھا۔ اور براؤن گٹھڑی کے ہر طرف سے لوگوں کا آنا اور جانا تھا۔ مصروف شاموں میں وہ انسانوں کی ٹانگوں میں بالکل گم ہو جاتی تھی۔ اور اگرچہ مجھے خوب معلوم تھا کہ وہ کہاں پر تھی اور مجھے اس کی آواز ہمیشہ سنائی دیتی تھی، اسے تلاش کرنے میں دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مگر پھر لوگ بکھر جاتے تھے اور وہ اپنی جگہ پر دھری رہ جاتی تھی۔ ایسے میں کہ اس کے گرداگرد دور دور تک میدان خالی ہو جاتا تھا' تب وہ اندھیرے میں کسی پرانے اور بہت میلے پھینکے ہوئے کپڑے کی طرح تھی، جس سے کوئی شخص جان چھڑانی چاہتا ہو اور چپکے سے لوگوں کے ہجوم میں گرا جائے، تاکہ کوئی اس کی طرف متوجہ نہ ہو۔ مگر اب لوگ جا چکے تھے اور وہ گٹھڑی اکیلی

وہاں پر پڑی تھی ۔ میں نے کبھی انتظار نہ کیا یہاں تک کہ وہ اٹھے یا اٹھا کے لے جائی جائے ۔ میں اندھیرے میں چپکے سے کھسک جاتا تھا بے بسی اور فخر کے گلہ گھونٹنے والے احساس کے ساتھ ۔

بے بسی کا تعلق خود میرے ساتھ تھا ۔ میں جانتا تھا کہ میں کبھی کچھ نہ کروں گا تا کہ گٹھڑی کا راز جان سکوں ۔ مجھے اس کے قد و کاٹھ کے بالمقابل شرم آتی تھی ۔ اور چونکہ میں اسے کوئی اور نہ دے سکتا تھا، اس لئے اسے زمین پر پڑا رہنے دیتا تھا ۔ جب میں اس کے قریب جاتا تھا، تو احتیاط کرتا تھا کہ اس سے ٹکرا نہ جاؤں، جیسے میں اسے زخمی کر سکتا اور خطرے میں ڈال سکتا تھا ۔ وہ ہر شام وہاں پر ہوتی تھی ۔ اور ہر شام میرا دل سکتے میں پڑ جاتا تھا، جب میں سر کو پہلی بار سنتا تھا ۔ اور وہ دوسری بار رک جاتا تھا، جب میری نظر اس پر پڑتی تھی ۔ اس کا وہاں پر آنے اور جانے کا رستہ مجھے اپنے رستے سے بڑھ کر متبرک تھا ۔ میں نے اسے کبھی جاننے کی کوشش نہ کی ۔ اور مجھے پتہ نہیں ہے کہ وہ کہاں پر رات کے بقیہ حصے اور اگلی صبح کے لئے غائب ہو جاتی تھی ۔ وہ ایک خاص شے تھی ۔ اور شاید وہ اپنے آپ کو ایسا جانتی تھی ۔ میرے دل میں بعض اوقات یہ خواہش پیدا ہوتی تھی ایک انگلی سے آہستگی کے ساتھ اس کی براؤن ٹوپی کو چھونے کی... اس کا اسے پتہ چل جاتا اور شاید وہ ایک دوسری آواز بھی رکھتی تھی، جس کے ساتھ وہ جواب دیتی ۔ مگر یہ خواہش فی الفور میری بے بسی کا شکار بن جاتی تھی ۔

میں نے کہا تھا کہ وہاں سے کھسکتے ہوئے ایک اور احساس میرا گلا گھونٹتا تھا: فخر، مجھے فخر تھا اس گٹھڑی پر ۔ کیونکہ وہ زندہ تھی ۔ وہ کیا سوچتی تھی، جب کہ وہ یوں دوسرے انسانوں کے درمیان پڑی ہوئی سانس لیتی تھی، یہ میں کبھی نہ جان پاؤں گا' اس کی آواز کا مطلب میرے لئے ویسے ہی اندھیرے میں رہا، جیسا اس کے وجود کا ۔ مگر وہ زندہ تھی ۔ اور ہر روز اپنے وقت پر وہاں موجود ہوتی تھی ۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ اس نے سکوں کو اٹھایا ہو، جنہیں لوگ اس کے سامنے پھینکتے تھا ۔ لوگ کم ہی پھینکتے تھے ۔ کبھی وہاں پر دو یا تین سکوں سے زیادہ نہ پڑے ہوتے تھے ۔ شاید اس کے بازو ہی نہیں تھے سکوں کو اٹھانے کے لئے ۔ شاید اس کی زبان ہی نہیں تھی

" اللہ " کے لام کو ادا کرنے کے لئے اور خدا کا نام مختصر ہو کر " اے .. اے .. اے .. اے .. اے .. اے " بن کر رہ گیا تھا ۔ مگر وہ زندہ تھی اور بے مثال محنت اور استقلال کے ساتھ اپنے واحد سر کو ادا کرتی تھی ۔ اسے گھنٹوں تک پکارتی تھی ۔ حتیٰ کہ سارے کھلے میدان میں وہ واحد سر بن کر رہ گیا تھا ۔ سر جو ساری دوسری آوازوں پر بازی لے گیا تھا ۔

شٹیفان اندرس
Stefan Andres

آسمانی جوتے

میں اپنی آدھی زندگی گذار چکا تھا اور ابھی تک نہیں جانتا تھا کہ جوتے آخر کاہے کو پائے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ایک روز میرا دونوں بوڑھی بہنوں جیز یپینا اور صوفیہ سے ملنا ہوا۔ اور یہاں پر مجھے جوتوں کے اصل مقصد کا پتہ چلا۔ پی اور صفی، اس نام سے وہ پکاری جاتی تھیں، میرے پڑوس میں رہتی تھیں۔ وہ خستہ زینے سے نیچے گلی میں شوق سے اترا کرتی تھیں، کیونکہ وہاں پر بعض اوقات بچے کھیلتے تھے یا کوئی دوسرا، جسے قبرستان جانا ہوتا تھا، سلام کرتا ہوا گذرتا تھا۔ اس طرح وہ سیڑھی کے آخری زینے پر بیٹھی ہوتی تھیں، سفید بالوں اور بھوری رنگت سمیت اور موسم کی ماری پتھریلی دیوار کی طرح، جس پر ان کے سائے پڑتے تھے، جھریوں سے اٹی ہوئیں، دھوپ کو سینکتے ہوئے اور اون کو ساتھ کے ساتھ بٹتے ہوئے۔ وہ اپنی کمروں کے گرد رسی باندھ لیتی تھیں اور اس میں چرخی کو لٹکا دیتی تھیں۔ اور جبکہ ان کے بائیں ہاتھ کی انگلیاں ریشے کی کھینچا تانی میں لگی ہوتی تھیں، ان کے دہنے ہاتھ لٹکتی ہوئی چرخی کو گھماتے جاتے تھے۔ جب میں انہیں پچھلے پہر کی سنسانی میں وہاں پر بیٹھے ہوئے دیکھتا تھا، وقار کے ساتھ اور انگلیوں کی بجلی حرکت کے ساتھ بٹتے ہوئے، تو مجھے انسانوں کی وہ عظیم لہر یاد آجاتی تھی، جو یونان سے چل کر سسلی پر پھیل گئی تھی، سیباری سے ہوتی ہوئی پائیستم اور وہاں سے پوزیتانو جا نکلی تھی۔ اور یہ دونوں بوڑھی بہنیں چمکتے ہوئے چونے اور سایہ دار زیتون کے درختوں کے بیچوں بیچ مجھ پر اس سرزمین کا راز کھولتی تھیں۔ محض اپنے وجود کے سبب وہ اس کم زرخیز مگر روشنی سے چمکتی ہوئی دھرتی کو ایک نام دینے کا باعث تھیں، ایسا نام جو اس بنجر سرزمین کو دنیا کی عظمت سے مالا مال کر دیتا تھا: عظیم یونان! مگر پھر ہر بار وہی بات پیش آجاتی تھی۔ ان کے

کپڑے مجھے میرے کھلنڈرانہ خوابوں سے بیدار کر دیتے تھے۔ وہ وہاں کی دوسری بے شمار غریب عورتوں کی طرح اترن کے کپڑے پہنے ہوتی تھیں، جنہیں ان کے رشتہ داروں نے نیویارک سے بھجوایا ہوتا تھا۔ یہ کاک ٹیل اور شام کی محفلوں کے کپڑے بڈھے دبلے جسموں پر غیر ارادی سوانگ لگتے تھے۔ جب کہ پپی اور صفی گرمیوں اور سردیوں میں ننگے پاؤں گھومتی تھیں۔ چونکہ مجھے علم نہ تھا کہ انہوں نے کبھی جوتے نہیں پہنے تھے، اس لئے میں ایک روز ان سے پوچھ بیٹھا کہ ان کے رشتہ دار انہیں جوتے کیوں نہیں بھیجتے۔ صفی نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور فوراً جواب دیا.... وہ پپی سے زیادہ تیز تھی.... جوتے؟ اس کے لئے ابھی بہت وقت ہے۔ اس نے بائیں ہاتھ کو چرخی سے اٹھایا اور ہوا میں دور ہٹانے کا اشارہ کیا۔ پپی نے تائید میں سر کو ہلایا' مگر مجھے جوتوں کے بارہ میں اب بھی پہلے سے زیادہ پتہ نہ چل سکا۔

پھر جنگ آئی اور چونکہ وہ کم ظرف ہے۔ اس نے نیویارک سے پرانے کپڑوں اور جوتوں کے پیکٹوں کا پوزیتانو پہنچنا روک دیا۔ بے شمار بڈھے بالکل یا آدھے ننگے پاؤں گھومنے لگے اور بوڑھی بہنوں کے برہنہ پیر میرے تجسس کو بیدار نہ کر پاتے تھے۔ ابھی جنگ نے اپنا کاؤنٹر بند کیا ہی تھا کہ نیویارک میں پیکٹوں کے ڈاک خانے نے اپنی کھڑکی کھول لی۔ اور سارا پوزیتانو جنگ سے پہلے کے نیویارک کی سڑک نمبر فلاں جیسے کپڑوں میں ملبوس گھومنے لگا۔ بوڑھی بہنوں کے گھر بھی ایک بڑا بادبانوں کے کپڑے میں سلا ہوا بنڈل پہنچا اور وہ بھی ہماری اس وقت نو سالہ بیٹی کے کندھوں پر۔ یقیناً اس میں دوسری کار آمد چیزوں کے علاوہ جوتے بھی ہوں گے، ہم نے سوچا۔ مگر جب میں نے بوڑھی بہنوں کو اگلی بار ان کے معمول کی جگہ پر نیچے سیڑھی پر پایا، تو وہ ہمیشہ کی طرح برہنہ پا تھیں۔ مناسب اخلاقی فاصلے کو پاٹنے کے مصمم ارادے کے ساتھ میں نے پوچھا کہ کیا پیکٹ میں جوتے نہیں تھے؟

صفی نے سر کو اٹھایا اور اپنے تیز انداز میں جواب دیا: "جوتے؟ یقیناً پیکٹ میں جوتے موجود تھے۔ یوں بھی اب وقت کا تقاضا تھا کہ جوتے آتے!" ضرور... پھر اگر جوتوں کے آنے کا وقت آن ہی پہنچا تھا، تو وہ کیوں برہنہ پا بیٹھی ہوئی تھیں؟ میں نے یہ بات نرم روپی سے کہی۔ اس نے مجھے قریب قریب وہی صفی والا جواب دیا،

مگر ساتھ ہی ٹھنڈی سانس بھری کہ اب جب کہ جوتے آ گئے تھے، وہ اطمینان کے ساتھ مر سکتی تھی۔

چونکہ میں جوتوں اور اطمینان کے ساتھ مرنے کے درمیان کوئی تعلق نہ سمجھ پایا تھا، اس لئے مزید سوال کرنے سے باز آ گیا۔ مجھے جوتوں کے اصل مقصد کا شاید کبھی پتہ نہ چلتا، اگر پپی ہماری اس گفتگو کے تھوڑے دنوں کے بعد اچانک نہ مر جاتی، ہم نے صرف اس قدر سنا تھا کہ وہ اپنے تاریک مکان کے پتھریلے زینے سے نیچے گر گئی تھی۔ ہم اس سے اگلے روز اپنی وفات پانے والی ہمسائی کے ہاں گئے، جیسا کہ رسم و رواج کا تقاضا ہے۔ میں نے اس انداز سے، جس سے صفی مسلسل میری طرف تکتی رہی تھی، محسوس کیا کہ وہ کوئی بات کہنا چاہتی تھی۔ اس لئے میں نے اپنے عزیزوں کو گھر بھیج دیا اور خود اس کے پاس بیٹھا رہا۔ مرنے والی پپی اپنی حیات کے دنوں کی طرح نرم روی سے اور کسی قدر بے خیالی کی مسکراہٹ کے ساتھ سن رہی تھی۔

صفی نے اپنی بات کا سلسلہ کسی قدر آنسو بہانے اور انہیں پونچھنے کے بعد شروع کیا۔ پھر اس نے سرد آہ بھری، چند بار سینے کو کوٹا، ماڈونا (حضرت مریمؑ) کو پکارا اور بار بار پپی سے معافی کی طلب گار ہوئی۔ اسے کسی کے سامنے اقرار کرنا چاہیئے، اس نے سرگوشی میں کہا، اپنے دل کو ہلکا کرنا چاہیئے۔ پادری کے سامنے بولنے سے اسے ابھی بہت ڈر لگتا تھا۔ وہ ایک روز اپنے گناہ کا اقرار (پادری کے سامنے) کرے گی، جب وہ اپنے اندر اس کی طاقت پائے گی۔ مگر پپی بھی ہمیشہ کچھ ایسی فرشتہ نہ تھی، جیسی اب.... صفی نے ایک اچٹتی ہوئی اور خاصی ملامت بھری نظر لاش پر ڈالی۔ ان کے درمیان بعض باتیں، بہت ساری باتیں، پیکٹ کے پہنچنے کے بعد وقوع میں آئیں تھیں۔ سب کچھ وہ نہیں بتا سکتی۔ پھر وہ غصے سے بھر گئی تھی اور بستر پر لیٹ گئی تھی، اور پپی سے کہا تھا کہ وہ بیمار تھی۔ "میں اسے اپنی نوکرانی بنانا چاہتی تھی۔ اسے اپنے بستر کے گرداگرد ایک لٹو کی طرح نچانا چاہتی تھی۔ ہاں ہاں یہ میرا ارادہ تھا!"

جب میں نے اس سے سیدھے سیدھے پوچھ لیا کہ آخر وہ کس وجہ سے اپنی نرم رو بہن کے خلاف اس قدر سنگدل بن گئی تھی، تو اس نے مرنے والی کی طرف دیکھا اور آخر میں سر کو ہلایا: "نہیں، اس بات کا پپی کو خود اقرار گناہ کرنا ہو گا"۔ اس نے

دلجمعی کے ساتھ کہا: "میں آپ کو صرف وہ بات بتاؤں گی، جس کا ارتکاب مجھ سے ہوا"۔ اس کی بیماری کے تیسرے یا چوتھے روز پپی نے جان لیا کہ وہ بالکل بیمار نہ تھی۔ اور اس وجہ سے اس کے لئے پانی کا گلاس لے کر نہ آئی، جس کے لئے اس نے اسے کہا تھا' زینے سے نیچے باورچی خانے والا رستہ، پپی نے کہا، کسی قدر تاریک تھا اور اسے پتہ نہیں تھا کہ موم بتی اور دیا سلائیاں کہاں پر دھری تھیں۔

اس پر صفی نے تحکمانہ انداز میں پکار کر کہا کہ وہ عمر میں بڑی تھی .... وہ چھیاسی برس کی تھی، جب کہ پپی ابھی چوراسی سال کی تھی۔ اور اس نے کچھ اور بھی کہا تھا۔ مگر پیشتر اس کے کہ صفی اپنے اصلی الفاظ کو دہراتی، جو واقع میں گالی کے مترادف تھے، وہ کسی قدر جھکی، احتیاط سے مرنے والی کی طرف نگاہ ڈالی اور پھسپھسائی: "تو آخر مر کیوں نہیں جاتی، نکمی جوں!"

انسان سمجھ سکتا ہے کہ نرم رو پپی نے مزید پس و پیش نہ کیا، بلکہ دیوار کو ٹٹولتے ہوئے فوراً نیچے کو چل دی۔ عین اس لمحے صفی نے ایک چیخ سنی۔ پپی صرف "ماڈونا" کہہ پائی، پھر خاموشی چھا گئی۔

صفی نے کرتے کے پلو سے آنسو پونچھے، اپنی کرسی سے اٹھی اور پلنگ کی پائنتی کی طرف گئی: "یہ دیکھیں" اس نے سمجھانے کے انداز میں کہا: "سینیور، یہ جوتے، اس نے انہیں پہن رکھا تھا.... یہی اصلی سبب تھا...."

میں اٹھا اور صفی کے پہلو میں جا کر کھڑا ہوا۔ مرنے والی کے پاؤں پر جوتے چڑھے ہوئے تھے۔ فیروزہ دار روغن والے جوتے، کسی جشن یا ڈانس کی خاطر پہنے جانے والے۔ پٹیاں بڑے نخرے کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں، نہیں شوخی دارانہ۔ ایڑیاں شراب کے گلاسوں جتنی لمبی تھیں۔ بالکل، صفی نے سچ کہا تھا، یہی اصلی سبب تھا۔

میں فوراً جان گیا۔ یہ جوتے نہ صرف پپی کے گرنے کا سبب بنے تھے، بلکہ دونوں بہنوں کے درمیان جھگڑے کا بھی....

"خوبصورت جوتے"۔ میں نے کہا: "اب مجھے اپنے جوتے بھی دکھاؤ"۔

ناک کے رستے اپنے آنسوؤں کو اوپر کھینچتے ہوئے صفی الماری کی طرف سرکتی

ہوئی گئی اور ایک سفید ڈبے کو میرے پاس لائی۔ وہ اس میں دھرے تھے۔ ویسے ہی روغن سے چمکتے ہوئے اور پٹی دار، ویسی ہی اونچی ایڑیوں والے۔ مگر پپی کے سبک پھولوں کی طشتریوں کے بالمقابل صفی کے بڈھیوں والے تھے، سلیقہ دار اور بس سیدھے سادے نفیس۔

میں نے صفی کی عمر کے تقاضے کے سبب گدلی آنکھوں میں جھانکا اور کہا: "پپی والے مجھے زیادہ پسند ہیں"۔

"او، مجھے بھی سینیور"۔ اس نے زور سے بات کاٹی اور ہونٹوں کو آگے کی طرف دھکیل دیا۔

"مگر یہ کہ تم اس وجہ سے بستر میں لیٹ گئی تھیں اور اپنی بہن کو نوکرانی بنا لیا تھا"۔ میں نے سرزنش کے انداز میں سر کو ہلایا۔

صفی تھوڑی دیر تک روتی رہی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے بالآخر اس معاملے پر روشنی ڈالنے اور ایک حد تک الزام سے اپنی بریت کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔

"جی ہاں، سینیور" اس نے کہنا شروع کیا: "میں نے پپی پر ظلم کیا، مگر اس نے مجھ پر بھی ظلم کیا تھا۔ جب ہم نے جوتوں کا پیکٹ کھولا، تو وہ اس خوبصورت جوڑے کو، جو اس نے پہن رکھے ہیں، لے کر کمرے کے کونے میں، ادھر، بھاگ گئی اور بار بار کہتی جاتی تھی: "یہ میرے ہیں۔ اتورے نے انہیں میرے لئے بھیجا ہے"۔ مگر اتورے کے خط میں یہ بات بالکل نہیں لکھی تھی کہ یہ جوتے کس کے لئے ہیں۔ آپ کی بیٹی نے سینیور، اتورے کے خط کو ہمیں دو بار پڑھ کر سنایا تھا۔ مگر اس بات کا اس میں بالکل ذکر نہیں تھا، بالکل نہیں"۔ "بہت خوب بہن" اس پر میں نے کہا: "جوتے نہ تمہیں ملیں گے اور نہ مجھے۔ جو کوئی ہم میں سے پہلے مرے گا، وہ اسے ملیں گے"۔ کیا یہ بات منصفانہ نہ تھی، سینیور؟ مگر پپی نے اس پر مجھے کیا کہا: "ہوں، میں تمہیں جانتی ہوں۔ اگر میں مر گئی، تو تم مجھے دوسرا جوڑا پہنا دو گی"۔ سینیور، میں غصے کے مارے بیمار پڑ گئی اور بستر میں جا لیٹی۔ سچ مچ میں اب محسوس کرتی ہوں، میں واقع میں کسی قدر بیمار تھی۔ اور پپی کیا کرتی ہے؟ میری آنکھوں کے سامنے جوتے پہن لیتی ہے اور میرے بستر کے گرد چلتی پھرتی ہے۔ میں کیا کہتی ہوں، چلنا؟

وہ لنگڑاتی ہے، کسی مرغی کی طرح ۔ جوتے اس کو بہت چھوٹے تھے ۔ مجھے وہ بالکل پورے آتے ۔ اور جب میں نے اسے یہ بات کہی، تو وہ چلائی ... کوئی انسان ہماری بھلی مانس پپی سے اس کی توقع نہ رکھ سکتا تھا... " خنزیر کے پائے " اس نے زور سے کہا " ماڈونا اس شخص کو لگا دے، جو مجھ سے ان جوتوں کو چھینتا ہے " ۔ میں قسم کھا سکتی ہوں کہ پپی نے یہ بات کہی تھی .... یا نہیں، کیا تم نے یہ نہیں کہا تھا؟ " ۔

صفی نے یہ سوال، جو اس نے جھجک سے اور روندھی ہوئی آواز میں کیا تھا، لاش کو مخاطب کر کے کیا ۔ " میں جانتی ہوں کہ میں نے اسے نچایا " ۔ صفی نے بات کو جاری رکھا " مگر سینیور، اگر اس نے ان جوتوں کو کبھی اتارا ہوتا، کم از کم شام کے وقت یا رات کو .... آخر کون جوتوں سمیت بستر میں لیٹتا ہے.... تو کیا وہ زینے سے گر سکتی تھی ؟ "

میں نے اس سے اتفاق کیا، مگر اسے یاد دلایا کہ پپی ان دونوں میں سے چھوٹی تھی اور یہ کہ چھوٹی بہن کا خوبصورت جوتوں پر حق بنتا تھا ۔

پپی کے دفنائے جانے کے بعد رشتہ داروں کی تاریک گود میں سے ایک بھتیجا نکل آیا، اور بغیر اس کے کہ وہ صفی سے پوچھے، اپنے لمبے چوڑے خاندان کے ساتھ مکان کے نچلے حصے میں منتقل ہو گیا، اسے فیصلہ کن رنگ میں یہ کہتے ہوئے کہ ایک لاچار پھوپھی کو اکیلا چھوڑنا اس کی ناموس کے خلاف تھا ۔ صفی نے میری بیٹی کو سڑک پر روکا اور اسے سرگوشی میں بتایا کہ یہ بھتیجا ایک مکار بھڑیا تھا ۔ وہ صرف اس کے مرنے کے انتظار میں تھا تاکہ اس کے مکان پر، گدوں، فرنیچر اور دیگچیوں پر قبضہ کر لے ۔ مگر یہ تو کچھ بھی نہیں، وہ بچی کے کان کی طرف جھکی اور سرگوشی میں کہا: " بیاٹریس، وہ میرے جوتے اپنی بیوی کے لئے حاصل کرنا چاہتا ہے ۔ اور میں... میں جنت کے دروازے پر ننگے پاؤں کھڑی ہوں گی! "

بیاٹریس نے اپنے ماں باپ کو بلکہ پادری کو بھی صفی کی پریشانی کا شریک راز بنا دیا ۔ پادری کا کہنا تھا کہ اہم ترین امر بڑھئی سے بات کرنا تھا، جو ایک روز صفی کو تابوت میں لٹائے گا ۔ اس پر ہر بات کا انحصار تھا ۔ اسے تابوت کو اتنی دیر تک بند نہیں کرنا چاہیئے، جب تک صفی اپنے شاندار جوتے نہیں پہن لیتی ۔

ایک روز صفی ہمارے باغ میں دروازے کے باہر بیٹھی تھی اور دستک دے رہی تھی۔ جب ہم سب آگئے اور اس کے گرد کھڑے تھے، تو اس نے شرم کے مارے ایک ہاتھ منہ پر رکھتے ہوئے بیان کیا کہ ڈاکو اس کے جوتے چوری کر کے لے گئے تھے۔ "ڈاکو" اس کے علاوہ ہمارے کچھ پلے نہ پڑا تھا اور "جوتے"۔

ہم نے تجویز پیش کی اتورے کو لکھنے کی۔ یقیناً جلد نئے جوتے آجائیں گے، پہی کے جوتوں سے بھی بڑھیا۔ اس پر اس نے ہاتھ کو منہ کے سامنے سے ہٹا لیا اور خوفزدگی سے پکاری: "اور اگر میں کل مرجاؤں یا پرسوں، جوتوں کے بغیر۔ تو میں کیسی کھڑی ہوں گی؟ پھر کیا ہوگا؟ میں ان کے بغیر تو نہیں...." اس کی آواز اس قابل شرم صورت حال کے پیش نظر جواب دے گئی، جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی: بستر مرگ پر برہنہ پا اور پھر سب سے بڑھ کر جنت کے دروازے پر!

ہم نے فوراً پادری سے مشورہ کیا۔ غریب بڑھیا کے جوتوں کو اس کی اگلے اتوار کی گرجتی ہوئی چرچ سروس میں اس قدر جنتی چمک دمک اور چور کے فعل کو اتنی جہنم کی کالک ملی کہ اگلی صبح جوتے صفی کے کمرے کے باہر دھرے ہوئے تھے۔ اسی سوموار کے روز صفی ہمارے ہاں نعل پوش مانگنے آئی۔ بیاٹریس اس کے ساتھ گئی اور اس کی جوتے پہننے میں مددگار بنی۔ اب وقت آگیا تھا اس کے لئے جوتے پہننے کا، صفی نے کہا: "اور میں انہیں پہنے رہوں گی۔ پھر مجھے اطمینان رہے گا"۔ وہ چالاکی سے مسکرائی: "کیونکہ یہ نیچے والے ڈاکو وگرنہ بعد میں کہیں گے، میرے پاؤں پھولے ہوئے تھے اور وہ انہیں مجھے پہنا نہ سکے تھے"۔

بھنچے ہوئے منہ کے ساتھ اس نے ایک قدم اٹھانے کی جرأت کی اور ایک کراہٹ کے ساتھ دوسرا: "جنت میں" اس نے کہا اور مسکرانے کی کوشش کی "وہ نہیں چبھیں گے"۔

تھوڑے دنوں کے بعد بیاٹریس نے بڑھئی کو ایک تابوت لئے ہوئے قدیم بھورے مکان میں جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ فوراً اس کے ساتھ چل دی اور بعد میں ہمیں صفی کے پاس بلا لائی۔ بڑھیا تابوت میں پڑی تھی اور اسی انداز میں مسکرا رہی تھی، جیسے اس کی بہن۔ جوتے چمک رہے تھے۔ اور بیاٹریس نے بڑھئی کے کان میں کچھ کہا

اس نے سر کو اثبات میں ہلایا اور تابوت کے ڈھکنے کو اٹھایا اور اس کی تصدیق کی:
"تمہاری بات درست ہے۔ پادری نے بھی مجھے کہا تھا۔ ہم تابوت کو ابھی بند کر دیتے ہیں!"

ہم سب صفی کی تائید میں مسکرا دیئے اور مجھے بالآخر پتہ چل گیا کہ جوتے کاہے کو پائے جاتے ہیں۔

ہانس بینڈر
Hans Bender

روٹی لانے والا

"تم روٹی لانے والے ہو" ایک نے نوربرٹ سے کہا، جس نے بستر کے پاس اپنا کوٹ اتارا تھا۔

"ہاں، مجھے پتہ ہے"۔

"تم روٹی لانے والے ہو" ایک اور نے کہا۔

"تم روٹی لانے والے ہو" ایک نے کہا اور نوربرٹ کی پیٹھ پر ٹھونکا مارا۔

"مجھے پتہ ہے۔ مگر مجھے پہلے ہاتھ تو دھو لینے دو"۔

"میں اس کے بغیر بھی روٹی لے لوں گا" کوئی اوپر سے پکارا۔

نوربرٹ نے ہاتھ پونچھے۔ طشتری کو پرچھتی پر سے اٹھایا اور بیرک کے سامنے والے کمرے میں گیا۔ سرے والے کمرے کے سامنے روٹی لانے والے قطار میں کھڑے تھے۔ اندر پروپیگنڈسٹ گن رہا تھا: "ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ..."

"میں ایک بار دو روٹیاں کھانی چاہتا ہوں" نوربرٹ سے اگلے آدمی نے کہا۔

"دو؟ میں دس کھا جاؤں" ایک اور نے کہا۔

"... بارہ، تیرہ، چودہ، پندرہ ..." پروپیگنڈسٹ نے گنتی کی۔ نوربرٹ دروازے کی طرف بڑھا۔ پھر اس سے آگے صرف ایک آدمی تھا۔ نوربرٹ دہلیز تک پہنچا اور اس نے کمرے پر نظر دوڑائی۔

دائیں اور بائیں دیوار کے ساتھ بستر بچھے ہوئے تھے۔ سفید، نرم گرم لحاف بستروں پر پڑے ہوئے تھے اور سفید غلافوں والے تکیے۔ بستروں کے اوپر فریم شدہ فوٹو۔ دائیں بستر کے اوپر ایک تختہ لگا ہوا تھا، جس پر کتابیں رکھی تھیں۔ ایک کونے میں کھڑکی کے نیچے، جو خاصی بڑی تھی اور جس میں تقسیم شدہ شیشے لگے ہوئے

تھے ، ایک چولہا بنا ہوا تھا ، جسے اینٹوں سے چنا گیا تھا ۔ اس کے سامنے ایک بنچ پڑا تھا ' نوجوان پروپیگنڈسٹ اس پر بیٹھا ہوا تھا ۔ ٹانگیں سکیڑے اور تختے کو ، جس پر وہ روٹیوں کی تقسیم کا حساب درج کرتا تھا ، اس نے گھٹنے پر تھام رکھا تھا ۔ کمرہ گرم تھا ' لکڑیوں کے جلنے کی گرمی ۔ نوجوان پروپیگنڈسٹ نے قمیص کے بازوؤں کو اوپر اڑسا ہوا تھا ۔ قمیص کالر دار تھی اور استری شدہ ۔

" تمہیں کس قدر روٹیاں ملنی ہیں ؟ " عمر رسیدہ پروپیگنڈسٹ نے پوچھا ۔

" چوبیس " نوربرٹ نے کہا ۔

" درست ہے ناں ؟ " عمر رسیدہ پروپیگنڈسٹ نے نوجوان سے پوچھا ۔

" درست " اس نے جواب دیا ۔

" ایک ، دو ، تین ، چار ، پانچ ... " عمر رسیدہ پروپیگنڈسٹ روٹیوں کو نکال کی ایک ایک کر کے اس کی طشتری پر رکھتا گیا ۔ روٹی گہرے بھورے رنگ کی تھی اور سیلی ، چوکوروں میں کاٹی ہوئی ۔ چولہے کے سامنے ان کا میز پڑا تھا ، میز پوش سمیت ۔ ایک گلدان ، جس میں کاغذی پھول لگے ہوئے تھے اور چاینا کی ایش ٹرے ، جس میں نوجوان پروپیگنڈسٹ نے اپنے دھواں چھوڑتے ہوئے سگریٹ کو رکھا ۔

" ... بائیس ، تیئس ، چوبیس ... کیا تم نے ساتھ ساتھ گنتی کی ہے ؟ " عمر رسیدہ پروپیگنڈسٹ نے پوچھا ۔

" کیا چیز ؟ "

" میرا مطلب ہے کہ کیا تم نے ساتھ ساتھ گنا ہے ؟ ممکن ہے کہ میں تمہیں دھوکہ دوں ۔ پھر تمہیں صبح تک بھوکا رہنا پڑے گا " ۔

" نہیں ، میں نے گنتی نہیں کی ہے " نوربرٹ نے کہا ۔

" دیکھا ناں ... مگر میں نے تم سے دھوکہ نہیں کیا ہے " ۔

نوربرٹ نے روٹیاں تقسیم کیں ۔ ایک روٹی بچ گئی ۔ اس نے آدمیوں کی گنتی کی ۔ سارے موجود تھے ، چوبیس ۔ ہر کسی کو اس کی روٹی مل گئی تھی ۔

" میرے پاس ایک روٹی زائد ہے " نوربرٹ نے ونزڈورف ، اپنے ہمسائے سے کہا ۔ وانزڈورف کے پہلو والے نے کہا " پروپیگنڈسٹ کے پاس لے جاؤ ۔ وہ ہمیشہ

بھوکا ہوتا ہے"۔

ونزڈورف نے سکون سے کہا"ہاں، اسے دے آؤ۔ یقیناً کسی اور گروپ کو کم ملی ہو گی"۔

"بے وقوف" ایک نے کہا۔

"ایک زائد روٹی؟ کیا وہ مار کھانی چاہتا ہے" اوپر سے ایک نے کہا اور نیچے کو جھکا۔ نوربرٹ نے طشتری کو اٹھایا اور روٹی کو لے کر راہداری میں سے گذرا۔ سرے والے کمرے کے دروازے پر اس نے دستک دی۔ نوجوان پروپیگنڈسٹ نے دروازہ کھولا اور چلایا"کیا معاملہ ہے؟"

"میرے پاس ایک روٹی زائد ہے" نوربرٹ نے کہا۔

"ادھر لاؤ" پروپیگنڈسٹ نے کہا۔ اس نے روٹی لے لی۔ دروازہ بند کیا اور تالے کو چابی لگا دی۔

قیدی تختوں کے بستروں پر سکڑ کر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے کھانے کے برتنوں کو گھٹنوں کے درمیان پکڑا ہوا تھا اور روٹی ان کی رانوں پر پڑی تھی۔ وہ گھونٹ بھرتے تھے اور لقمہ چباتے تھے۔ کھڑکی کے شیشوں پر برف جمی ہوئی تھی اور بجلی کا لیمپ زرد روشنی پھیلا رہا تھا۔

ونزڈورف دو روز قبل ایک دوسرے کیمپ سے علیحدہ ٹرانسپورٹ میں آیا تھا، اس نے ٹینک والوں کی کالی وردی پہن رکھی تھی۔ کندھوں کے فیتے اتارے جا چکے تھے۔ اور کہنیوں پر ٹینٹ کے کپڑے کے ٹکڑے بڑے بڑے ٹانکوں سے سلے ہوئے تھے۔ ونزڈورف قد کاٹھ کا اچھا اور خوش شکل تھا۔ وہ صاف ستھرا تھا اور نوربرٹ کو اس کے پہلو میں سونے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔

نوربرٹ نے کہا"انسان کو سرے والے کمرے میں رہنا چاہیئے۔ ان کے پاس میز ہے، چولہا ہے، بستر ہے اور جب وہ سونے کے لئے لیٹتے ہیں، تو اپنے کوٹوں اور پتلونوں کو اتار دیتے ہیں"۔

ونزڈورف نے کہا"مجھے یہاں پر رہنا زیادہ پسند ہے"۔

نوربرٹ نے کہا"اتنے چہروں کو نہ دیکھنا۔ روشنی اور پھر چولہا، جس میں

انسان لکڑیاں ڈال کر ان کو جلتے ہوئے دیکھ سکتا ہے"۔

"ہاں، آگ میں دیکھنا مجھے بھی پسند تھا" ونزڈورف نے کہا۔

"پیٹسامو میں ہم نے ایک بار آگ جلائی تھی"۔

"کیا تم پیٹسامو میں تھے؟"

"تین دوستوں کے ساتھ، جو مجھ سے عمر میں بڑے تھے"۔

"پیٹسامو بہت دور ہے"۔

"پیٹسامو کے قصے کو بند کرو۔ میں سونا چاہتا ہوں" ونزڈورف کے پہلو والے نے کہا۔

"تم دیکھتے ہو، اس لعنتی بیرک میں انسان باتیں بھی نہیں کر سکتا" نوربرٹ نے کہا "آدمی کو سرے والے کمرے میں ہونا چاہیئے"۔

شام کے وقت پروپیگنڈسٹ بیرک میں آیا۔ قیدی، جو کھانے کے بعد باتیں کر رہے تھے، اس کے آنے پر چپ ہو گئے۔ وہ موٹا تھا اور اونی کمبل سے بنا ہوا کوٹ پہنے ہوئے تھا، جسے کیمپ کے درزی نے سیا تھا۔ وہ تیزی سے چل رہا تھا اور اس کی آنکھیں کسی پر نہ ٹکتی تھیں۔ وہ نوربرٹ کے سامنے رک گیا اور کہنے لگا "میرے ساتھ آؤ۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے"۔

نوربرٹ کے سر میں خون دوڑ گیا۔ پروپیگنڈسٹ نے اس کے ساتھ بات کی تھی اور دوسرے دیکھ رہے تھے۔ نوربرٹ اپنے کٹ بیگ سے لگا ہوا تھا۔ پروپیگنڈسٹ آگے آگے چلتا گیا اور اس نے دروازے کو نوربرٹ کے داخل ہونے کے بعد قفل لگا دیا۔

"کیا یہ وہی ہے؟" عمر رسیدہ پروپیگنڈسٹ نے نوجوان پروپیگنڈسٹ سے پوچھا، جس کا نام ویرنر تھا۔

"ہاں، یہ وہی ہے، جو روٹی واپس لایا تھا" ویرنر نے کہا۔

"مگر یہ میرا صریحی فرض تھا" نوربرٹ نے کہا۔

"نہیں، یہ کچھ ایسا صریحی فرض نہیں تھا" پروپیگنڈسٹ نے کہا "ہر دوسرا اسے خود ہڑپ کر جاتا۔ تم بھی اسے کھا جاؤ۔ اس نے شیلف پر سے روٹی اٹھائی اور

نوربرٹ کو دی۔

"شکریہ" نوربرٹ نے کہا" بھوک مجھے ہر وقت لگی رہتی ہے"۔

"ہمارے پاس بیٹھ جاؤ" پروپیگنڈسٹ نے کہا" یا تم بہت تھکے ہوئے ہو؟"

"میں کھانے سے پہلے اب تک سویا رہا تھا" نوربرٹ نے کہا۔

"تم کہاں پر بیٹھنا چاہتے ہو؟ بستر پر؟ کرسی پر؟ بینچ پر؟"

"بینچ پر سب سے بڑھ کر"۔

وہ بینچ پر چولہے کے سامنے بیٹھ گیا۔ چولہے پر لوہے کا توا پڑا تھا، جو گرم تھا۔

"تم چائے بنا دو" پروپیگنڈسٹ نے ویرنر سے کہا۔ اور نوربرٹ سے پوچھا" کیا تمہیں یاد ہے کہ مکھن کیسا مزا دیتا ہے؟"

"مکھن؟"

"اسے پتہ نہیں ہے۔ اسے مکھن دے دو"۔

ویرنر کھڑکی کی طرف جھکا اور مکھن کا ڈبہ اٹھا لایا۔ ویسا گول کالا بیکیلیٹ کا ڈبہ، جو جنگ کے دنوں میں مارکیٹوں میں بکتے تھے۔ ویرنر نے ڈھکنا کھولا اور ڈبے کو نوربرٹ کی طرف بڑھا دیا۔

"اور چاقو؟"

"یہ لو چاقو"۔

"شکریہ"۔

"خوب اچھی طرح اس پر لگا لو"۔

"جانتے ہو" پروپیگنڈسٹ نے کہا" ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تم سرے والے کمرے میں منتقل ہو جاؤ۔ کیمپ کا روسی کمانڈر چاہتا ہے کہ ہم پہرے داروں کی عمارت کے سرے والے کمرے میں چلے جائیں۔ یہاں پر ایک قیدی آ جائے گا، جو روٹی تقسیم کرے گا اور نگرانی کرے گا۔ ہم سوچ ہی رہے تھے کہ تم روٹی واپس کرنے آ گئے۔ مگر تم تو کھا ہی نہیں رہے"۔

"اسے شرم آ رہی ہے" ویرنر نے کہا۔

اس نے روٹی اور چاقو کو نوربرٹ کے ہاتھوں سے لے لیا اور اس پر مکھن لگا دیا،

اس نے پیالی میں، جو نوربرٹ کے سامنے رکھی تھی، چائے ڈال دی۔ چائے مکھن لگی روٹی کے قریب بھاپ دینے لگی۔

پروپیگنڈسٹ نے کہا" تم کسی اور کو بھی کمرے میں ساتھ رکھ سکتے ہو۔ بستر یوں بھی یہاں پڑے ہی رہیں گے۔ کیا تم ونزڈورف کو، جو تمہارے پہلو میں پڑا ہے، ساتھ نہیں لاؤ گے؟"۔

ویرنر نے کہا" ہاں یہ ممکن ہے۔ ونزڈورف اگرچہ صرف دو روز سے یہاں پر ہے، مگر وہ ٹھیک لگتا ہے"۔

" اگر تمہیں یہ بات پسند ہے" عمر رسیدہ پروپیگنڈسٹ نے کہا" تو ونزڈورف کو اپنے ساتھ کمرے میں لے آؤ۔ میرا خیال ہے کہ ترجمان عورت کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔

یہ پروپیگنڈسٹ تو خیالات کو ماتھے پر سے پڑھ سکتے ہیں۔ نوربرٹ نے سوچا۔

پروپیگنڈسٹ کمرہ خالی کر گئے۔ نوربرٹ نے ان کے بکسوں کو، ایک پیٹی کو، کتابوں اور برتنوں کو پہرے داروں کی عمارت کے سرے والے کمرے میں پہنچانے میں مدد دی۔

نوربرٹ اور ونزڈورف اس کمرے میں اٹھ آئے۔ بلب آنکھیں چندھیا رہا تھا' اور چولہے میں لکڑیاں دھری تھیں۔ ونزڈورف نے ایک لکڑی کی چھال ادھیڑی، اس کو دیا سلائی دکھائی اور اسے چولہے میں ڈال دیا۔ اس نے اس پر لکڑیاں چنیں، جو جلنے لگیں۔ نوربرٹ نے کوڑے کرکٹ کو ایک ڈسٹ بن میں ڈالا، کمرے میں جھاڑو دیا، اور گدوں پر چادریں پھیلا دیں۔

" ہمارے پاس تصویریں ہونی چاہیئں"۔ ونزڈورف نے کہا۔

میرے پاس فوٹو ہیں" نوربرٹ نے کہا۔

" میرے پاس کوئی نہیں ہیں" ونزڈورف نے کہا۔" انہوں نے مجھ سے لے لئے تھے، جب مجھے بوردیچی قید خانے میں ڈالا گیا"۔

" تم قید خانے میں تھے؟"

"ہاں، مگر اس کے بارہ میں تمہیں بعد میں سناؤں گا"۔

ونزڈورف نے پانی کو ابالا اور چائے بنائی۔ انہوں نے سیگریٹ سلگائے اور چولہے کے سامنے بینچ پر بیٹھ گئے۔ آدھی رات کے وقت انہوں نے سٹریچر کو اٹھایا اور دوسرے روز کے لئے روٹی لینے کو لنگر والی بیرک کی طرف چل دیئے۔ برف بڑے بڑے گیلے گالوں کی صورت میں گر رہی تھی۔ روٹی دینے والے سفید کوٹوں میں ملبوس کونٹر کے پیچھے کھڑے تھے اور روٹیوں کو سٹریچر پر رکھتے جاتے تھے۔

"یہ دو زیادہ ہیں" روٹی دینے والوں کی نگرانی کرنے والے نے کہا "جو کوئی سرے والے کمرے میں رہتا ہے، اس کو ایک روٹی زیادہ ملتی ہے۔ اس بات کا چرچا نہ کرنا"۔

ایک گھنٹہ وہ سونے کے لئے لیٹ گئے۔ ونزڈورف نے کپڑے اتار دیئے۔ نوربرٹ نے کپڑے اتار دیئے۔ بیرک میں آدمی کپڑے نہیں اتار سکتا تھا۔ وہاں پر آدمی تختوں پر لیٹتے تھے۔ ہر کسی کے پاس صرف ایک کمبل یا ایک اوور کوٹ تھا، اور رات کو سردی ہو جاتی تھی۔

"تمہیں کیسا لگ رہا ہے؟" نوربرٹ نے پوچھا۔

"خوب" ونزڈورف نے کہا۔

"تم مجھے پیٹسامو کے بارہ میں بتانا چاہتے تھے"۔

"میں تھکا ہوا ہوں، نوربرٹ، میں کل تمہیں پیٹسامو کے بارہ میں سناؤں گا، نہ صرف پیٹسامو کے بارہ میں"۔

بلب نوربرٹ کی آنکھوں کے اوپر لٹک رہا تھا۔ جب تک وہ جلتا رہا، وہ نہیں سو سکتا تھا۔ مزید کچھ دیر تک بیدار رہنا خوب تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ روٹی کی خوشبو آ رہی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ چولہے کی دیوار پر رکھا۔ وہ دیر تک گرم رہی۔

گروپ باہر جا چکے تھے، سوائے دو قیدیوں کے، جن کے پاؤں کی انگلیاں ایک روز پہلے منجمد ہو گئی تھیں۔ نوربرٹ نے روٹیوں کو ترتیب دی۔ گتے کے سائن بورڈ نمبروں اور گروپوں کی تعداد والی ڈھیریوں کے سامنے کھڑے کئے۔ داڑھی

مونڈھی، میلی قمیص کو بدلنے کے لئے دھوبی خانے میں گیا۔

"کپڑوں کا تبادلہ ہفتہ کو ہوتا ہے" کپڑوں کے انچارج قیدی نے کہا۔

"میں سرے والے کمرے میں رہتا ہوں" نوربرٹ نے کہا۔

"پھر اور بات ہے" کونٹر کے پیچھے کھڑے قیدی نے کہا۔ اس نے کپڑوں کے ڈھیر میں ڈھونڈا اور کہا "میں تمہیں ایک کالر والی قمیص دیتا ہوں، استری شدہ"

ہر چیز بہتر تھی، اگر انسان سرے والے کمرے میں رہتا ہو۔

اس نے تازہ قمیص پہنی اور بستر پر لیٹ گیا۔ ویرنر اندر آیا۔ اس نے کہا "تمہیں مترجم عورت بلا رہی ہے"۔

"مترجم عورت؟"

"شیطان جانے، وہ کیا چاہتی ہے"۔

نوربرٹ کو کبھی مترجم عورت سے پالا نہیں پڑا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ وہ خطوں کو سنسر کرتی تھی۔ وہ پہرے داروں والی عمارت کے ایک کمرے میں بیٹھتی تھی۔ بعض اوقات وہ کسی افسر کے ساتھ کیمپ میں جایا کرتی تھی۔ وہ لانگ بوٹ اور یونیفارم کا اوور کوٹ پہنتی تھی اور اپنے بالوں کو چوٹیوں میں گوندھ کر سر کے گرد باندھتی تھی۔

"جلدی کرو" ویرنر نے کہا۔

نیند کے غلبے سے لڑھکتا ہوا نوربرٹ ویرنر کے پیچھے پہرے داروں کی عمارت میں داخل ہوا۔ مترجم عورت نے دروازہ کھولا۔ ایک افسر اس کے پہلو میں میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ "دن بخیر، آپ کا کیا حال ہے؟" وہ ہنس رہا تھا، کیونکہ اسے سکھائے گئے الفاظ کو صحیح طریق سے ادا کرنا دشوار لگ رہا تھا۔ اس نے سگریٹوں کا ایک پیکٹ میز کے اوپر سے اس کی طرف بڑھایا، جس میں سگریٹ رکھے ہوئے تھے، جن کا منہ میں پکڑنے والا حصہ سنہری رنگ کا تھا۔

مترجمہ نے ایک سگریٹ لیا اور افسر نے ایک سگریٹ لیا۔

مترجمہ نے کہا "آپ سرے والے کمرے میں رہتے ہیں، بیرک نمبر سات"۔

"جی ہاں" نوربرٹ نے کہا۔

"اور آپ کے ساتھ کون رہتا ہے ؟"

"وسنزڈورف اس کا نام ہے" نوربرٹ نے کہا" وہ تین دن قبل کیمپ میں آیا ہے"۔

"آپ کی وسنزڈورف کے ساتھ خوب بنتی ہے ؟" مترجمہ نے پوچھا۔

"جی، بہت خوب" نوربرٹ نے کہا۔

افسر اور مترجمہ ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ پھر اس نے پوچھا "آپ کو روسی زبان نہیں آتی ؟"

"نہیں" نوربرٹ نے کہا" صرف گالیاں بکنا"۔

"گالیاں بکنا بری بات ہے" مترجمہ نے کہا" روسی بری گالیاں دیتے ہیں"۔

افسر نے ایک کاغذ میز کے اوپر نوربرٹ کی طرف بڑھایا اور کہا" دستخط کرو"۔

مترجمہ نے کہا"یہاں پر دستخط کر دیں۔ بس ایک سرسری کاروائی"۔

"دستخط ؟" نوربرٹ نے پوچھا" دستخط کاہے کو ؟"

"تا کہ آپ اپنا منہ بند رکھیں۔ صرف اس چیز کا وہ آپ کو پابند کر دے گا۔ تا کہ آپ ان ساری باتوں کے بارے میں خاموشی اختیار کریں، جن کے بارے میں اب گفتگو ہو گی۔ سمجھے ؟"

نوربرٹ نے قلم اٹھایا اور بہت سی روسی سطروں کے نیچے اپنا نام لکھ دیا۔ اس نے سوچا: میرا نام خوبصورت نہیں ہے۔ میرا خط بھدا ہے۔ اب میں شرم محسوس کیا کروں گا، جب میں اپنا نام لکھوں گا۔

"اگر آپ اس کے باوجود اس بارہ میں کچھ افشا کریں گے، تو آپ کو ہمارے قانون کے مطابق سزا دی جائے گی" مترجمہ نے کہا۔

میں نے کیوں دستخط کئے ہیں ؟ نوربرٹ نے سوچا۔ کاغذ اس کے سامنے پڑا تھا' اس نے اس کو کیوں چاک نہ کر دیا ؟

مترجمہ نے کاغذ کو اٹھا لیا۔ افسر بولنے لگا اور مترجمہ نے کہا" آپ یقیناً نہیں چاہتے کہ پھر جنگ ہو۔ اور آپ پھر زخمی ہو کر قیدیوں کے کیمپ میں آئیں ؟"

"نہیں نوربرٹ نے کہا" میں از سر نو قید میں نہیں پھنسنا چاہتا"۔

"مگر ایسے قیدی پائے جاتے ہیں، جو چاہتے ہیں کہ دوبارہ جنگ ہو۔ ونزڈورف ان میں سے ایک ہے، جو چاہتے ہیں کہ پھر جنگ ہو"۔

"میں نہیں مانتا" نوربرٹ نے کہا۔

"ہمارے پاس ثبوت موجود ہیں کہ وہ ایسا چاہتا ہے۔ مگر ابھی سارے ثبوت نہیں ملے ہیں۔ اس چیز کو روکنے کے لئے کہ ونزڈورف جیسے لوگ پھر ایک جنگ شروع کریں، آپ کو ہماری مدد کرنی چاہیئے"۔ مترجمہ نے کہا۔

"مدد کرنا۔ میں مدد نہیں کر سکتا ہوں" نوربرٹ نے کہا۔

مترجمہ نے کہا "ونزڈورف آپ کو سنائے گا کہ وہ پہلے کیا کرتا رہا ہے۔ اگر وہ آپ کو نہ سنائے، تو آپ اس سے معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ اس نے چیکوسلاواکیہ میں ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا"۔

"ونزڈورف..."

"ہم اس بات کو کاغذات سے جانتے ہیں۔ اگر وہ آپ کو بتائے، تو ہمارے پاس آئیں۔ اس طرح آپ ہماری مدد کر سکتے ہیں"۔

افسر بولتا چلا گیا۔ مترجمہ اس کی بات کو سنتی رہی۔ پھر اس نے نوربرٹ سے کہا "آپ کو خوب آرام ملے گا۔ آپ سرے والے کمرے میں رہتے ہیں اور آپ کو کام کے لئے بھی نہیں جانا پڑتا۔ لیفٹیننٹ میخائیلوف نے اس بات کا حکم دیا ہے"۔

افسر نے پھر ایک بار سیگریٹوں کے پیکٹ کو آگے بڑھایا۔

پھر نوربرٹ چلا گیا۔

بیرک ایک پہاڑی پر بنی ہوئی تھی۔ رستہ اوپر کو چڑھتا تھا اور اس پر پھسلن تھی۔ لکڑی کی نو سیڑھیاں بیرک تک جاتی تھیں۔ دونوں، جن کے پنجے منجمد ہو گئے تھے، اپنے تختوں پر لیٹے ہوئے تھے اور سو رہے تھے۔ نوربرٹ کمرے میں بستر پر جا کر بیٹھ گیا۔ جب اس نے گروپ کے قدموں کی چاپیں اور آوازیں سنیں، تو وہ سہم گیا'

نوربرٹ نے روٹی تقسیم کی۔ ونزڈورف نے اس میں اس کا ہاتھ بٹایا۔ روٹی لانے والے دھلیز پر ہجوم کر کے آئے اور طشتریوں کو پیٹوں کے سامنے تھامے ہوئے

تھے۔ آدھی رات کو نوربرٹ اور ونزڈورف اسٹریچر لیکر لنگر گئے۔ اور جب وہ بستروں پر لیٹے ہوئے تھے، تو نوربرٹ نے کہا "آج میں تمہیں سناتا ہوں"۔

"پیٹساموکے بارہ میں؟" نوربرٹ نے پوچھا۔

"ہاں، آخر کیوں نہیں ... کوئی "خاموش" نہیں پکارتا اور کسیکو سیگریٹ کا دھواں تنگ نہیں کرتا۔ کیا میں تمہارے لئے بھی بناؤں؟ کیا میں تمہارے لئے ایک سیگریٹ بناؤں؟"

"ہاں، ہاں" نوربرٹ نے کہا۔

ونزڈورف نے اپنے پہلے سفروں کے بارے میں سنایا۔ قریبی اور دور کے سفروں اور پیٹساموکے سفر کے بارے میں۔ اس نے جھیلوں کو بیان کیا، جنگلوں کو، ٹنڈرا کو، نصف شب کے سورج کو اور فن لینڈ کی ریل گاڑی کے سفر کو۔ اس نے فن لینڈ کے شہروں کے نام لئے: کواوپیو، کونایا، سورتوولا اور ساوکوسکی۔ ونزڈورف خوب بیان کر سکتا تھا۔ نوربرٹ نے ہر چیز کو دیکھا، جیسے اس نے بیان کیا تھا۔

"اس وقت میری عمر چودہ برس تھی" ونزڈورف نے کہا "یہ ۱۹۳۱ء کی گرمیوں کا ذکر ہے۔ اگلے برسوں میں میں اٹلی میں تھا، یوگوسلاویہ میں تھا اور آخری سفر ہم نے سکاٹ لینڈ کا کیا تھا۔ بعد میں باہر نکلنا اتنا آسان نہیں تھا۔ ۱۹۳۸ء کے موسم بہار میں مجھے چیک فوج میں بھرتی کر لیا گیا اور گرمیوں سے پہلے فسادات ہوئے۔

آگے کچھ نہ سناؤ۔ نوربرٹ کہنا چاہتا تھا، مگر اس نے کچھ نہ کہا۔

"چیکوسلاویہ ایک خوبصورت ملک ہے" ونزڈورف نے کہا "تم مغربی حصے میں رہنے والوں کو اس بارہ میں کچھ پتہ نہیں ہے۔ ہم سرحد سے زیادہ دور نہ رہتے تھے، میرا باپ بلدیہ کا صدر تھا۔ ۱۹۳۸ء کی گرمیوں میں چیک محکموں نے میرے باپ کو تنگ کرنا شروع کیا... کیا تم سن رہے ہو، نوربرٹ؟"

نوربرٹ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے آنکھیں موند رکھی تھیں۔ وہ ہر لفظ سن رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر ونزڈورف نے آگے سنایا، تو اس کا بھید نکل جائے گا۔ کیا اس نے ایک انسان کو قتل کیا تھا؟ نہیں، وہ اس بات کو نہیں جاننا چاہتا تھا۔ وہ اسے نہیں جاننا چاہتا تھا۔

نوربرٹ نے نیند کا دھوکہ دینے کے لئے گہرے سانس لئے۔ اس نے سنا کہ ونزڈورف خاصی دیر کے بعد اٹھا، ننگے پاؤں اس کی طرف چل کر آیا، اس پر جھکا اور بلب کو پیچ میں گھمایا، یہاں تک کہ وہ بجھ گیا۔

دونوں میں سے ایک، جن کے پنجے منجمد ہو گئے تھے، اندر آیا اور پوچھنے لگا کہ کیا وہ اپنی روٹی کو روسٹ کر سکتا ہے۔ نوربرٹ خوش ہوا کہ وہ آیا تھا۔

"اگر تم روسٹ کر کے کھانا پسند کرتے ہو، تو کیوں نہیں؟"۔

قیدی اپنی لکڑی کی تھالی لئے چولہے کے سامنے گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ روٹی کے ٹکڑوں کو توے پر ڈالا اور پھر ان کو پلٹا، یہاں تک کہ دونوں طرفیں براؤن ہو گیئں۔ اس نے اوپر کو نگاہ اٹھائی اور کہا "میں ایک روٹی کو بارہ حصوں میں کاٹ لیتا ہوں۔ اس طرح دن کے ہر گھنٹے میرے پاس روٹی کا ٹکڑا ہوتا ہے"۔

نوربرٹ نے اسے بچ جانے والی روٹیوں میں سے ایک دے دی۔ روٹی روسٹ کرنے والے نے کہا "اب میرے پاس چوبیس روٹی کے ٹکڑے ہوں گے اور میں ہر نصف گھنٹے میں ایک کھا سکوں گا"۔

نوربرٹ نے سوچا۔ اگر میں اسے ایک اور دے دوں، تو وہ ہر بیس منٹ میں روٹی کھا سکے گا۔ اور اگر میں ایک اور دے دوں، تو پندرہ منٹوں میں اور اگر اس کو ایک اور دوں اور ایک اور، پھر ایک اور... وہ اس کا حساب نہ لگا سکا۔ نہیں، وہ حساب لگانے میں کبھی اچھا نہیں تھا۔

گروپ عام دنوں کے مقابلے میں دیر سے واپس لوٹے۔ حفاظتی دستوں میں سے ایک نے ایک قیدی کو بازو میں اپنی بندوق سے زخمی کر دیا تھا۔ گفت و شنید ہوتی رہی تھی۔ قیدی شفاخانے کے رستے میں مر گیا تھا۔ کھانے کے بعد قیدی نہیں سوئے۔ وہ بکھرے ہوئے گروپوں کی صورت میں تختوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

شام کے وقت، جب نوربرٹ اور ونزڈورف بستروں میں لیٹے ہوئے تھے، ونزڈورف نے کہا "تم کیا کرو گے، اگر کوئی تمہارے باپ کو مار ڈالے۔ تمہاری ماں کو انتہائی ظالمانہ طریق سے قتل کر دے۔ تمہارے خاندانی مکان کو آگ لگوا دے اور تمہیں وہ بذات خود چند ہفتوں کے بعد نظر آ جائے؟ وہ کھسکنے والا ہے۔ بھیس بدلے

ہوئے ہے۔ مگر تم اسے پہچان لیتے ہو اور وہ تمہیں پہچان جاتا ہے۔ وہ تمہارے سامنے روں روں کرتا ہے اور تم اس کے ساتھ جو چاہو کر سکتے ہو۔ تم اکیلے اس کے سامنے کھڑے ہو، پستول تمہارے ہاتھ میں ہے اور کوئی نہیں دیکھتا کہ تم کیا کر رہے ہو؟

"بات واضح ہے" نوربرٹ نے کہا۔

ونزڈورف نے دیوار کی طرف رخ پھیر لیا۔ اس کے شانے لحاف میں سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ اس کے چند سینٹی میٹر لمبے بال اپنے سروں پر کھڑے تھے۔

کیا مجھے اسے سب کچھ بتا دینا چاہیئے؟ نوربرٹ نے سوچا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا، پتلون پہنی، پاؤں کو لکڑی کے سینڈلوں میں ڈالا اور بیرک میں چلا گیا۔ کونے میں روشنی کے نیچے قیدیوں کا ایک گروپ کھڑا تھا۔ ایک نے نوربرٹ کو آتے ہوئے دیکھا۔ اس نے دوسروں کو بتایا۔ وہ منتشر ہو گئے اور تختوں پر پسر گئے۔

ایک چوہا روشنی کے نقطے پر گرا۔ اس نے دانتوں میں روٹی کا ایک ٹکڑا تھام رکھا تھا۔

اگلی صبح بیرک خالی تھی۔ وہ دونوں بھی جن کے پنجے منجمد ہو گئے تھے۔ ساتھ چلے گئے تھے۔ برف شیشوں پر جمی ہوئی تھی۔ زمین نم تھی، ہوا صرف شدہ لگتی تھی۔

آج وہ مجھے لے جائیں گے۔ نوربرٹ نے سوچا۔

شام کے قریب، گروپوں کے واپس آنے سے ایک گھنٹہ قبل ویرنز آیا اور کہنے لگا "مترجمہ تمہارا انتظار کر رہی ہے"۔

نوربرٹ پہرے داروں کی عمارت میں گیا۔ دروازہ کھلا تھا اور مترجمہ میز سے لگی بیٹھی تھی۔

"نئی خبریں کیا ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں" نوربرٹ نے کہا۔

"آپ ہر شام اکٹھے ہوتے ہیں" مترجمہ نے کہا "آپ آپس میں گفتگو کرتے ہیں، ایک دوسرے کو سناتے ہیں اور آپ کچھ نہ جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں؟"

"مجھے کسی بات کا پتہ نہیں ہے" نوربرٹ نے کہا۔

"اس نے شاید اشارے کئے ہوں گے۔ اشارے بھی کافی ہیں"۔

"نہیں"۔

افسر کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے کہا "دن بخیر۔ آپ کا کیا حال ہے" اس نے اپنے اوور کوٹ میں سے بٹوا نکالا اور نوربرٹ کے سامنے میز پر چار نوٹ رکھ دیئے۔

مترجمہ نے کہا "انہیں رکھ لیں۔ آپ کو جو چیز پسند ہو، وہ خریدیں۔ شاید مکھن کھانے کا آپ کو شوق ہے؟"

"مجھے مکھن کھانے کا شوق نہیں ہے" نوربرٹ نے کہا۔

"پھر کوئی دوسری چیز" مترجمہ نے کہا۔

"میں پیسے نہیں لوں گا" نوربرٹ نے کہا۔

اس نے افسر کے لئے ترجمہ کیا۔ وہ ہاتھوں سے اشارہ کرتا ہے۔ مترجمہ کہتی ہے "ہم آپ کو مجبور کر سکتے ہیں بتانے پر، جو کچھ ونزڈورف نے آپ کو بتایا ہے"۔

"مجھے اس کی کسی بات کا پتہ نہیں ہے" نوربرٹ نے کہا۔

"اس نے آپ کو بتایا ہے۔ بیرک میں سے ایک آدمی نے سنا ہے"۔

"کسی نے نہیں سنا۔ کیونکہ ہم نے اس بارہ میں بات ہی نہیں کی"۔

مترجمہ نے کہا "آپ کیوں اس کو بچانا چاہتے ہیں؟ آپ کے بچاؤ کا اس کو کوئی حق نہیں پہنچتا"۔

اب نوربرٹ نے کوئی جواب نہ دیا۔ مترجمہ اٹھ گئی، افسر بھی کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ سرگوشی کی۔ باہر دروازے پر پہرے داروں کا افسر چلایا۔ گروپ واپس آ گئے تھے۔ ان کے چوبی سینڈل منجمد رستے پر کھڑک رہے تھے۔

مترجمہ نے پوچھا "تو آپ ہمیں نہیں بتانا چاہتے؟"

"نہیں" نوربرٹ نے کہا "مجھے پتہ نہیں ہے۔ اور اگر مجھے پتہ ہوتا، تب بھی میں نہ بتاتا۔ ونزڈورف میرا دوست ہے"۔

مترجمہ نے ترجمہ کیا۔ نوربرٹ کو پتہ نہیں تھا کہ دوست کو روسی زبان میں کیا کہتے ہیں۔ "ڈروگ" یا اسی قسم کا کوئی اور لفظ۔ کیونکہ مترجمہ بار بار کہتی تھی

"ڈروگ" اور افسر بار بار کہتا تھا" ڈروگ" اور جس طرح وہ اس کو ادا کرتے تھے، وہ کوئی کالا اور خطرناک لفظ تھا۔ درمیان کے الفاظ کم ہوتے چلے گئے۔ اور افسر بار بار صرف " ڈروگ " کہتا جاتا تھا۔ اور اونچی آواز سے اور غصے کے ساتھ۔ وہ چلایا " ڈروگ اور میز کے پیچھے سے سامنے کی طرف آیا۔ نوربرٹ کے قریب کھڑا ہوا، جو سر کو جھکائے بیٹھا تھا، اور اس کی آنکھوں کے بیچ مکہ مارا۔

شام کے وقت نوربرٹ اور ونزڈورف بیرک میں منتقل ہو گئے۔ ویرنر، نوجوان پروپیگنڈسٹ، سرے والے کمرے میں آگیا اور کمانڈ سنبھال لی۔

نوربرٹ کام پر گیا۔ وہ اس گروپ میں شامل تھا، جو ریل کی پٹڑی بنا رہا تھا۔ کام مشکل تھا، مگر یہ بہتر تھا۔

جب گروپ واپس لوٹا، تو نوربرٹ روٹی لانے والا تھا۔

" تم روٹی والے ہو " ساری اطراف سے انہوں نے پکارا۔

" اسے بھوک نہیں ہے " ایک نے کہا۔

" اس نے سرے والے کمرے میں پیٹ بھر کر کھا لیا ہے " ایک اور نے کہا۔

نوربرٹ نے طشتری اٹھائی اور سرے والے کمرے کی طرف چل دیا۔ اس نے اپنی نظر کو طشتری پر جمائے رکھا۔ اور پروپیگنڈسٹ نے اس پر روٹیاں گن کر دھریں۔ نوربرٹ نے روٹیاں تقسیم کیں۔ ایک بچ گئی۔ اس نے دوسری بار گنتی نہ کی۔ روٹی کو اپنی جگہ پر رکھ دیا، اس روٹی کے ساتھ، جو اس کے حصے کی تھی اور ان پر اوور کوٹ کو ڈال دیا۔

قیدیوں نے اپنے برتنوں سے شوربہ چپڑ چپڑ پیا۔ انہوں نے اپنے بنائے ہوئے سگریٹ پیے اور سونے کے لئے لیٹ گئے۔

نوربرٹ سویا نہیں۔ اوور کوٹ اس کے ساتھ پڑا تھا اور اس کے نیچے دو روٹیاں چھپی ہوئی تھیں۔ اس کو سردی لگ رہی تھی، مگر اس نے اپنے آپ کو نہیں ڈھکا۔

کھانے کے بعد نوجوان پروپیگنڈسٹ بیرک میں گھوما۔ اس نے افسروں

والے لانگ بوٹ پہنے ہوئے تھے۔ تختوں کے آخر میں وہ ایک اسٹول پر چڑھ گیا۔ اس نے دو انگلیوں کو کوٹ کے بٹنوں کے درمیان ڈالا اور دھاڑا "ادھر سنو!"

قیدیوں نے اپنی آنکھوں کو مسلا۔ ویرنر نے زور سے کہا

"ساتھیو، ہم جانتے ہیں کہ ایک روٹی کی کیا قیمت ہے۔ ہم نے روٹی کی قدر کرنی سیکھ لی ہے۔ جو کوئی کسی ساتھی کی روٹی چراتا ہے۔ وہ اس کی جان لے لیتا ہے، تم میں سے ایک جان بوجھ کر ایک روٹی زائد لے آیا ہے۔ اس نے وہ روٹی واپس نہیں کی۔ چار گھنٹوں کے بعد بھی واپس نہیں کی۔ اس نے ایک ساتھی کی روٹی چرا لی ہے"۔

قیدی غصے میں تھے۔ انہوں نے پکار کر کہا "وہ خنزیر کہاں پر ہے؟"... "ہمیں اس کا نام بتاؤ"... "ہم اس خنزیر کا نام جاننا چاہتے ہیں"۔

پروپیگنڈسٹ نے کہا "ہم اس کی رپورٹ روسیوں کے پاس کر سکتے ہیں"۔

"بالکل نہیں" قیدی چلائے۔

پروپیگنڈسٹ نے کہا "روسی اس معاملے کو کوئی اہمیت نہیں دے گا۔ اس کا کوئی نقصان نہیں ہوا ہے۔ اس نے ہمیں ہمارے حق کی روٹی دے دی تھی۔ اس کے علاوہ ہم جرمن خود اپنے آپ کو ننگا کر دیں گے"۔

"ہم اس کو سزا دیں گے" قیدی بڑبڑائے۔

پروپیگنڈسٹ نے کہا "ہاں ایک دوسرا طریق موجود ہے۔ ہم خود اس کو سزا دیتے ہیں"۔

قیدی چلائے "ہمیں اس کا نام بتاؤ"۔ "اب اس خنزیر کا نام بتا بھی چکو"۔

پروپیگنڈسٹ اسٹول سے نیچے اترا۔ وہ راہداری میں سے گذرا اور نوربرٹ کے سامنے جا کر رک گیا۔

پروپیگنڈسٹ نے اوور کوٹ کو کھینچ لیا اور قیدیوں نے دو روٹیوں کو پڑے ہوئے دیکھا۔

وہ درندوں کی طرح چلائے اور پروپیگنڈسٹ نے اس شور شرابے میں زور سے کہا "تم جانتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا چاہیئے"۔

انہوں نے نوربرٹ کو تختے سے نیچے کھینچ لیا۔ اس کو مکے مارتے ہوئے دروازے کی طرف دھکیلا، جہاں پر کھلی جگہ تھی۔ ایک نے اس کا کوٹ اتار لیا۔ اور ایک نے قمیص بدن سے نوچ لی۔ انہوں نے اسے دوسری راہداری میں کھینچ لیا تاکہ اسے سارے بستروں کے پاس سے گذرنا پڑے۔ ایک نے اس پر لاٹھی دے ماری۔ ایک نے زنجیر سے اس کو مارا، جس کے دونوں سروں کو اس نے پکڑ رکھا تھا۔ اور ایک نے، جس پر جاسوس ہونے کا شبہ تھا، اس کے منہ پر مکہ مارا۔ ایک نے اپنا دایاں بازو اس کے سامنے اٹھایا، پھر اسے نیچے گرا دیا اور کہا "تم میری نظروں میں بے انت گندے ہو۔ میں اپنے ہاتھوں کو گندا نہیں کرنا چاہتا۔ بے انت گندے ہو تم میرے نزدیک"۔ ایک نے اپنی چوبی جوتوں کو اس پر پھینکا، اور ایک نے گندا پانی کھانے کے برتن میں سے اس کی آنکھوں پر دے مارا۔ ایک نے اس کے پیٹ میں لات ماری۔ اس کے بعد نوربرٹ کو کچھ پتہ نہیں لگا کہ انہوں نے اسے کہاں پر اور کس چیز کے ساتھ مارا۔

چند قدم وہ آگے آیا اس بستر تک، جس پر ونزڈورف بیٹھا ہوا تھا۔ اپنے پہلو میں ستون کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے نوربرٹ نے اپنا ہاتھ پھیلایا اور ونزڈورف نے اس کو تھام لیا۔

یواخیم زائیپل
Joachim Seyppel

شہر "س" میں

مجھے "س" جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ سبھی نے، جو "س" کو جانتے تھے، اس کا ایک پر فضا قصبہ ہونا بیان کیا تھا۔ سالہا سال تک ملک سے غیر حاضری کے بعد میرے دل میں تلافیٔ مافات کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔ اس طرح کہ قرب و جوار میں واقع قصبوں اور دیہات کی سیر کی جائے پیشتر اس کے کہ وقت نکل جائے۔ چنانچہ میں نے ویک اینڈ پر "س" جانے اور کم از کم اتوار کی شام تک وہاں پر ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔

تیسرے پہر کے ڈھلنے کے وقت میں اسٹیشن پر پہنچا۔ یہ نومبر کا دھند آلودہ دن تھا۔ شام کی سیاہی اپنے معمول کے مطابق پھیل رہی تھی۔ اور جب میں گاڑی سے اترا، تو ہوا کے ایک اچانک جھونکے نے انجن کے دھویں کے بادل کو اسٹیشن کی عمارت پر پھیلا دیا۔ میں ہجوم کے درمیان جلدی سے گیٹ سے نکل کر اسٹیشن کے بیرونی میدان میں آگیا، جہاں صرف چند لیمپ روشنی پھیلا رہے تھے۔ اسٹیشن ہوٹل میں، جہاں پر میں نے ایک کمرہ بک کروایا تھا، میرا استقبال مالک ہوٹل نے معذرت کے ساتھ کیا کہ کمروں کی ہیٹنگ محض واجبی سی ہے، کیونکہ ایک بوئیلر خراب ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود اسے امید تھی کہ مجھے ہوٹل اور شہر پسند آئیں گے۔ اس نے میرے اٹیچی کیس کو ہوٹل کی نوجوان ملازمہ کے ذریعہ پہلی منزل پر بھجوایا۔ ملازمہ لگتا تھا نروس تھی۔ چابی اس سے گر گئی اور بجلی کے سوئچ کو بھی وہ فوراً تلاش نہ کر پائی، جو واقعہ میں خاصی پوشیدہ جگہ پر لگایا گیا تھا، ایک الماری کے پیچھے کھڑکی کی جانب۔ اور پھر وہ شہروں کو بھی گڈمڈ کرنے لگی۔ کیونکہ جب میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ وہاں کی رہنے والی ہے، تو اس نے جواب دیا: نہیں وہ "س" سے ہے:

... اور ہم "س" میں ہی تو تھے۔ میں ہنس دیا۔ اور میں نے اسے ٹپ دی۔ اور جب وہ باہر جا رہی تھی، تو میں نے اس کے ننگے بازو کو اپنی انگلیوں سے چھوا۔

لپنے آپ کو سرسری طور پر دھونے اور شب خوابی کا لباس نکالنے اور بستر پر پھینکنے کے بعد میں شتابی سے شہر کی طرف نکل گیا، جیسے وہاں پر کسی سے اہم ملاقات کے لئے وقت مقرر کر رکھا ہو اور جس سے مجھے کسی صورت میں غیر حاضر نہیں رہنا چاہیئے۔ یہ امر مجھے چھبتا تھا کہ مجھے بازو کے نیچے پسینہ آیا ہوا تھا اور قمیص بغلوں میں گیلی ہو رہی تھی، جس سے میری اس وقت کی حالت اور میرے وہاں پر آنے کے محرکات میں ایک نمایاں تفاوت عیاں ہوتا تھا۔ میں نے بازار میں اچنبھے سے دیکھا کہ کیوں کر ایک کار ٹیکسی ہونے کا سوانگ کر رہی تھی۔ لوگوں کا طور طریق ایسا تھا، جیسے ان کا قصبہ ایک بڑا شہر ہو، جب کہ حقیقت میں وہ اس سے کہیں بہتر تھا۔ ایک پیارا سا بڑا گاؤں۔ چرچ کی عمارت میں معمول کے مطابق قصبوں کی تعلی کا رنگ غالب تھا۔ نچلا حصہ پتھروں سے بنا ہوا تھا، تو چیپل اور اوپر والی عمارت انیسویں صدی کے طرز تعمیر میں اینٹوں سے بنی ہوئی۔ گویا نچلا حصہ اصلی اور اوپر دوغلا پن۔ یہ تسلی کرنے کی غرض سے کہ میں فی الواقعہ سینٹ نیکولائی چرچ ہی کو دیکھ رہا تھا، میں نے ایک سپاہی سے پوچھ لیا۔ نہیں، اس نے جواب دیا، یہ مارین چرچ ہے۔ میں نے ناموں کو خلط ملط کر دیا تھا۔ یہ فی الواقعہ مارین چرچ ہی تھا، جس کی طرف میرے دوستوں نے خاص طور پر متوجہ کیا تھا۔ میں نے ٹیڑھے مینار کو پہچان لیا، مگر گیٹ کے پاس پائے جانے والا باروک اسٹائل کی قبر کا کتبہ نہ مل سکا۔ اسے یقیناً میوزیم میں پہنچا دیا گیا تھا۔ میں نے مجلس بلدیہ کی عمارت اور زمانہ ہائے وسطیٰ کی فصیل کے ایک ٹکڑے کو دیکھا۔ اور بناوٹی وولڈے مار کے گیٹ کو، جس میں سے نقلی دعویٰ دار گھوڑے پر سوار اندر داخل ہوا تھا۔ اور پچھلے قدموں نکال دیا گیا تھا۔ بالآخر دو تاریخی بت، جنہیں میں نہیں جانتا تھا۔ ایک ان میں سے ایک جنرل کا تھا، جس کے بارے میں مجھے کچھ سننے کا اتفاق نہ ہوا تھا، جو دو سال تک وہاں پر چھاؤنی میں پڑا رہا تھا، اور دوسرا ایک موسیقار کا تھا، جس نے دور دراز تک مشہور ہونے والے گیت "چاند ماند پڑ گیا ہے" کے راگ کی دھن لکھی تھی، جس کا آخری

بول تھا...." اور ہمارے وفادار کتے پر بھی"۔

"س" نے مجھے ناامید نہ کیا تھا۔ میں اس پرانے موہنے قصبے میں خوش تھا۔ مگر پھر میں ایکا ایکی تھک گیا، بھوک بھی لگنے لگی۔ اور میں ایک اپنی طرف دعوت دینے والے اور "س" کے کیریکٹر سے مطابقت رکھنے والے ریستوران کو تلاش کرنے لگا۔ میں دیر تک بلدیہ کے بیسمنٹ والے ریستوران اور سنٹرل ہوٹل کے درمیان فیصلہ نہ کر سکا۔ آخر میں میں نے نہ اسے چنا نہ اسے، بلکہ مہمان خانہ سنہری گدھے کو، جس کے فرنٹ پر بیڈر مائیر اسٹائل کی گلکاری مجھے سب سے زیادہ اوریجینل اور جس کا اندرونہ مجھے احتیاط سے پردے کی سلوٹوں میں سے اندر نظر ڈالنے پر حقیقی ترین لگا۔ اس کے علاوہ میں نے اس مکان، پٹریشن اسٹائل، کو پہچان لیا، جہاں پر گوسٹاف اڈولف کے ٹھہرنے کا چرچا تھا۔ مہمان خانے کا نام میری یادداشت سے اتر گیا تھا، مگر اس کا اتا پتا نہیں۔ اور میں نے اپنی یادداشت کو کوسا اور اس کی تعریف کی، جیسے وہ دو حصوں میں منقسم ہو۔

میرا انتخاب درست تھا۔ ماحول، سروس، پبلک، پھر کھانا اور مشروبات میرے مزاج اور میری خواہشات کے عین مطابق تھے۔ میں کونے کے آخری میز پر اکیلا بیٹھا ہوا تھا. جہاں سے میں اگر چاہتا تو ہر چیز کو دیکھ سکتا تھا، یا جہاں پر اگر میں چاہتا، تو اپنے آپ کو ہر دوسری چیز سے منقطع کر سکتا تھا۔ بعد میں ایک قدرے بوڑھا شخص میری میز پر آن بیٹھا (اس دوران میں ریستوران بھر چکا تھا) مجھے مینو دینے کو کہا، جو میرے سامنے دھرا ہوا تھا۔ ہم نے موسم کے بارے میں چند لفظوں کا ایک دوسرے سے تبادلہ کیا ("خودکشی کے لائق موسم" اس نے کہا) اس کے بعد ہم نے خاموشی اختیار کر لی۔ مجھے کلائسٹ یاد آیا جس نے "س" میں اپنے ڈرامے "ہائیل برون والی کیتھے" کے چند ایکٹوں کا خاکہ تیار کیا تھا۔ آوازوں کی سرسراہٹ میں، جو بیرے کو بلانے کی صداؤں، گلاسوں کے چھنکنے، پنکھے کی گڑگڑاہٹ سے جیسے بھری ہوئی تھی، متبائن اشیاء کی انفرادیت ختم ہو رہی تھی۔ اور جہاں تک میرا تعلق تھا، وہاں پر نہ تنہائی تھی اور نہ ہی محفل۔ اکیلے ہونے اور محفل کا حصہ ہونے کے میان میان یوں لگتا تھا، جیسے میری ہستی مفقود ہو چکی تھی۔ اب کہیں جا کے مجھے احساس

ہوا کہ میں نہ صرف "س" میں آن پہنچا تھا، بلکہ گویا وہاں کا باسی بن چکا تھا۔ بعض لمحات ایسے ہوتے ہیں، جن کا انحصار سراب پر ہوتا ہے، اس کے باوجود حقیقت کے قریب تر پہنچتے ہیں۔ اور جو ہمیں کسی بے نتیجہ رہنے والی دریافت کا گویا بدلہ دیتے ہیں۔

"آپ کو یہ شہر کیسا لگتا ہے؟" بوڑھے نے مجھ سے پوچھا۔ یہ سوال بغیر تاکید کے تھا، اس طرح کہ اس کا جواب نہ دیا جاتا یا دیا جا سکتا تھا۔ میں نے ایک اجنبی کی طرح جوابی سوال کرنے کو ترجیح دی۔

"س"؟ میں نے پوچھا۔ اور یوں پوز کیا، جیسے میں کسی سوچ میں گم تھا۔ جب کہ حقیقت یہ تھی کہ میں اس بات کا منتظر تھا کہ وہ شخص کسی غلطی کا ارتکاب کرے، مثلاً اس طرح کہ وہ لایعنی تعریفوں کا پل باندھنا شروع کر دے۔

اس نے ابرو کو اوپر چڑھاتے ہوئے اپنے بازو ہوا میں لہرا دیئے۔ "جو کوئی "س" جاتا ہے" اس نے پکار کر کہا" اس کی آؤ بھگت کا انداز دوسرا ہوتا ہے"۔

میں چونک اٹھا۔ اس فقرے میں مجھے کچھ تضاد سا نظر آیا۔ اور میں سوچنے لگا کہ آیا بوڑھے کے اندر سے اپنے شہر پر فخر بول رہا تھا، یا دوسرے شہروں پر غصہ، جو اسے پسند نہ آئے تھے۔ اس گفتگو کو جاری رکھنے کا کوئی صحیح سا انداز نہیں مل رہا تھا۔ شاید اس وجہ سے بھی نہیں، کیونکہ میں اس وقت تک "س" کے بارے میں کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا۔ میرا ارادہ تھا اگلی صبح چرچ کے اندرونی حصے اور محل کو دیکھنے کا اور شہر کے باغ کا چکر لگانے، اور لوگوں کا مطالعہ کرنے کا، اور اس امر کی تحقیق کا کہ اس قصبے کو کس حد تک نئے وقتوں کی ضروریات کو پورا کرنے میں کامیابی ہوئی تھی۔ تب جا کے میں گویا جمع و تفریق کر کے نتیجہ نکالنا چاہتا تھا۔ اگر اتنے مختصر سے قیام کے بعد کسی نتیجے پر پہنچنا ممکن تھا۔ البتہ بعض اوقات کسی چیز سے واقفیت پیدا کرنے اور اس عرصے کے درمیان، جو اس کام کے لئے میسر آتا ہے، ایک معکوس تعلق پایا جاتا ہے۔ یا تو اس لئے کہ انسان آناً فاناً سب کچھ سمجھ جاتا ہے یا اس وجہ سے کہ سمجھنے کو کچھ ہوتا ہی نہیں۔

"س" میں افراتفری کا راج ہے" بوڑھے نے اپنی بات میں اضافہ کرتے

ہوئے کہا۔

اب میں ہکا بھکا رہ گیا۔ بات میری توقعات (اپنے شہر پر فخر اور دوسرے شہروں پر غصے) کے عین الٹ نکلی تھی۔ میرا ہم میز اپنے ہی شہر پر اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا تھا، اس رومانوی "س" پر۔

"میری رہائش "س" میں کافی لمبے عرصے سے ہے۔ میں اسے صرف کبھی کبھار چھوڑتا ہوں۔ اور بد قسمتی سے میری معلومات اس کی تاریخ کے بارے میں بہت اچھی ہیں۔ انتہائی قابل نفرت۔ انسان "س" کو چاہے مقامی کے طور پر دیکھے، چاہے بطور باہر سے آکر بسنے والے کے، انسان کا ہر صورت میں اسی افراتفری سے واسطہ پڑتا ہے، ٹریفک کے اصول، جو دوسری جگہوں میں قابل عمل ہی، ان کی پابندی کے نتیجے میں حادثات میں اضافہ ہو جاتا ہے اور سڑکیں جام ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اور اس وجہ سے قانون کی خلاف ورزی انتہائی لازمی بن جاتی ہے۔ ہماری ہیلتھ سروس، جس کا امتیازی نشان سینٹری کے سامان کی فیکٹری ہے، بیماریاں پھیلاتی ہے، اس سے بڑھ کر جتنی وہ دور کرتی ہے۔ اس کا ثبوت اعداد و شمار ہیں، جو "س" میں مرنے والوں کی شرح اوسط سے کہیں بڑھ کر ہونا ثابت کرتے ہیں۔ اس دھویں کے سبب، جو فیکٹری کا پیدا کردہ ہے، جو اپنے دعویٰ کے مطابق ہمیں بچانے کے لئے ہے۔ علاوہ ازیں "س" میں زیادہ لوگ چیچک کے ٹیکہ کے سبب مرتے ہیں، بجائے اس چیچک کے، جسے ان کے کہنے کے بموجب ایک سیاح ہندوستان کے سفر سے لایا تھا۔ ہر شخص موٹر کار رکھتا ہے، اس وجہ سے انسان موٹر سواروں کے مقابلے میں پیدل جلدی اپنی منزل پر پہنچتا ہے۔ جسے کلچر کا نام دیتے ہیں، جیسے شہر کا تھیٹر، سنیما، موسیقی ہال، میوزیم میں رکھے جانے کے قابل ہیں، کیونکہ آزاد زندگی کا اس سے دم گھٹتا ہے۔ اور مقامی میوزیم میں وہ چیزیں سنبھال کر رکھی گئی ہیں، جنہوں نے ہماری ترقی کی راہیں مسدود کیں، جیسے دستاویزات، ترقی دشمن صدران بلدیہ کی مشروعات و ممنوعات۔ جنگوں، فاقوں اور طاعون کے وقتوں کی تعویزات۔ ساری کی ساری تاریخ ایک مجموعہ ظلم و قتل بازی کا۔ ہمارے فوجی دستے کا مقصد ہمیں جنگ سے بچانا ہے، مگر وہ اپنی نروس چستی کے باعث اس کا پیش خیمہ بنتا ہے۔ دولت بے شمار ہے، اس وجہ سے ہر

چیز قابل خرید ہے۔ میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ "س" میں کوئی خاوند موجود نہیں ہے، جس نے اپنی بیوی سے کم از کم ایک بار بے وفائی نہ کی ہو۔ اور کوئی عورت ایسی نہیں ہے، جو کنواری بیاہی گئی ہو۔ آپ کو یہ سب کچھ بے ضرر لگتا ہے۔ حرام کے بچے، خاص طور پر نابالغ بچیوں کے، اکثر بلکہ مدرسہ میں جانے والیوں کے، اب تو معمول کی بات بنتے جا رہے ہیں۔ طالب علموں کا اسٹوروں میں چوریاں کرنا اب کھیل قرار دیا جاتا ہے۔ امیروں کا خودکشی کرنا۔ غریبوں کا اپنے آپ کو بیچنا۔ اہل کاروں کے معدوں کے السر، کامیاب لوگوں کے ہارٹ اٹیک، دفتروں میں رشوت بازی۔ یہ نرا پاگل پن ہے، جو "س" میں گشت کر رہا ہے۔ میں آپ کو خبردار کرتا ہوں، "س" کا رخ نہ کریں"۔

میں مسکرا دیا۔ میں "س" میں ہی تو تھا۔ اس کی وارننگ دیر سے آئی تھی۔ اور "س" مجھے "پاگلوں" کے شہر کے برعکس لگتا تھا۔ یہ بے ضرر سا دکھائی دینے والا بوڑھا ایک عجوبہ نکلا۔ ویسا عجوبہ روزگار، جس سے کوئی قصبہ خالی نہیں ہونا چاہیئے۔ اور جو درحقیقت ان جگہوں کی رونق میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ ایک طرح کے روحانی اکیلے پن کا اظہار۔ زمانہ قدیم سے نوشتہ پاگل پن کی علامت، جس نے اس مثال میں یوں کہیے کہ جرمن روپ دھار لیا تھا، گویا اس کی شدید ترین صورت اختیار کر لی تھی۔ امید ہے کہ بے چارگی کی غضب ناکی سے بڑھ کر کچھ عمل میں نہ آئے گا۔ میری مسکراہٹ نے شکایت کرنے والے کو غصہ دلایا ہو گا، کیوں کہ اس نے میز پر مکہ مارا۔ مگر میں اس سے نہیں گھبرایا اور بوریت کا اظہار کرتا رہا۔ بوڑھا آپے میں آ گیا۔ اس کا مزاج بدل گیا۔ اس نے کندھوں کو اچکایا۔ وائن کا گلاس ختم کر ڈالا اور "مقامی مشروب" کا آرڈر دیا۔

مزاج کی اس تبدیلی کی وجہ نوجوان عورت بھی ہو سکتی تھی، جو ریستوران میں داخل ہوئی تھی اور ہمارے قریب ایک چھوٹے گول میز پر، جو عین اس لمحے میں خالی ہوا تھا، آن کر بیٹھی تھی۔ بوڑھے کی طرف اس نے سرسری طور پر مگر غصے سے بھری ہوئی نظر ڈالی تھی، پھر اپنا رخ بدل لیا تھا۔ چیزوں کا آپس میں جو بھی تعلق ہو۔ نوجوان عورت بہر صورت میرے مزاج میں تبدیلی کا باعث تھی۔ فوراً میرے اندر

دلچسپی پیدا ہوئی تھی ۔ میں بار بار کے آزمائے ہوئے حربے ، اپنی دلچسپی کا اس طرح دکھانا کہ اپنی بوریت کا تاثر دیا جائے ، کو آزمانے لگا ۔ یا اس کے الٹ ، میں اپنے بور ہونے کے تاثر کے ذریعے عورت کو اشتعال دلانے لگا ۔ اس عمل کے دوران میں اپنی نظروں کو بار بار بالمقابل کے چھوٹے گول میز کی طرف پھیرنے لگا ، بغیر ان کو وہاں پر ٹکانے کے ۔ جب مجھے کوئی کامیابی نہ ہوئی ، تو میں نے محتاط مسکراہٹ سے کام لینا شروع کیا ۔ واضح ہے کہ مجھے آگے نہیں بڑھنا تھا ۔ میں نوجوان عورت کو ایسے چھوٹے قصبوں میں فی الفور فلرٹ کے خلاف پائے جانے والے شکوک کا شکار نہیں بننے دینا چاہتا تھا ۔ علاوہ ازیں مجھے شبہ تھا کہ بوڑھے آدمی کے مزاج کی یکدم تبدیلی نوجوان عورت سے ایک پوشیدہ دلی رشتے کے باعث تھی ۔ اور میں اپنے چانس کو ، جس کا مجھے یقین تھا ، رقابت کے جذبات پیدا کر کے خراب نہیں کرنا چاہتا تھا ۔ اچانک مجھے بوڑھے آدمی اور نوجوان عورت کے درمیان پائے جانے والے رشتے کی فطری یا زیادہ درست غیر فطری ماہیت سمجھ میں آنے لگی ۔ میں نے دیکھا کہ کس طرح دوسرے مرد نوجوان عورت کو بے شرمی سے اور حریصانہ انداز سے تکتے اور درمیان میں بوڑھے کی طرف استفسارانہ نظریں ڈالتے تھے ۔ مماثلتوں اور حرص سے لدے ہوئے مخصوص الفاظ میرے ذہن میں آنے لگے ، جن کو میں پرے دھکیلنے لگا اور اس قابل اعتراض رشتے کو سمجھ لینے کے باوجود ۔ تین طرفہ تعلقات شاید ۔ میری دلچسپی نوجوان عورت میں قائم رہی ۔ ہاں میں نے محسوس کیا ، ایک طرف دھچکے سے ، دوسری طرف انوکھی سرشاری سے کہ میری دلچسپی اور بھی بڑھ گئی تھی ۔ کیا بوڑھے نے شہر کی بے اخلاقی کو اتنی وضاحت کے ساتھ تنقید کرنے کے لئے نہیں ، بلکہ میری دلچسپی کو بڑھانے اور جنسی معاملات کی طرف متوجہ کرنے کے لئے کیا تھا ؟ کچھ بھی ہو ، اگر میں کامیابی حاصل کرنا چاہتا تھا ، تو قربت کی کوششوں کو اس قدر احتیاط سے نہیں چلانا چاہیئے ، وگرنہ ہو سکتا ہے کہ میں اپنے چانس کو گنوا دوں ۔ ایک اکیلی گھر سے باہر نکلنے والی عورت کی واقفیت ایک ایسے شہوت سے مرتعش قصبے میں ہفتے کی رات کو پیدا کرنے کا ، بغیر اس بات کا لحاظ کرنے کے کہ وہ خریدی جانے والی تھی یا نہیں ۔

میرے میز کا بوڑھا میرے ارادوں کو سمجھتا نظر نہ آتا تھا یا وہ نہیں سمجھنا چاہتا

تھا، جیسے دکھاوے کی بے خبری اس دو دھاری کھیل کا حصہ تھی ۔ جب نوجوان عورت کھا چکی، اپنا شربت پی چکی اور تھوڑی دیر تک اپنے پرس میں ڈھونڈھ چکی، تو اس نے ہماری طرف دیکھا ۔ ہم دونوں کو دیر تک ایک مطمئن مگر گہرے تعلق دارانہ انداز سے تکتی رہی ۔ اور جیسے رد عمل کا انتظار کرتی رہی ۔ پھر اس نے ایک ہلکا سا اشارہ کیا، جو مکمل ناامیدی دکھاتا تھا، بل ادا کیا، ہلکا پلاسٹک کا اوور کوٹ پہنا اور ریستوران سے باہر نکل گئی ۔

" کیا آپ نے نوجوان عورت کو دیکھا ہے ؟ " فوراً بوڑھے آدمی نے زور دے کر پوچھا، جیسے اسے ایک خیال آگیا ہو، جس کے ذریعہ وہ " س " کی بد نظمی اور باولے پن کو سمجھا سکتا تھا ۔ اس نے میری آستین کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا ۔ جب کہ میں دیکھ رہا تھا کہ کم از کم تین نوجوان ریستوران سے باہر جانے کے لئے ہجوم کر رہے تھے ۔ ایک طرف مجھے یہ بات اور بھی زیادہ سڑک کی طرف بھاگنے پر اکساتی تھی، دوسری طرف مجھے یکدم اپنے منصوبے کی بے مصرفی محسوس ہونے لگی ۔ اور پھر ہنگامے سے بچنے کے لئے میں اپنی کرسی کی سامنے والی پٹی پر بیٹھا رہا اور باہر جانے والے دروازے کی طرف تکتا رہ گیا ۔

" وہ " ب " سے ہے " ۔ بوڑھے نے کہا اور میرے کان کے بالکل قریب جھک کر آگیا، جو مجھے پسند نہ تھا ۔ " وہ میرے پیچھے پھرتی ہے، ہاں، میرا تعاقب کرتی ہے اور تیسرے لوگوں، جیسے سنہری گدھے کے ہیڈ ویٹر، کے سامنے کہتی ہے کہ اگرچہ وہ مجھے صرف دیکھنے کی حد تک جانتی ہے، مگر اسے یقین ہے کہ میں اسے شوہر کے طور پر خوش کرنا جانتا ہوں ۔ اور مجھ سے سچ مچ دیکھے بھالے بغیر شادی کرنا چاہتی ہے ۔ کیا وہ میری دولت چاہتی ہے ؟ یہ نوجوان عورت غلط رستے پر چل رہی ہے ۔ اس کے اور میرے درمیان عمر کا بڑا فرق ہے ۔ اصل چیز کا تو ذکر ہی کیا ۔ اس کے باوجود میں اس کے کھرے ہونے کا انکار نہیں کر سکتا ۔ پیچھا کرنے میں ایسی مستقل مزاجی، تلاش کا ایسا جذبہ، ایک ایسی فاصلہ دار محبت، آپ نے اسے خود دیکھا ہے ۔ اس کا دراصل ایک نامعلوم شخص کے لئے محبت کا جذبہ ہمارے معاشرہ کے لئے ایک گہری معصوم دردمندی سے خالی نہیں ہے، اکیلے دکیلے مردوں سے قطع نظر ۔ عام سی آوارہ عورت

ہونے کی بجائے وہ ایک انوکھی عفت مندانہ زندگی بسر کرتی ہے، جو "س" میں پائی جاتی ہے نہ "ب" میں۔ بس اس نوجوان عورت میں باقی رہتی نظر آتی ہے"۔

میں نے اپنے آپ کو بوڑھے سے آزاد کر لیا، جو میرے لئے قابل نفرت بن چکا تھا، کجروی کو اچھائی کے طور پر پیش کر رہا تھا۔ اور مجھے شہر "ب" تجویز کر رہا تھا، جب کہ میں "س" میں تھا۔ تان بالآخر اس بات پر آن کر ٹوٹی کہ وہ خود مجھ پہ اعتراض کرنے لگا، بلکہ اس سے بڑھ کر میری شناخت پر شبہ کرنے لگا، اس طرح کہ اس نے کہا کہ وہ مجھے جانتا تھا۔ میں فلاں ہوں، جو یہاں پر پیدا ہوا تھا، ہجرت کر گیا تھا، غائب رہا، سٹہ بازی کے ذریعہ بہت بڑی دولت پیدا کی تھی اور اب اپنی جنم بھومی میں ایک غریب خانہ قائم کرنا چاہتا تھا۔

"ایک غریب خانہ" بوڑھا دھاڑا۔ "پیسہ، جو آپ نے لوگوں سے چوری کیا ہے، وہ آپ انہیں فراخ دلی سے واپس کرنا چاہتے ہیں۔ صدقہ کے طور پر۔ کیا آپ کو شرم نہیں آتی"۔

میں نے ویٹر کو ایک نوٹ پکڑایا، جو میرے کھائے پیئے کی قیمت سے بڑھ کر تھا۔ تیزی سے اور سرد مہری کے ساتھ رخصت لی اور باہر کی طرف بھاگ گیا۔ تازہ ہوا مجھے اچھی لگی۔ قدرتی طور پر ریستوران کے سامنے سڑک خالی تھی۔ نوجوان عورت کبھی کی گم ہو چکی تھی۔ نوجوان لڑکے بھی، جو اس کے پیچھے نکلے تھے، کہیں پر دکھائی نہ دیتے تھے۔ میں ذیلی سڑکوں سے، جو خالی تھیں، تیزی کے ساتھ گزرا۔ "س" میں لوگ جلدی گھر چلے جاتے ہیں۔ شہر پر سکون پھیلا ہوا تھا، جو کسی دور کی تھرتھری سے، شاید ریل گاڑی کی، اور بھی شدید ہو گیا تھا۔

ایسا سکون میرے لئے کبھی کا اجنبی بن چکا تھا۔ وہ مجھے بے چین کر رہا تھا۔ مگر مجھے امید تھی کہ میں خلل کے بغیر سو سکوں گا۔ ابتدائی دنوں میں گرما کی بعض راتوں میں میں ایسا نہ کر سکا تھا۔ سونے کا آہنگ لمبے عرصے سے بڑے شہروں کی آوازوں کا عادی ہو چکا تھا۔ اور اب اسے سکون پریشان کر رہا تھا۔

جب میں ہوٹل میں داخل ہوا، تو مجھے سارا سفر بمعہ اپنے مقصد کے غیر ضروری لگا۔ اور کیا میں نے اہم ترین چیزیں دیکھ نہ لی تھیں؟ دوسرا دن بھلا کون سے

اہم تاثرات پیدا کرے گا؟ میں اپنے کمرے میں گیا، جو ٹھنڈا تھا، ٹھٹھرے ہوئے لحاف کو چھوا، دروازے پر لگی ہوئی کرائے کی قیمت کی فہرست کو پڑھا، شب بسری کی قیمت بمعہ ناشتے اور شرح فیصد کی مطلوبہ رقم کو ایک لفافے میں ڈالا، جسے میں نے بستر کے ساتھ والے میز سے نکالا تھا، لفافے کو بند کیا اور اس پر ہوٹل کا نام لکھا۔ پھر میں نے شب خوابی کے لباس کو، جو پیچھے کی طرف پلٹے ہوئے لحاف کے کونے کے اوپر سرہانے پر پڑا تھا، اپنی اٹیچی کیس میں ٹھونسا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ گیلری میں میرا سامنا ہوٹل کی ملازمہ سے ہوا، جس نے اپنے بالوں کو کھول کر لٹکا رکھا تھا اور چوغہ غسل میں تھی۔ اسے بتایا کہ مجھے قبل از وقت "س" سے واپس جانا پڑ گیا تھا، جس سے وہ حیرت میں پڑ گئی (مجھے اس کا پچھلے پہر شہروں کے ناموں کا گڈمڈ کرنا یاد آیا) اسے بتایا کہ میں نے کرائے کی رقم کمرے میں ایک لفافے میں چھوڑی تھی۔ اسے ایک بڑا سا سکہ دیا۔ اس کے بازو کے ننگے نچلے حصے کو چھوا (چوغہ غسل کی آستین اوپر کی طرف اڑسی ہوئی تھی) زینے سے اترا۔ چوکیدار کا کھوکھا خالی تھا۔ اور ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ مجھے رات کی گاڑی سے واپس گھر پہنچنے کی امید تھی۔ اور ایمرجنسی کی صورت میں ٹیکسی میں کسی "س" سے بڑے شہر تک جانے کے لئے تیار تھا، جہاں سے رات کو زیادہ گاڑیاں چلتی ہوں، تاکہ وہاں سے اپنے شہر "م" کی گاڑی لے سکوں، تب عجلت نے مجھ پر قبضہ کر لیا، بے یار و مددگار ہونے کا احساس، اکلاپا، ہاں ڈر، غیر ماموںیت کا احساس زیاں۔ میں نے اس احساس پر غور کیا۔ اس کے غلط ہونے کو پہچان لیا، مگر اس سے جان نہ بچا سکتا تھا۔ شاید میں بیمار تھا اور اس بات کو نہیں جانتا تھا۔

اسٹیشن کی عمارت کے باہر ایک لیمپ ہوا میں لہرا رہا تھا۔ ہوا نے دھند اور بادلوں کو دھکیل دیا تھا۔ آسمان کھل گیا تھا۔ حد نظر صاف تھی، میں ریلوے اسٹیشن کے بورڈ کو واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ اس پر "ب" لکھا ہوا تھا، نہ کہ "س"، جہاں میں جانا چاہتا تھا۔ میں پچھلے پہر "س" کی بجائے ایک اسٹیشن "س" سے پہلے "ب" میں اتر گیا تھا۔ بغیر اس چیز کو جاننے کے۔ سارے شہروں کے اسٹیشن ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اور میں "ب" میں بے حد خوش تھا۔ جب کہ میں اپنے آپ کو "س

میں سمجھتا تھا۔ میں غلط شہر میں تھا اور اس کو صحیح شہر جانا تھا، بغیر تضاد کو سمجھنے کے۔ میں نے چیزوں کو پہچان لیا تھا، جو دراصل وہ نہ تھیں۔ چرچ، بلدیہ اور ریستوران، ایک "مقامی" بوڑھے آدمی سے ملا تھا، جو میری طرح اجنبی تھا۔ ایک غیر عورت سے نہ مل سکا تھا۔ ایک نوجوان عورت۔ جو یہاں کی ہے۔ اور اب میرے لئے صرف اس شہر سے رخصت ہونا باقی تھا، جہاں پر میں گیا ہی نہیں تھا اور جس کی طرف میں کبھی نہیں لوٹوں گا۔ بوڑھے آدمی نے مجھے مزید برآں ایک ایسے آدمی کے طور پر شناخت کیا تھا، جو میں نہیں تھا۔ اور اب میں اپنے بارے میں شکوک کا شکار ہونے لگا تھا۔ اپنی صحت مندانہ انسانی سمجھ کے بارے میں نہیں۔ مگر اپنی قوت فیصلہ کے بارے میں، اپنی اصلیت کے بارے میں۔ جو کوئی اس قدر جلدی دھوکہ کھانے کے لئے تیار ہے، وہ خود بدلا جا سکتا ہے۔ گویا ان گھڑ اور انتہائی نامکمل۔

رات کی گاڑی آ گئی۔ اور میں نے گاڑی میں سوچا کہ کونسی چیز دشوار ہو گی، اپنے دوستوں کو، جنہوں نے "س" کی سفارش کی تھی، اپنی غلطی کے بارے میں بتانا اور غلط فیصلے کا اقرار کرنا یا جھوٹ بولنا اس طرح کہ وہ اسے نہ جان سکیں۔ یا ایک دوسرا سفر، شاید اگلے ویک اینڈ پہ اختیار کرنا اور سچ مچ "س" کو دیکھنا؟ ایک اور امکان بھی پایا جاتا تھا۔ یعنی جو ہو چکا اس پر لکیر پھیر دی جائے اور سب سے پہلے موقعہ پر اس گاؤں میں جایا جائے، جس کا اس کے جاننے والوں نے بے حد دلفریب ہونا بیان کیا تھا۔ علاوہ ازیں وہ گاؤں "س" سے زیادہ قریب تھا۔ ہاں کتنے ہی نظر انداز شدہ ابھی تلافیٔ مافات کے لئے باقی نہ تھے، پیشتر اس کے کہ وقت نکل جائے۔

وولف ڈیٹریش شنرے

Wolfdietrich Schnurre

بھیدی

زمیں دلدلی تھی اور جب وہ اس پر قدم دھرتا تھا، تو وہ لچکتی تھی۔ کائی، سرکنڈے اور سینٹھا اس پر لگتے تھے۔ بید کی جھاڑیاں آدمی کے قد سے زیادہ اونچی تھیں۔

وہ کشتی کو نکالنے کی کوشش کرنی چاہتا تھا اور چپکے سے مچھیاں پکڑنے کی چند ٹوکریوں کو اوپر کھینچنا چاہتا تھا۔ بس یونہی، ایک نظر ڈالنے کے لئے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ کیونکہ مچھلیوں کو گھر لے جانا ممکن نہیں تھا۔ اس طرح بات کھل جاتی کہ وہ اسکول سے کھسکا ہوا تھا۔

دراصل اسے اب واپس چلنا چاہیئے تھا۔ شہر کی واپسی کا راستہ لمبا تھا اور یقیناً ایک سے اوپر ہو چکا تھا۔ مگر وہاں پر تیتروں کا آشیانہ تھا، جس کے سامنے وہ انتظار میں بیٹھا رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اڈاری مار کر آئے تھے۔ لمبی دم والے۔ ہیروں جیسی گردن کے پروں کی پٹی اور پیچھے ہیچ پوچ خاکستری فضول کاری، دانے چنتے ہوئے مادہ پرندے۔ اور پھر گھونگوں کے خالی گھروندے تھے، جنہیں آدمی کو سنبھال کر رکھنا چاہیئے۔ اور پچھلے سال والے ترنمی پرندوں کے گھونسلے سرکنڈوں میں یا کوؤں کے چمکتے ہوئے قبے لال سرخ ربڑ کی چھلوں سے بھرے ہوئے، جنہیں یہ لالچی پرندے گوشت سمجھ کر نگل جاتے ہیں۔

اور اب آخر میں گویا اختتامی دلفریبی کے طور پر کشتی باقی رہ گئی تھی۔ یہاں سرکنڈوں کے کونے سے گھوم کر، جہاں پر بید کے ٹنڈوں والا رستہ جنگل کے اندر گھس جاتا تھا۔ وہاں پر وہ ایک ٹھنٹھ کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ یقیناً تالہ نہیں کھولا جا سکتا، مگر لوہے کی سلاخ، جو زنجیر کو کشتی سے باندھے ہوئے تھی، وہ ہلتی تھی۔

شاید اس کو توڑا جا سکتا تھا۔

گھونگوں کے گھروندے بھاگتے وقت اس کی جیب میں کھڑکھڑاتے تھے۔ وہ کھلے منہ سے سانس لے رہا تھا۔

جب وہ سرکنڈوں والے کونے سے گھوما، تو اس نے آدمی کو دیکھا، جو سینٹھا کے بنڈلوں کے درمیان گھٹنوں کے بل جھکا ہوا تھا۔ اور ایک گٹھڑی سے کچھ کر رہا تھا۔

ویلی جھک گیا اور ہاتھوں کے بل کائی میں ٹیک لگا لی۔ اس نے دیکھا کہ گٹھڑی ایک انسان تھی، ایک عورت، جو ٹانگیں ہلا رہی تھی۔ مگر اس نے انہیں زیادہ دیر تک نہ ہلایا۔ بس تھوڑی دیر تک، پھر وہ ساکت پڑی تھی۔

آدمی اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے گھٹنوں کو جھاڑا۔ پھر اس نے پاؤں سے عورت کو ٹھوکر ماری، مگر اس نے کوئی حرکت نہ کی۔

ویلی کے ہاتھ کائی میں کھبے ہوئے تھے۔ اور انگلیوں کے درمیان سے ہرے رنگ کا پانی رسنے لگا تھا۔ مگر وہ بدستور عورت کی طرف گھور رہا تھا، بلکہ اس وقت بھی، جب کہ آدمی نے اسے دیکھ لیا تھا اور اب آہستہ آہستہ اس کے قریب آ رہا تھا۔

"ناں... ؟" اس نے پوچھا۔

ویلی نے اوپر کی طرف دیکھا: "کیا وہ مر چکی ہے ؟"

"ہاں" آدمی نے کہا۔

"تم نے اسے کیوں مار ڈالا ہے ؟"

آدمی جھکا اور اس نے آنکھیں مچکاتے ہوئے ارد گرد کے بید کی جھاڑیوں پر نظر ڈالی۔

"کیا تم اکیلے ہو ؟"

"ہاں" ویلی نے کہا۔

آدمی قریب آگیا۔

ویلی نے اس سے نظر ہٹا کر عورت کی طرف دیکھا: "کیا وہ تمہیں پسند نہیں تھی ؟"

"نہیں" آدمی نے کہا۔

"اور اب؟"

"تم یہاں پر کیا کر رہے ہو؟" آدمی نے پوچھا۔

"کیا؟" ویلی نے پوچھا۔

"تم یہاں پر کیا کر رہے ہو؟"

عورت سنہری بالوں والی تھی۔ اس نے ہلکے رنگ کا اوور کوٹ پہن رکھا تھا، اور چپٹی ایڑیوں والے جوتے، جن پر کیچڑ اور سوکھے شاہ بلوط کے پتے چمٹے ہوئے تھے۔

"میں کشتی کی طرف جانا چاہتا تھا" ویلی نے کہا۔

"کس کشتی کی طرف؟" آدمی نے ہاتھوں کو جیبوں میں ڈال لیا۔

"اس کی طرف"۔

"وہ بندھی ہوئی ہے" آدمی نے کہا۔

"مگر لوہے کی سلاخ ہلتی ہے"۔

"سچ مچ"۔

"ہاں، اگر آدمی ایک پتھر اس پر مارے، تو باہر نکل جائے گی"۔

"کشتی کس کی ہے؟"

"مچھیرے کی"۔

"کیا وہ اکثر یہاں پر آتا ہے؟ آج مثلاً...؟"

"آج یقیناً نہیں"۔

آدمی نے رخ موڑا اور عورت کی طرف واپس گیا۔

"ادھر آؤ"۔

ویلی ادھر گیا۔

"تم ٹانگوں سے پکڑو"۔ آدمی نے کہا۔ اس نے عورت کو بازوؤں کے نیچے سے پکڑا۔ "آؤ، پکڑو بھی"۔

ویلی نے پکڑا اور وہ لاش کو کشتی کی طرف لے کر گئے۔

"اس کا پرس بھی"۔ آدمی نے کہا۔

ویلی واپس گیا اور پرس کو اٹھا لیا۔

آدمی نے لوہے کی سلاخ کو ہلا جلا کر باہر نکال لیا۔ پھر اس نے عورت کو کشتی میں گھسیڑا۔ اس کی ٹانگیں پانی میں لٹک رہی تھیں۔ "چپو کہاں پر ہے؟"

"میں لاتا ہوں" ویلی نے کہا۔

"چپو کہاں پر ہے؟"

"چھپایا ہوا ہے، وہاں سوکھے ہوئے شاہ بلوط کے اندر"۔

آدمی ہانپ رہا تھا، جب وہ بھاگتا ہوا واپس لوٹا۔ چپو اس کے کندھے پر ادھر ادھر ڈول رہا تھا۔ "کیا تم نے سنا ہے؟"

"کیا؟" ویلی نے پوچھا۔

انہوں نے سننے کو کان لگائے۔

"وہ..." آدمی نے کہا۔ اس کی اشارے والی انگلی کانپ رہی تھی۔

"اخ، وہ.... ایک شکرا"۔

"ایک کیا؟"

"ایک شکرا" ویلی نے کہا۔ "وہ یونہی شور مچاتا ہے"۔

"تم یہاں سے خوب واقف ہو؟"

"تھوڑا بہت"۔

وہ سرکنڈوں کی سرحد کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ آدمی چپو چلا رہا تھا اور ویلی مچھلیوں کے ڈبے کے ڈھکنے سے کشتی کو کھیتا رہا۔ جہاں پر شارٹ کٹ رستہ جھیل میں منڈھتا تھا، وہاں پر انہوں نے لاش کو پانی میں ڈال دیا۔ اس کا اسکرٹ ابھر آیا۔ آدمی نے اس کے نیچے سے ہوا کو چپو کے ساتھ نکال دیا۔ "خوب" اس نے کہا۔

"یہ لو" ویلی نے کہا "پرس بھی"۔

"پکڑاؤ"۔

ویلی اٹھ کھڑا ہوا اور اسے پکڑا دیا۔ آدمی بھی اٹھا۔ لمحہ بھر اس نے اپنے ارد گرد دیکھا۔ پھر اس نے تیزی سے ایک قدم ویلی کی سمت میں اٹھایا۔ کشتی ڈانواں ڈول ہوئی۔ ویلی کسی قدر ڈگمگایا۔ آدمی نے اسے پکڑا اور مضبوطی سے پکڑے رکھا۔

"اب خیر ہے" ویلی نے کہا۔

آدمی نے اسے چھوڑ دیا اور پرس کو سرکنڈوں میں پھینک دیا۔

"چلو"۔

جب وہ واپس جا رہے تھے، تو وہ مچھلیاں پکڑنے والی ٹوکری کے پاس سے گذرے۔

ویلی کشتی کی اگواڑ کے پاس گھٹنوں کے بل جھکا ہوا تھا۔ "وہاں پر مچھلیاں پکڑنے والی ٹوکری رکھی ہے"۔

آدمی نے وسل بجانی روک دی "کہاں پر؟"

"ادھر"۔

"اس میں دیکھیں؟"

"میں چاہتا تو ہوں"۔

"چلو"۔

وہ کشتی کو اس طرف لے کر گیا۔

"بائیں طرف" ویلی نے کہا "کچھ اور۔ بس، اور اب دائیں طرف دھکیلو، رک جاؤ" وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کشتی کے کنارے سے نیچے جھک گیا۔

"ناں؟" آدمی نے اپنی گردن کو لمبا کیا۔

"سنگھاڑا مچھلیاں" ویلی نے کہا۔ اس نے ٹوکری کو پھر پانی میں ڈال دیا۔ اور کشتی کو ایک درخت کے ٹنڈ پر ٹیک لگا کر دھکا دیا۔

"سنگھاڑا مچھلیاں فضول ہوتی ہیں"۔

آدمی چپو چلاتا رہا۔ وہ پھر وسل بجانے لگا۔

"مجھے پتہ ہے کہاں پر دوسری ٹوکریاں ہیں"۔

"کیا؟"

"مجھے پتہ ہے کہاں پر دوسری ٹوکریاں ہیں"۔

"ناں؟"

"وہاں پر" ویلی نے پرلی طرف اشارہ کیا۔

"خوب" آدمی نے کہا۔

"حال ہی میں ایک میں مرغابی پھنسی ہوئی تھی"۔

"ناں، نوں"۔

"عجیب بات ہے، نہیں؟ کیونکہ وہ غوطہ مارتی ہیں۔ ایک بار ایک میں آبی چوہا بھی پھنسا ہوا تھا"۔

"وہ کیسے؟" آدمی نے پوچھا۔

"رک جاؤ" ویلی نے کہا۔ اس نے آنکھیں جھپکیں اور کشتی کے کنارے کے اوپر سے نیچے جھک گیا۔

"ناں...؟"

"خالی، جب کہ اس میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ ہوا کرتا ہے"۔

"شاید ٹوٹی ہوئی ہے"۔

"نہیں، وہ غلط پڑی ہے۔ وہ ایک طرف کو جھک رہی ہے"۔

"کیا وہ اس چیز کو جان جاتی ہیں؟"

"وہ...؟ ناں، تم بھی خوب ہو۔ کیوں نہیں"۔

آدمی چپو چلاتا رہا" تم یہاں پر رہتے ہو"۔

"نہیں، شہر میں۔ دائیں ہاتھ، اور زیادہ، بس ٹھیک ہے۔ یہ تو ہلتی ہے۔ خبردار، شرط لگالو۔ اس میں کچھ ہے"۔

آدمی اپنی جگہ سے کسی قدر اوپر کو اٹھا۔ وہ ویلی کو تکتا رہا۔

"بارش مچھلیاں۔ اب اسے دیکھو، بارش مچھلیوں سے بھری ہوئی ہے"۔

"اچھی لگتی ہیں"۔

"نہیں؟" ویلی نے ٹوکری کو پھر پانی میں اتار دیا۔

"کیا تم ان میں سے کوئی نہیں نکالو گے؟"

"میں بے وقوف تھوڑا ہی ہوں کہ انہیں گھر میں شبہ ہو جائے"۔

آدمی چپو چلاتا رہا" کاہے کا شبہ؟"

"تم بھی کچھ نہیں کہو گے؟"

"ناں، جانے بھی دو"۔

"بھلے مانس، میں کھسکا ہوا جو ہوں"۔

"آں ہاں، یہ بات درست ہے۔ مچھلیاں تمہارا راز فاش کر دیں گی"۔

وہ ساحل کی طرف گئے اور وہاں پر جا کر رکے۔ سرکنڈوں میں ایک پرندہ بے تحاشا چیخ رہا تھا۔

"آؤ چلیں" آدمی نے کہا۔

"پہلے سلاخ، ایک منٹ" ویلی نے اسے کشتی کے تختے میں ٹھونک دیا۔ پھر وہ چپو کو واپس دھر آیا۔

"چلو"۔

"میں آتا ہوں"۔

وہ چند جنگلی رستوں سے گذرتے ہوئے بڑی سڑک پر آئے۔ جب وہ باہر نکلنے والے تھے، تو دو سائیکل سوار ادھر سے گذرے۔

"میں تم سے پوچھنا چاہتا تھا" آدمی نے اونچے سے کہا "کیا تمہیں امریکی چوہے پسند ہیں؟"

"سنو" ویلی نے کہا "تین تو خود میرے پاس ہیں"۔

وہ بڑی سڑک پر کچھ دیر تک چلتے رہے۔ کنارے کے برچ کے درختوں کے پتوں میں سے سورج چمکتا رہا۔ ایک السٹر پرندہ ان کے آگے آگے ناچتا رہا۔ ایک بار ایک پیادہ شخص کہیں سے آن نکلا۔

آدمی رک گیا اور اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ "اوئی، اوئی"۔

"دیر...؟"

چار بجنے والے ہیں"۔

"بھلے مانس! میرا دماغ چلنے والا ہے"۔ ویلی نے آدمی کی طرف ہاتھ بڑھایا "کیا تم میرے ساتھ تھوڑی دور تک دوڑنا چاہو گے؟"

"جانے دو"۔

"تم پھر اپنا خیال رکھنا"۔

"تم بھی"۔

موڑ سے پہلے ویلی نے پھر ایک بار مڑ کر دیکھا۔

آدمی ابھی تک بڑی سڑک پر کھڑا تھا۔ "کیا بات ہے؟" اس نے پکار کر کہا۔

"کیا تم سچ مچ میرا راز نہیں کھولو گے؟"

"کیا مطلب؟"

"ناں، میں کھسکا ہوا جو تھا"۔

"یقیناً نہیں"۔

"پھر ٹھیک ہے۔ خدا حافظ"۔

آدمی نے اپنا بازو لہرا دیا۔

ایریش فریڈ

Erich Fried

المیہ

"کھیل تمام ہوا" ۔ آخری سین میں بالآخر فتح پانے والے ایکٹروں نے اپنے مدمقابل حکومت کرنے والے خبیثوں کو للکارا اور ان کے فرار ہونے یا اسلحہ خانہ کے رستے روک کر انہیں گرفتار کر لیا ۔ اور ان پر کرم کی ایک نظر بھی ڈالے بغیر انہیں کھینچ کر سٹیج کے پیچھے لے گئے ۔ ایسے میں پردہ گر گیا ۔

مگر جب وہ دوبارہ تحسین کے لئے اٹھا، تو شکست خوردہ حاکم اپنے فاتحوں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے واپس لوٹے اور سب نے اپنے سر ناظرین کے سامنے خم کر دیئے ۔ اور ناظرین نے ستائش کے کلمات پکارے اور دنیا و مافیھا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تالیاں بجا کر ان کی حوصلہ افزائی کی ۔

ہا(نس) کا(رل) آرٹمن

H. C. Artmann

سلائی کی مشین

پہلے وقتوں میں امریکہ میں کپڑا سینے کی مشینیں نہیں ہوا کرتی تھیں ۔ ابھی موجد اور کارخانہ دار سنگر پیدا نہیں ہوا تھا ۔ اس لئے کپڑوں کو ہاتھ سے سینا پڑتا تھا ۔ اور بہتیرے لوگ سینا جانتے تھے ، عام طور سے عورتیں ۔ مرد شکار کرنے جاتے تھے ۔ وہ کھالیں اور چمڑے مار کر لاتے تھے ۔ عورتیں ان کو کاٹتی تھیں ۔ ان کو بارہ سنگھے کی نسوں سے یا لوٹ کے دھاگے سے سیتی تھیں ۔ اپنے مردوں کے لئے پتلونیں ، اپنے لئے لہنگے ۔ بچے ان وقتوں میں ننگے پھرتے تھے ۔ اس طرح انہیں قدرت کی سختیوں کی عادت ڈالی جاتی تھی ۔ سال کے ٹھنڈے موسم میں وہ گھروں کے اندر چولہوں کے سامنے رہتے تھے ۔ وہیں کھاتے تھے ، پیتے تھے اور سپنے دیکھتے تھے ، یا بڑوں کی کہانیاں سنتے تھے ۔ آبنائے بے رینگ کے پل کے قصے ۔ ایک لمبی سیڑھی کی داستان ، جو قطب ستارے تک پہنچتی تھی ۔ یا ریتیلے رنگ والی گاڑی کے ڈبے میں ریتیلے رنگ والے آدمی کی عجیب و غریب داستان ۔ اس ریتیلے رنگ والے آدمی کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس کے پاس ایک ریتیلے رنگ والا سفری بیگ اور ایک ریتیلے رنگ والا ریوالور تھا ، جس سے وہ گاڑی کے سفر کے دوران دوسرے ریتیلے رنگ والے مردوں پر گولیاں چلاتا تھا ۔ مگر کبھی کسی کو نشانہ نہ بنا سکا ، کیونکہ ریتیلے رنگ والے ریتیلے دشت میں کم ہی دکھائی دیتے تھے ۔

اس سیڑھی کی داستان ، جو قطب ستارے تک پہنچتی تھی ، اس زمانے میں بھی اتنی پرانی تھی کہ وہ ایک سکڑی ہوئی ممی لگتی تھی یا سردار نومن کواچ کے دنوں کی دستاویز ۔ وہ کہانی یوں تھی : ایک دفعہ ایک آدمی نے دشت کے عین بیچ ایک تنور کو پایا ۔ وہ اس پر حیران ہوا ، کیونکہ دور دور تک کہیں انسان نہیں بستے تھے ۔ مگر وہ تنور

جل رہا تھا۔ سرخ شعلے اٹھ رہے تھے اور جہاں پر ان کا سرا تھا، وہاں پر انتہائی شمالی علاقے کا ایک بھونڈا سا ہیولہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس ہیولے نے آدمی کو پکار کر کہا: "خوش ہو جاؤ مسافر، تمہاری قسمت بن گئی۔ میں فلاٹ پٹ بھوت ہوں اور انسانوں کا دوست ہوں"۔

آدمی نے جواباً پوچھا: "یہ کیسے ممکن ہے کہ تم آگ کے شعلے کے سرے پر بیٹھے ہوئے ہو اور جلتے نہیں ہو؟"

"میں نے غیر اشتعال پذیر پاجامہ پہن رکھا ہے"۔ اس نے جواب دیا: "تم تین خواہشات نہ کرو، بلکہ ایک"۔

"تم کون ہو؟"

"میں فلاٹ پٹ ہوں"، شمال کے بھونڈے ہیولے نے کہا: "اور سیڑھی ساز جس کے لئے اس کے جادو کے زور پر ہر چیز ممکن ہے"۔

اب آدمی نے کہا: "اگر یہ بات سچ ہے، تو پھر میرے لئے ایک سیڑھی بناؤ، جو قطب ستارے تک پہنچتی ہو۔ میں نے وہاں پر ایک بدلہ لینا ہے"۔

"کیسا بدلہ؟" فلاٹ پٹ ہیولے نے پوچھا۔

آدمی نے جواب دیا: "میں ایک ریتیلے رنگ والے پستول باز کی تلاش میں ہوں، جس نے میرے ریتیلے رنگ والے پیلے خالہ زاد بھائی کو زخمی کر دیا ہے۔ وہ قطب ستارے پہ ایک مکان کا مالک ہے"۔

"میں اس ریتیلے رنگ والے پستول باز کو جانتا ہوں" سیڑھی ساز نے کہا: "صرف اتنی بات ہے کہ وہ اس وقت کسی دوسری جگہ پر ہے"۔

"یہ عین ممکن ہے" آدمی نے جواب دیا "مگر وہ واپس لوٹے گا اور میں اس کو بے خبری میں آن لیتا ہوں۔ تم سمجھتے ہو۔ میں اس کے کمرے میں پہلے سے بیٹھا ہوں، وہ بے خبری میں دروازہ کھولتا ہے اور پھر....."

فلاٹ پٹ نے کہا: "خوب، چونکہ یہ تمہاری خواہش ہے، اس لئے میں تمہارے لئے ایک سیڑھی بناؤں گا، جو قطب ستارے تک پہنچتی ہو۔ مگر تمہارا ریتیلے رنگ والا پستول باز اس وقت آبنائے بے رینگ میں ہے اور اس کے گھر لوٹنے تک

اچھا خاصا وقت لگ جائے گا۔ کیونکہ وہ رتیلے پیلے پل کو بنانے میں مشغول ہے، جب اس براعظم کو ملک قیقوپے سے ملانا ہو گا۔ وہ اگرچہ اتنا لمبا نہیں ہو گا، جتنی میری سیڑھی، تاہم اس کو عمدہ قسم کی دستکاری کا نام دینا پڑے گا۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کے پاس سلائی کی مشین نہیں ہے۔ پل کو آخر کھالوں اور چمڑے سے بنایا جانا ہے"۔

"اگر اس کے پاس اس کام کے لئے وقت ہے" آدمی نے کہا "تو میرے اندر صبر کا مادہ پایا جاتا ہے۔ آخر لوگ مجھے جھولا کرسی والا منتقم کہہ کر پکارتے ہیں"۔

ہیولہ فلاٹ پٹ اپنے شعلے والے ستون سے نیچے سرکا۔ اس کے پائیں کھڑا ہوا اور ایک مختصر سا گیت گایا۔ اس پر دھواں لکڑی میں بدل گیا، ایک مضبوط سیڑھی بن گیا اور اونچا ہی اونچا اگتا چلا گیا اور بالآخر بادلوں میں گم ہو گیا۔

"ریکارڈ کام" آدمی نے کہا اور فلاٹ پٹ کی طرف تحسین کی نگاہ ڈالی۔

"جانے بھی دو" اس نے کہا "یہ کچھ ایک اچھے بھلے بھوت کے لئے انگلیوں کی مشق سے زیادہ نہیں ہے"۔ پھر اس نے بادل کا قالب بدلا اور شمال مغرب کی طرف پرواز کر گیا۔ آدمی کچھ دیر تک اس کو دیکھتا رہا، پھر اس نے سیڑھی کا جائزہ لیا۔ اس کو اس سے کچھ ڈر سا لگنے لگا۔ اس کی بیوی تھی اور بچے، گھر بار اور جانور، قمیصیں اور سیب کے درخت، باپ اور ماں، وہ کچھ ایسا عمر رسیدہ نہیں تھا اور ابھی زندہ رہنا چاہتا تھا....

وہ نہ تو اس سیڑھی پر قطب ستارے کی طرف چڑھا، نہ ہی وہ آبنائے بے رینگ کی طرف گیا۔ وہ چپ چاپ لوٹ گیا اپنوں کی طرف اور اپنے گھر کی جانب۔ اس نے سلائی کی مشین کا زمانہ دیکھا، جس نے دستکاری کو ہمیشہ کے لئے ناکارہ بنا دیا۔

ولفگانگ بورشرٹ

Wofgang Borchert

چوہے راتوں کو سوتے ہیں

اکیلی دیوار کی نکلی ہوئی کھڑکی میں سے ابتداء شام کے سورج کی نیلی اور سرخ شعاعیں جھپکیاں لے رہی تھیں۔ غبار کے بادل چمنیوں کے باقی ماندہ ایستادہ ٹکڑوں کے درمیان جھلملا رہے تھے۔ کھنڈرات کا خرابا اونگھ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں موند رکھی تھیں۔ ایکا ایکی تیرگی گہری ہو گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ کوئی شخص آیا تھا اور اب اس کے سامنے روشنی روکے ہوئے اور چپ سادھے کھڑا تھا۔ اب انہوں نے مجھے ڈھونڈھ لیا ہے، اس نے سوچا۔ مگر جب اس نے آنکھ جھپکتے ہوئے دیکھا، تو اسے قدرے غریبانہ پتلون والی صرف دو ٹانگیں دکھائی دیں۔ جو اس کے بالمقابل کچھ ٹیڑھی میڑھی ایستادہ تھیں، اس طرح کہ وہ ان کے بیچ میں سے دوسری طرف دیکھ سکتا تھا۔ اس نے ایک نظر آنکھ مچکاتے ہوئے پتلون والی ٹانگوں سے اوپر کی طرف اٹھانے کی جرأت کی اور ایک ادھیڑ عمر کے آدمی کو دیکھا، جس نے ہاتھ میں ایک چاقو اور ایک ٹوکری اٹھا رکھی تھی۔ اور کسی قدر خاک اس کی انگلیوں کی پوروں پر لگی ہوئی تھی۔

تم یہاں پر سوتے ہو؟ آدمی نے اوپر سے پوچھا اور بالوں کے اس گچھے پر نیچے کی طرف نظر ڈالی۔ یورگن نے مرد کی ٹانگوں کے درمیان سے سورج کی طرف جھپکتے ہوئے دیکھا اور کہا: نہیں، میں سوتا نہیں ہوں۔ مجھے یہاں پر پہرہ دینا ہوتا ہے۔ آدمی نے سر کو ہلایا: اچھا، اس لئے تم نے یہ بڑا سوٹنا رکھا ہوا ہے؟

ہاں۔ یورگن نے جرأت سے جواب دیا اور سوٹنے کو مضبوطی سے تھامے رکھا۔

تم پہرہ کاہے کا دیتے ہو؟

یہ میں نہیں بتا سکتا۔ اس نے اپنے ہاتھ مضبوطی سے سونٹے پر جمائے ہوئے تھے۔

دولت پر کیا؟ آدمی نے ٹوکری کو زمین پر رکھ دیا اور چاقو کو اپنی پتلون پر ادہر ادہر پونچھنے لگا۔

نہیں، دولت پر ہرگز نہیں۔ یورگن نے حقارت سے کہا۔ کسی بالکل دوسری چیز پر۔

کیا چیز؟

یہ میں نہیں بتا سکتا۔ کوئی دوسری چیز۔

نہیں، تو نہ سہی۔ پھر میں بھی تمہیں نہیں بتاؤں گا کہ اس ٹوکری میں کیا ہے۔ مرد نے پاؤں سے ٹوکری کو چھوا اور چاقو کو بند کر دیا۔

ہوں، میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ ٹوکری میں کیا ہے۔ یورگن نے حقارت سے کہا: خرگوشوں کا چارہ۔

خدا کی قسم، درست! مرد نے حیرت سے کہا: تم ہوشیار آدمی ہو۔ کیا عمر ہے تمہاری؟

نو سال۔

ہوں، یہ بات بھلا کون جان سکتا ہے۔ نو، تب تو تم جانتے ہو گے کہ تین ضرب نو کتنے ہوتے ہیں، کیا؟

ظاہر ہے۔ یورگن نے کہا اور مہلت نکلنے کے لئے اس نے مزید کہا: یہ تو بالکل آسان ہے اور مرد کی ٹانگوں کے درمیان سے دوسری طرف دیکھا۔ تین ضرب نو نہیں؟ اس نے پھر ایک بار پوچھا: ستائیس۔ میں تو فوراً جان گیا تھا۔

درست۔ آدمی نے کہا اور عین اتنے خرگوش میرے پاس ہیں۔

یورگن نے ہونٹوں کو گول بنایا: ستائیس؟

تم انہیں دیکھ سکتے ہو۔ بہت سے تو ابھی بالکل بچے ہیں۔ کیا تم دیکھنا چاہتے ہو؟

میں نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے پہرہ جو دینا ہوتا ہے۔ یورگن نے کسی قدر تذبذب

سے جواب دیا۔

ہر وقت؟ آدمی نے پوچھا۔ راتوں کو بھی؟

راتوں کو بھی۔ ہمیشہ ہمیشہ۔ یورگن نے ٹیڑھی ٹانگوں سے اوپر کی جانب دیکھا۔ ہفتے کے روز سے۔ اس نے دھیمے سے کہا۔

تو کیا تم گھر بالکل نہیں جاتے ہو؟ تمہیں آخر کھانا بھی کھانا ہوگا۔

یورگن نے ایک پتھر کو ہٹایا۔ وہاں پر نصف روٹی رکھی تھی اور ٹین کا ایک ڈبہ۔

تم تمباکو پیتے ہو؟ آدمی نے پوچھا۔ کیا تمہارے پاس چرٹ ہے۔

یورگن نے اپنے سونٹے کو مضبوطی سے تھاما اور ہچکچاتے ہوئے کہا: میں سگریٹ بناتا ہوں۔ چرٹ مجھے پسند نہیں۔

افسوس کی بات ہے۔ مرد اپنی ٹوکری کی طرف جھکا۔ تمہیں خرگوش دیکھنے چاہیئں تھے۔ خاص طور پر ننھے خرگوش۔ شاید تم اپنے لئے ایک کو پسند کر لیتے۔ مگر تم تو یہاں سے جا نہیں سکتے۔

نہیں۔ یورگن نے افسردگی سے کہا: نہیں، نہیں۔

مرد نے ٹوکری کو تھاما اور سیدھا کھڑا ہوگا۔ ہاں تو اگر تمہیں یہاں پر ٹھہرنا ہے تو افسوس کی بات ہے اور اس نے اپنا رخ موڑا۔

بشرطیکہ تم میرا راز فاش نہ کردو۔ یورگن نے جلدی سے کہا: پہرہ چوہوں کی وجہ سے ہے۔

ٹیڑھی ٹانگیں ایک قدم واپس مڑیں: چوہوں کی وجہ سے؟

ہاں، وہ انسانوں کی لاشوں کو کھاتے ہیں۔ یہی تو ان کی خوراک ہے۔

کون کہتا ہے؟

ہمارا استاد۔

اور تم چوہوں پر پہرہ دیتے ہو؟ مرد نے پوچھا۔

ان پر تو نہیں۔ پھر اس نے آہستگی سے کہا: اپنے بھائی پر۔ وہ یہاں پر نیچے دبا پڑا ہے، وہاں پر، یورگن نے سونٹے سے گری ہوئی دیواروں کی طرف اشارہ کیا۔

ہمارے گھر پر بم گرا تھا۔ یکدم تہہ خانے میں بجلی جاتی رہی تھی اور وہ بھی۔ ہم نے آوازیں دیں۔ وہ مجھ سے کہیں چھوٹا تھا، صرف چار برس کا۔ وہ یہیں کہیں ہو گا۔ وہ مجھ سے کہیں چھوٹا تھا۔

مرد نے اوپر سے بالوں کے گچھے کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے یکدم کہا: ہاں، کیا تمہارے استاد نے نہیں بتایا تھا کہ چوہے راتوں کو سوتے ہیں؟

نہیں، یورگن نے سرگوشی کی اور ایکا ایکی وہ بے حد تھکا ماندہ لگنے لگا۔ اس نے یہ نہیں بتایا تھا۔

خوب۔ مرد نے کہا: یہ اچھا استاد ہے، جسے اس بات کا بھی پتہ نہیں ہے۔ راتوں کو چوہے بلاشبہ سوتے ہیں۔ رات کے وقت تم اطمینان کے ساتھ گھر جا سکتے ہو۔ راتوں کو وہ ہمیشہ سوتے ہیں۔ اندھیرا پڑتے ہی۔

یورگن اپنے سونٹے سے خاک میں چھوٹے چھوٹے گڑھے بنانے لگا۔ چھوٹے چھوٹے بستر ہیں یہ، اس نے سوچا۔ سب چھوٹے چھوٹے بستر۔

تب آدمی نے کہا: (اور اس کی ٹیڑھی میڑھی ٹانگیں اس وقت بہت بے کل تھیں) میں تمہیں بتاؤں؟ اب میں جلدی جلدی اپنے خرگوشوں کو چارہ ڈالتا ہوں اور جب اندھیرا ہو جائے گا، تو میں تمہیں لینے آؤں گا۔ ہو سکتا ہے کہ میں ایک خرگوش کو اپنے ساتھ لیتا آؤں، ایک ننھا سا۔ کیا خیال ہے تمہارا؟

یورگن خاک میں چھوٹے چھوٹے گڑھے بناتا چلا گیا۔ چھوٹے چھوٹے خرگوش، سفید، بھورے اور سفیدی مائل بھورے۔ میں نہیں کہہ سکتا، اس نے آہستگی سے کہا اور ٹیڑھی ٹانگوں کی طرف دیکھا: کہ آیا وہ راتوں کو سچ مچ سوتے ہیں۔

آدمی شکستہ دیوار کے اوپر سے سڑک کی طرف اتر چکا تھا۔ بلاشبہ۔ اس نے وہاں سے کہا: تمہارے استاد کو اپنا بوریا بستر باندھ لینا چاہیئے، اگر اسے اس بات کا بھی پتہ نہیں ہے۔

تب یورگن اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے پوچھا: کیا مجھے ایک ننھا خرگوش مل سکتا ہے؟ سفید شاید؟

میں کوشش کروں گا۔ آدمی نے جاتے ہوئے پکار کر کہا: مگر تمہیں اتنی دیر

تک یہاں پر انتظار کرنا ہو گا۔ پھر میں تمہارے ساتھ گھر جاؤں گا۔ سمجھے؟ مجھے تمہارے باپ کو بتانا ہو گا کہ خرگوشوں کا ڈربہ کس طرح بناتے ہیں۔ اس کا تمہیں علم ہونا چاہیئے۔

ہاں۔ یورگن پکارا: میں انتظار کروں گا۔ مجھے ابھی اندھیرا پڑنے تک پہرہ دینا ہے۔ میں یقیناً انتظار کروں گا۔ اور اس نے چلا کر کہا: ہمارے گھر میں تختیاں بھی ہیں۔ کریٹ کی لکڑیاں، اس نے کہا۔

مگر اس بات کو وہ نہ سن سکتا تھا۔ وہ اپنی ٹیڑھی میڑھی ٹانگوں کے ساتھ سورج کی سمت میں جا رہا تھا. جو شام ہونے کے سبب لال سرخ ہو رہا تھا۔ اور یورگن اسے ٹانگوں کے درمیان سے دیکھ سکتا تھا، وہ اس قدر ٹیڑھی تھیں۔ اور ٹوکری ادھر ادھر ڈھلک رہی تھی۔ اس میں خرگوش کا چارہ تھا. سبز چارہ، جو ملبے کے باعث کسی قدر بھورا ہو رہا تھا۔

والٹرینز

Walter Jens

ہانٹنگٹن رپورٹ

اس سال موسم سرما بہت جلدی آ گیا تھا۔ وسط نومبر میں ہی پندرہ ڈگری سردی پڑ گئی اور دسمبر کے پہلے ہفتے میں چھ روز تک برف باری ہوتی رہی۔ ہانٹنگٹن مفرور ہو گیا۔ اس نے غالباً سوچا تھا کہ برف اس کے قدموں کے نشانوں کو مٹا دے گی .... اور اس کی امید بر آئی۔ کتوں نے بہت جلد اس کی بو کو کھو دیا اور سپاہی اسی رات کے دوران کولویل واپس لوٹ گئے۔

اس سے اگلے روز ہمارے پولیس اسٹیشن کو کمک پہنچ گئی۔ اور سرجنٹ سمتھ کو دو نئے ساتھی مل گئے، کیونکہ خیال تھا کہ ہانٹنگٹن سیدھا کنوکس پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ وہاں پر اسے، جس کی ایک عرصے سے تلاش ہو رہی تھی، مئی کے مہینے میں سڑک پر گرفتار کیا گیا تھا۔ غالباً مخبری کے نتیجے میں، جس کا ارتکاب ویٹرس ہوپ اور پٹرول پمپ کے مالک میڈیسن نے کیا تھا، جن کا ہانٹنگٹن قرضدار تھا۔ اس وجہ سے یہ بات قرین قیاس تھی کہ مفرور قیدی بدلہ لینے کے لئے سب سے پہلے کنوکس کا رخ کرے گا۔

اس لمحے سے خوف وہراس ہمارے قصبے میں بسنے لگا۔ مارتھا ہوپ چند ہفتوں کے لئے سفر پر چلی گئی اور میڈیسن نے اپنا ریوالور لوڈ کر کے اپنے بستر کے پہلو میں رکھ لیا۔ ہم دوسرے لوگ بھی خوف زدہ تھے۔ شام کے دس بجے کے بعد کوئی شخص اپنے گھر سے باہر قدم نہ دھرتا تھا۔ بچوں کو والدین مدرسہ میں چھوڑنے جاتے تھے۔ پولیس نے ہر کونے کھدرے کو چھان مارا تھا۔ کوئی تہہ خانہ اور کوئی اسٹور روم، کوئی جھونپڑی اور کوئی بیرک ایسی نہ تھی، جس کی کئی بار تلاشی نہ لی گئی ہو۔ حتیٰ کہ

گندے نالوں تک کو چھان مارا گیا۔ اگرچہ کہیں پر بھی معمولی سا ثبوت تک نہ ملا (کوئی ہلکا سا نشان تک نہیں، کسی ثبوت کا تو ذکر ہی کیا)۔ اس کے باوجود یہ افواہ ٹلنے میں نہ آتی تھی کہ ہم میں سے کسی نے مفرور کو، جو اپنی گھڑی کے آنے کا انتظار کر رہا تھا، چھپا رکھا تھا۔ ایک بار شراب خانے کے مالک ایلنگٹن پر شبہ کیا گیا۔ دوسری بار اخبار فروش پر اور تیسری بار ایک ایسے شخص پر، جو باہر سے آن کر وہاں پر بسا تھا اور اپنا سامان پھیری لگا کر کولویل اور باکسٹن میں گھر گھر پر جا کر بیچا کرتا تھا۔ بد ظنی شہر پر چھائی ہوئی تھی۔ گمنام خط لکھے گئے۔ "کولویل اسٹار" میں خفیہ قسم کے اشتہار شائع ہوئے: "بور کو نظر میں رکھو" یا "بیہودہ ایلنگٹن، تم چار دسمبر کے روز کہاں پر تھے؟" جب کرسمس اور نئے سال کے تہوار گذر گئے، بغیر اس کے کہ کسی قسم کا کوئی وقوعہ پیش آتا، تو ہم نے نئے سرے سے امید پکڑنی شروع کی۔ خاص طور پر اس وجہ سے بھی کہ کہا گیا کہ ایک شراب فروش نے ہاٹنگٹن کو کینیڈا کے ایک چھوٹے سے سرحد کے قریبی قصبے میں دیکھا تھا۔ مارتھا ہوپ لوٹ آئی۔ میڈیسن نے حفاظتی کتے کو فروخت کر دیا۔ شراب خانوں میں پھر سے کاروبار چمک اٹھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے ہمارے شہری ہفتوں بھر کے ناغے کی کمی کو چند دنوں کے اندر نکالنا چاہتے تھے۔ کھڑکیوں کی چٹخنیاں اتار دی گئیں اور تالے کھول دیئے گئے۔ سڑکوں پر شور شرابا اور موسیقی سنی جانے لگی اور سیلون میں بہروپ بھرنے کا میلہ، جیسا سالوں سے نہ لگا تھا، صبح کے چھ بجے تک جاری رہا۔

مگر ۱۱ جنوری کو اچانک نیچے دریا کے کنارے ایمیلی سوڈی کی لاش ملی۔ دو روز کے بعد ہیلین فلیچر، ایک چودہ سالہ لڑکی، کو اسکول کے رستے میں کسی نقاب پوش نے ایک مکان کی ڈیوڑھی میں کھینچ کر بہت بری طرح نوچ ڈالا۔ اسبارہ میں (اب لوگ جان چکے تھے) کسی تاویل کی حاجت نہ تھی۔ ہاٹنگٹن شہر میں تھا۔ مگر اس کو کس نے چھپا رکھا تھا؟ میڈیسن نے شاید اپنے آپ کو بچانے کی خاطر، یا شاید مارتھا ہوپ نے، کیونکہ اسکو بلیک میل کیا گیا تھا؟ خفیہ فہرستیں گردش میں تھیں۔ گھروں کی دیواریں اور فٹ پاتھ الزامات کی تحریروں سے بھرے ہوئے تھے۔ اور جب یکم فروری کو تین آدمیوں پر مشتمل تحقیقاتی کمیٹی کے سپرد تمام شہریوں کی

زندگی کا پوری طرح جائزہ لینے کا کام کیا گیا، تو تعذیب عام کا طوفان آ گیا، ایسا کہ تاریک ترین زمانے کی یاد تازہ ہو گئی۔ جلد ہی کوئی راز ایسا نہ تھا، جسے ڈھونڈنے والوں نے نکال کر فاش نہ کر دیا ہو۔ خاوند، جنہوں نے ایک بار بھی لغزش کھائی تھی انہوں نے اپنے ساتھ عادی مجرموں کا سلوک ہوتے دیکھا۔ چھوٹے موٹے شرابیوں پر قتل کے الزامات لگنے لگے۔ عورتوں کے گروپ کی طرف سے سینما شو سے پہلے اشتہار تقسیم کیے گئے، جن میں شہریوں کو خبردار کیا گیا کہ اگر انہیں زندگی پیاری ہے، تو فلاں قسم کے لوگوں کے ساتھ میل جول سے باز رہیں۔ دوسری طرف ان دنوں میں نوجوانوں کے اندر آوارگی بڑھنے لگی اور اخلاقی انحطاط میں اضافہ ہونے لگا۔ جب کہ بڑی عمر والے گھروں سے حتیٰ الامکان صرف کام پر جانے کی خاطر یا چرچ سروس کے لئے نکلنے لگے تھے، نوجوان شاموں کو شراب خانوں میں جمع ہو کر شراب پینے، ہلڑ بازی مچانے، بڑوں پر آوازے کسنے لگے اور ایک ایسی تعذیبی فضا پیدا کر دی کہ ہم اس پر ایک قسم کی سویلین پولیس، عوامی گارڈ، کے ذریعہ قابو پا سکے۔ بالاخر اور کوئی طریق نہ رہا سوائے اس کے کہ رنگ لیڈروں کو لگے ہاتھوں گرفتار کر لیا جائے۔ پتہ چلا کہ سب سے زیادہ شور مچانے والے بھی دراصل شیخی بگھارنے کی بجائے اس ڈر کے مارے اکٹھے ہوتے تھے کہ کہیں ہاٹنگٹن کا شکار نہ بن جائیں۔ اس چیز نے مجھے پھر ایک بار اس بات کا قائل کر لیا کہ کس قدر سرعت کے ساتھ عوامی پاگل پن خوف اور ہیبت کے سائے میں پنپتا ہے۔ مزید برآں جہاں تک اخلاق کے گرنے کا سوال تھا اس سلسلے میں ماں باپ اپنے بچوں سے کسی طرح پیچھے نہ تھے۔ میں نے خود راتیں گذاری ہیں، جن میں درجن بھر سے زیادہ لوگوں نے مجھے بدلی ہوئی آوازوں میں مشکوک لوگوں کا بائیکاٹ کرنے پر مجبور کرنے کے لئے فون کیا۔

اور پھر ۱۷ مارچ کا دن آیا، جب میڈیسن کو اپنے کمرے میں گلا گھونٹے جانے کے سبب مرا ہوا پایا گیا۔ قاتل نے اس کی کنپٹی پر قائن کا تل جلا کر بنا ڈالا تھا۔ اس دن کے بعد ہم میں سے سمجھ دار لوگوں کے لئے بھی صبر کرنا ممکن نہ رہا۔ اگر اب بھی کوئی ہوش و حواس کو قابو میں رکھنے اور اس جنون کو مقابلہ کرنے کی کوشش کرتا تھا، تو فوراً اپنے آپ کو مشکوک لوگوں کی فہرست پر پاتا تھا..... اور اس کا مطلب تھا

کھڑکیوں کے ٹوٹتے ہوئے شیشے، گھر بار کی تباہی، دھمکیاں، رپورٹیں، ضرب کوبی اور بے عزتی ــ چند ہی ہفتوں کے بعد شہریوں کے درمیان مار پٹائی ہونے لگی ـ اپریل کے اوائل میں جنونی لوگوں نے ایک نیگرو کو زدوکوب کر کے جان سے مار ڈالا ـ چند ہی روز کے بعد ایک یہودی ڈاکٹر کا مطب توڑ پھوڑ دیا گیا ـ اب لوگ ایک قدم آگے چلے گئے اور ہانٹنگٹن کے بہانے پرانے کبھی کے بھولے بسرے بدلے لینے لگے ـ ریوالور، چاقو اور کوڑوں کی حکمرانی چلنے لگی اور جو کوئی مزاحمت کرتا تھا، اس کی لئے تازیانے کے طور پر اس کے گھر کے دروازے پر چاقو سے "ہا" لکھ دیا جاتا تھا.... یہ ہانٹنگٹن کا دوست ہے، تم اس کے ساتھ جو چاہو کر سکتے ہو، کوئی اس کا ساتھ نہیں دے گا ـ

اپریل کے مہینے میں بلکہ ریورنڈ سنیڈر نے بھی، جو آخری ہوش مند لوگوں میں سے تھا، ہتھیار ڈال دیئے ـ اس نے ہمیں چرچ کے منبر سے قاتل اور اس کے مددگاروں کا پیچھا کرنے کو حکم دیا ـ یہ ایسٹر کی بات ہے، اس سے اگلے روز موسم سرما کی طاقت ٹوٹ گئی اور برف پگھلنے لگی ـ سورج نے ہر چیز کو کھول کر رکھ دیا ـ گڈ فرائی ڈے کو ہانٹنگٹن کی لاش قید خانے سے ایک سو میٹر کے فاصلے پر ملی ـ نومبر میں اپنے فرار کے وقت وہ اس سے آگے نہ جا سکا تھا ـ برف نے اس کے قدموں کے نشانات کو دبا دیا تھا اور یخ کے کفن نے اس کی لاش کو بچائے رکھا ـ

اس دن سے ہمارے ہاں یہاں کنوکس میں خاموشی گھبیر ہونے لگی ہے ـ جس کسی کے لئے ممکن تھا، وہ یہاں سے نقل مکانی کر گیا ہے ـ ایمیلی سوڈی اور میڈیسن کے قاتلوں کو نہ پکڑا جا سکا ـ اور ہیلن فلیچر پر کئے جانے والا ظلم بھی بدلے کے بغیر رہا ـ البتہ مجھے کسی پر شبہ ہے، مگر میں نے چپ سادھ رکھی ہے ـ اور کسی کو علم نہیں ہے کہ مجرم کون ہے ـ مگر ایک بات یقینی ہے کہ ہمارے شہر میں کم ہی لوگ ہوں گے، جو قصوروار نہیں ہیں ـ

ایوا زیلر
Eva Zeller

مصدقہ سیاہ فام

جب ویرما اور پیڈرو مجسٹریٹ کی طرف گئے، تو پروا چل رہی تھی ۔ پروا ویرما کے پیٹ کو اس کے دبلے بدن پر اس طرح نمایاں کر رہی تھی کہ زچگی کی قمیص کچھ بھی نہ چھپا پاتی تھی ۔ مگر سڑک پر کوئی شخص نہیں تھا کیونکہ ایسے موسم میں انسان کسی کتے کو بھی باہر نہیں دھتکارتا ۔

وہ بہت سویرے آگئے تھے ۔ پیڈرو نے بند دروازے کو کھٹکھٹانے کی جرأت کی ۔ ویرما نے اسے ٹھنڈا کرنا چاہا، اس طرح کہ اس نے اپنے آپ کو دروازے کے سامنے ڈھیر کر دیا ۔ بچہ اس کے پیٹ میں یوں لوٹ پوٹ ہو رہا تھا، جیسے کانٹے پر لگی ہوئی مچھلی ۔ وہ دروازے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور اپنے گھٹنوں کو ٹھوڑی تک کھینچ لیا ۔

پیڈرو کے پاس ایک کالی ڈائیل پلیٹ والی سنہری گھڑی تھی ۔ اس پر پچیس پونڈ لگے تھے، کیونکہ وہ خود بخود چابی دیتی تھی ۔ ایک سیکنڈوں والی سوئی پورے بھرم کے ساتھ گھومتی رہتی تھی، جیسے روشنی کے مینار کی سرچ لائٹ راتوں کو پانی پر ۔ ویرما نے گھڑی پر دیکھا، کیونکہ پیڈرو اس کے پہلو میں لکڑی کے واحد زینے پر بیٹھ گیا تھا اور اپنے بازوؤں کو اپنے سینے پر خم کئے ہوئے تھا ۔ نو کا وقت گذر چکا تھا ۔ انہیں نو بجے آنے کو کہا گیا تھا ۔

"وہ آج نہیں آئیں گے" ویرما نے کہا "پروا چلنے پر وہ نہیں آتے" ۔

"وہ ضرور آئیں گے" ۔

"اگر وہ آئے، تو تمہیں اندر کر دیں گے" ۔

پیڈرو مسکرایا ۔ اس نے ایک سگریٹ نکالا اور ہوا کے ایک جھونکے کے گذر

جانے کا انتظار کیا، تاکہ لائٹر کو ہاتھ کی اوٹ میں جلا سکے۔ شعلہ اس جلتی ہوئی ہوا میں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پیڈرو نے سگریٹ کو پھینک دیا اور تھوک اگل دیا۔ کیونکہ اس کا منہ ریت سے بھرا ہوا تھا۔

مجسٹریٹ کے دفتر کے سامنے ایک باغیچہ تھا۔ دراصل جنگلے سے گھرا ہوا ریت کا ایک ٹکڑا، جس کے درمیان پدی کھجور کا ایک درخت کھڑا تھا۔ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ ریت کو اپنے چمڑے جیسے پتوں سے، جو ہرے نہیں بلکہ بھورے تھے اور اس روشنی میں کیلے کے کٹوروں کی طرح دکھائی دیتے تھے، تازیانے مارتی تھی؛ جب ہوا رک جاتی تھی، تو کھجور سیدھی کھڑی ہو جاتی تھی اور اپنے منتشر پنکھوں کو ناقابل یقین سرعت کے ساتھ ٹھیک کر لیتی تھی اور پھر کھجور بن جاتی تھی۔ سادہ، کھردری اور خوبصورت، جیسی صرف کھجوریں ہو سکتی ہیں۔ اگر ہوا تیز ہو جاتی تھی، تو وہ پھر کانپنے اور کھڑکھڑانے لگتی تھی، پیشتر اس کے اسے زمین پر جکڑ دیا جاتا تھا۔ پھر پیڈرو نے ویرما کا سر پکڑا اور اسے اپنے کوٹ کے نیچے ٹھونس دیا۔ اگرچہ طوفان دھاڑ رہا تھا، وہ اس کی پسلیوں سے لگ کر اس کے دل کو دھڑکتا ہوا سن سکتی تھی اور اس کی گھڑی کو، جب اس کا بازو اس کے کان کے ساتھ لگ جاتا تھا۔ اس کے گلے سے پسینہ رس رس کر اس کے بالوں میں ٹپک رہا تھا۔ اس کے کوٹ کی تاریک غار میں ویرما ہر بار مطمئن ہو جاتی تھی۔ مگر جب وہ ہوا کے وقفوں میں سیدھی ہو کر بیٹھتی تھی، تو کانپنے لگتی تھی، کیونکہ مجسٹریٹ کو اب جلد آجانا چاہیے۔

"ہم واپس چلے جاتے ہیں۔ ہم یہاں پر سے ہو گئے ہیں"۔

"اور خواہ مجھے آج شام تک بیٹھنا پڑے" پیڈرو نے کہا "آج معاملے کو درست کرنا ہو گا"۔

"وہ تمہیں اندر کر دیں گے۔ تم ابھی تک سمجھتے ہو کہ یہاں پر ویسے ہی ہے، جیسے تمہارے ملک میں"۔

"اس کے برعکس، میرے ننھے موتی۔ میں نے خوب تیاری کر رکھی ہے۔۔ تم حیران ہو کر رہ جاؤ گی"۔

پیڈرو نے پھر ویرما کا سر اپنے کوٹ کے نیچے ڈھکا اور اس کے ساتھ جھک گیا۔

سب سے زیادہ تکلیف دہ ریت تھی۔ ہوا ریت سے بھری ہوئی تھی، جیسے صحرا نے اپنی پیاس کو سمندر پر جاکر بجھانے کے لئے رخت سفر باندھ رکھا تھا۔ اور سمندر پیچھے ہٹ گیا تھا اور اسے زبان نکال کر دکھا رہا تھا۔ جب زہریلے پیلے ریلے گذر جاتے تھے، تو پیڈرو روشنی کے مینار کو دیکھ سکتا تھا، جس کے سرخ رنگے ہوئے حصے جدا جدا نظر آتے تھے، جیسے سراب یا بعض اوقات جلنے بجھنے والی نشانیاں، جو صرف اس وقت چمک اٹھتی تھیں، جب ریت کا ریلا گذر جاتا تھا۔ اور جن کا مطلب کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ سورج ایک گلے کی طرح تھا، جو قے اگل رہا تھا۔

دوپہر کے لگ بھگ گرمی ناقابل برداشت ہو گئی۔ پیڈرو اکیلا سامنے کی بار میں جاکر بیٹھ سکتا تھا، ایک اونچے سٹول پر پنکھے کے قریب۔ مگر ویرما وہاں پر ساتھ نہ جا سکتی تھی۔ اس وجہ سے پیڈرو جھکا ہوا سڑک کے پار گیا اور سوڈا واٹر اور سینڈوچ لے کر آیا۔ ویرما کھانا نہیں چاہتی تھی، مگر اس نے اسے اپنے کوٹ کے نیچے کھلایا، جیسے وہ پر ٹوٹا ہوا بگلا تھی۔

ایک بجے پروا رک گئی۔ یکدم جیسے آدمی ویکوم کلینر یا بال خشک کرنے والے آلے کو بند کر دیتا ہے۔ پڑی بھور سیدھی کھڑی ہو گئی۔ یہ امر حیرت انگیز تھا کہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچا تھا۔ ویرما اور پیڈرو اٹھ کھڑے ہوئے اور ساحل سمندر کی طرف گئے، کیونکہ دوپہر کو مجسٹریٹ یقیناً نہیں آئے گا۔ وہ حیران ہوئے یہ دیکھ کر کہ ساحل اور سمندر کے درمیان ایک خاصا چوڑا مد و جزر کا علاقہ پڑا تھا، جو عام طور سے نہیں پایا جاتا تھا۔ وہ ایک خوبصورت ہموار پختہ سڑک کی طرح سمندر کے پیچ و خم کے ساتھ ساتھ جاتا تھا۔ انہوں نے اپنے جوتوں کو ہاتھوں میں پکڑ لیا اور اس پر چلنے لگے۔ انکے پیچھے ان کے نقوش قدم جلد ڈھے جاتے تھے، جیسے وہاں سے کوئی گذرا ہی نہ ہو۔ پرانے پل کے ستونوں کے وہ حصے، جہاں پر پانی نہیں جاتا تھا، اپنے عیب دار پایوں کو ننگا کئے بیٹھے تھے۔ ایک نئے پل کی تعمیر کبھی کی ہونے والی تھی، مگر ابھی تک اس کی نوبت نہ آئی تھی۔

"یہاں پر تم بیشک گا سکتی ہو" پیڈرو نے کہا۔ ویرما ہنس دی اور اپنی پھٹی پھٹی آواز میں گانے لگی، جس کے سبب پیڈرو کو اس سے پہلے پہل محبت ہوئی تھی۔

اس اثنا میں وہ صورت حال پیدا ہو گئی تھی، جسے لوگ یہاں پر پروا کا موڑ کہتے ہیں ۔ اس وقت آسمان قدیمی چرچ کی کھڑکیوں والے نیلے رنگ کو دھار لیتا ہے اور اتنا قریب ہوتا ہے کہ انسان گمان کرتا ہے کہ اگر وہ اچھی طرح اپنے آپ کو کھینچ تانے تو اسے ٹھونکا مار سکتا ہے ۔ آسمان اور ساحل کے درمیان فضا بے شمار موم بتیوں سے جیسے سنہری ہو جاتی ہے ۔ ایسی سہ پہروں میں محبت کرنے والے جوڑے ساحلی ریت کے تودوں کا رخ کرتے ہیں ۔

میں ساحلی تودوں کا دکھانا تو بھول ہی گئی تھی ۔ اگرچہ وہ ہر طرف دکھائی دیتے ہیں ۔ کیونکہ وہ روشنی کے مینار سے بھی اونچے ہیں ۔ جب تک پروا چلتی ہے، انسان بہت زیادہ قوت واہمہ کے بغیر بھی یہ تصور کر سکتا ہے کہ شیر سمندر کے سامنے پڑے ہیں، جن کے بالوں کو ہوا کھینچ رہی ہے، جن کے رانوں کی نوکیلی ہڈیاں باہر کو نکلی ہوئی ہیں اور جن کے پہلو دبے ہوئے ہیں ۔ انسان انہیں پانی کے ریلے پر غراتے ہوئے بھی سن سکتا ہے، جو ڈر کے مارے اور پھنکارتے ہوئے پسپائی اختیار کرتا ہے ۔ جب پروا تھم جاتی ہے، تو اڑتی ہوئی ریت نے ہر تپتے ہوئے گڑھے میں ایک بستر جما دیا ہے، جو دنیا کے سارے بستروں سے زیادہ اخفا پسند ہے ۔

ساڑھے تین بجے ویرما اور پیڈرو واپس آ گئے ۔ ویرما رونے لگی، کیونکہ وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں سوچ سکتی تھی کہ یہ جدائی کا پیش خیمہ تھا ۔ مجسٹریٹ چار بجے آیا اس کی کار تپش کے نیچے سے گذری ۔ ویرما اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے کپڑے سیدھے کئے، پیڈرو بیٹھا رہا اور اس نے ایک سگریٹ سلگا لیا ۔ مجسٹریٹ اور دو دوسرے آدمی ان کے پاس سے گذر گئے ۔ انہوں نے دروازہ کھولا اور اپنے پیچھے پھر بند کر دیا ۔ تھوڑی دیر کے بعد پیڈرو کے سر کے اوپر ایک کھڑکی باہر کی طرف کھولی گئی ۔ اس کے ساتھ ہی کھڑکی کی کارنس سے ایک بوری نیچے سرک گئی ۔ کیونکہ گیلی بوریوں سے لوگ اپنی کھڑکیوں کو ریت کے جھکڑ کے سامنے مورچہ بند کرتے ہیں ۔ چونکہ بوری کو اکثر کھارے پانی سے نچوڑا اور پھر سکھایا جاتا تھا، اس لئے وہ اکڑی ہوئی تھی ۔ شاید وہ پہلے نمک کی بوری تھی ۔ بہر صورت وہ اب ایک تختہ تھی ۔ پیڈرو نے اسے باغیچے میں پھینک دیا اور دھمکانے کے اشارے کرنے لگا، یوں کہ ویرما رونے لگی ۔ اس سے

پیڈرو میں اور بھی زیادہ دلیری آگئی، اگر اس کا کوئی امکان پایا جاتا تھا۔ وہ اٹھا اور اس نے سچ مچ سیگریٹ کو اپنے ہونٹوں میں دبائے ہوئے ویرما کو پکڑا اور مجسٹریٹ کے دفتر میں داخل ہو گیا۔

مجسٹریٹ کا دفتر براؤن تھا اور ایک کانے بادام کی طرح خالی۔ درمیان میں ایک جنگلہ تھا اور اس کے اوپر ایک موٹی مٹی کے ذرات سے چمکتی ہوئی سورج کی شعاع کی کڑی، جو کمرے کی واحد کھڑکی سے آرہی تھی اور کمرے کو دو تاریک حصوں میں تقسیم کر رہی تھی۔ پیڈرو نے ویرما کو جنگلے کے اس طرف کی واحد کرسی پر بٹھایا، جس کا اس معاملے میں رواج نہیں تھا اور دھمکاتے ہوئے کہنے لگا "خبردار جو تم اٹھو، جب یہ سفید پھونگڑے آئیں"۔

پہلے ایک آدمی آیا، جو سیکرٹری نکلا اور جو وہاں اس لئے تھا کہ ہر لفظ کو نوٹ کرتا جائے، جو وہاں پر بولا جائے گا۔

"آپ کیا چاہتے ہیں؟" اس نے پیڈرو سے پوچھا۔ اور کوئی شخص اس سے اس وجہ سے ناراض نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اس گرمی میں اس سے زیادہ مؤدب نہ ہو سکتا تھا۔

"ہمیں نو بجے بلا گیا تھا" پیڈرو نے شکایت کرتے ہوئے کہا "اور اب چار بج رہے ہیں"۔

"ہم سے کیا مراد ہے؟" سیکرٹری نے پوچھا۔ اس نے اس کے ساتھ کندھوں کو اوپر کو کھینچا، جیسے اسے سردی لگ رہی ہو۔ مگر وہ صرف سورج کی کڑی کے پار ویرما کو دیکھنا چاہتا تھا۔

"میری منگیتر اور میں" پیڈرو نے کہا "میرا نام دیاز ہے"۔

اس پر سیکرٹری مسکراتا ہوا اٹھا اور مجسٹریٹ کو بلا لایا۔

مجسٹریٹ اپنے ساتھ ایک تیسرے آدمی کو بھی لے آیا، جس کی، جیسا کہ پیڈرو نے دیکھا، صرف ایک آنکھ تھی۔ دوسری کانچ کی تھی۔

"آپ افریکان بولتے ہیں؟" مجسٹریٹ نے پوچھا۔

"جی ہاں"۔

"یہ محض احتیاطاً تھا" مجسٹریٹ نے کہا "اگر انسان ایک جیسی زبان بولتا ہو، تو آسانی رہتی ہے"

جب پیڈرو نے کوئی جواب نہ دیا، تو اس نے بات کو جاری رکھا "تو ہم اصل معاملے کی طرف آتے ہیں ۔ آپ پیڈرو دیاز ہیں، پرتگالی شہری"

"جی ہاں"۔

"عمر؟"

"۳۳"۔

"پیشہ؟"

"میں مچھیروں کی کشتی چلاتا ہوں"۔

"پھر تو آپ کا کاروبار خوب چلتا ہوگا، مے نیر دیاز، پیلشارڈ اور شئین براس مچھلیاں امسال خوب موٹی ہوگی"۔

"میرا کاروبار خوب ہے، مے نیر مجسٹریٹ ۔ مگر ہم پیلشارڈ اور شئین براس مچھلیوں کے بارے میں تو باتیں کرنے نہیں آئے"۔

"خوب" مجسٹریٹ نے اپنا سر ڈھول کی کڑی کے نیچے سے باہر نکالا ۔ مگر جلد ہی آنکھوں کے چندیا جانے کے سبب اسے واپس کھینچ لیا ۔ "ایک بہت مندا قصہ ہو گیا ہے"۔

"کیسا قصہ؟"

"مہینے کی چھ تاریخ کو میرے سامنے پیش ہوا" مجسٹریٹ نے اب کھنچے ہوئے سرکاری لہجے میں پڑھا "محترم مے نیر نیلز فان ڈین برگ، پیشہ کے اعتبار سے آلوئے ٹیکسٹائل پی ٹی وائی لمیٹڈ کا نمائندہ ۔ اور اس بات کا ثبوت رکھنے کا دعویٰ کیا کہ آپ، سفید فام پرتگالی مے نیر پیڈرو دیاز نے سیاہ فام ہینڈے رینا مار تھا ہائی لونگو کو حمل کر دیا ہے ۔ قانون کے پیش نظر مجھے آپ کو بلانا پڑا، تا کہ آپ اس کا جواب دیں ۔ آپ اس بارہ میں کیا کہتے ہیں؟"

"بہت کچھ، مے نیر..."

"بہت زیادہ نہیں، اگر آپ میری بات مانیں" مجسٹریٹ نے پھر ایک بار

کرسی کے نیچے سے دیکھنے کی کوشش کی۔" میں ایک انسان ہوں، مے نیر۔ میرے لئے آپ کا حلف کافی ہے کہ آپ کے خلاف باتیں پھیلائی گئی ہیں۔ میں..."

"اگر کسی کو جوابدہ ہونا ہے، تو اسے بولنے کی اجازت ہے یا نہیں؟"

"خوب، تو آپ کیا کہتے ہیں"۔

"مجھے یہ کہنا ہے کہ اس مے نیر ڈیرمروے یا فان ڈین برگ، یا جو بھی اس کا نام ہے، کو اپنی ناک دوسروں کے معاملات میں نہیں گھسیڑنی چاہیئے، پہلی بات۔ اور دوسری، میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ میں اس لنگوروں کے ملک میں کیوں اپنی منگیتر کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا۔ اب میں بول رہا ہوں۔ اس کے بعد آپ کی باری ہے، بشرطیکہ آپ کو کچھ کہنا ہے۔ آپ مجسٹریٹ ہیں۔ اور میں ایک پرتگالی ہوں، جو اپنی منگیتر کے ساتھ شادی کرنی چاہتا ہے۔ اگر سب ٹھیک ہوتا، تو میں ایک سال پہلے یہاں پر آپ کے سامنے کھڑا ہوتا، تا کہ آپ ہمارے بیاہ کو رجسٹر کریں۔ پھر ہم دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ کسی اور سلسلے میں واسطہ نہ پڑتا"۔

"آپ گویا تسلیم کرتے ہیں...؟"

"اب میں بول رہا ہوں، مے نیر مجسٹریٹ۔ میں نے کچھ تسلیم نہیں کیا ہے۔ میری ذاتی زندگی سے آپ کو کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ہمارے ہاں پرتگال میں مجرموں کو جوابدہ ہونا پڑتا ہے، قاتلوں کو، چوروں کو، میں کیا جانوں اور کسے۔ یہاں پر ایک شریف آدمی کو جوابدہ ہونا پڑتا ہے، جس نے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا"۔

یہ سب کچھ تو میں نہیں کہنا چاہتا تھا، پیڈرو نے کرب کھاتے ہوئے سوچا، جب کہ وہ بولے جا رہا تھا، جیسے چابی لگی ہوئی ہو۔ اب منہ کو روکو اور وہ کہو، جو تم نے زبانی یاد کر رکھا ہے: اس وجہ سے میں درخواست کرتا ہوں... مجسٹریٹ کیسی نظروں سے ویرما کو گھور رہا ہے۔ ہاں، میرے پیارے دوست، بعض اوقات شاندار امتزاج پیدا ہو جاتا ہے۔ کیوں؟ امید ہے کہ وہ اپنی کرسی سے نیچے نہیں سرک جائے گی۔

"... مختصراً، میں اس ملک کے قوانین کو جانتا ہوں، جن کی رو سے میں جرم کا ارتکاب کرتا ہوں، اگر میں ایک سیاہ فام کے ساتھ رہتا ہوں۔ میں نے اس چیز کو

نہیں چھپایا، جیسے شاید کوئی دوسرا میری جگہ پر کرتا۔ میں ایک سال سے اس لڑکی سے شادی کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مگر کامیابی نہیں ہوتی۔ اس کا باپ سفید فام تھا اور ماں سیاہ فام تھی"۔

"پھر تو اس کو سفید فام قرار دیا جا سکتا ہے۔ بھائی، اگر اس کا باپ سفید فام تھا..."

اس پر پیڈرو بازوؤں کو خم کئے ہوئے دھول کے پار جھکا اور ایک ایسی آواز میں کہنے لگا، جیسے وہ مجسٹریٹ کی سماعت تک ہی نہیں، بلکہ اس سے زیادہ حساس ادراک تک رسائی چاہتا ہو" مگر وہ اپنی دونوں بہنوں کی طرح باپ کے ذریعہ رجسٹر نہیں کروائی گئی تاکہ سفید فام قرار پاتی۔ باپ اس کی پیدائش سے تھوڑا پہلے غائب ہو گیا تھا۔ اور ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔ ہم نے مشنریوں اور مجسٹریٹوں کو لکھ لکھ کر اپنی انگلیاں زخمی کر لی ہیں۔ وہ غائب ہو گیا ہے۔ اس وجہ سے میری منگیتر اپنی ماں کی طرح سیاہ فام گنی جاتی ہے۔ سمجھے آپ؟"

"کیا اس کا باپ یہاں پر مقیم رہا ہے؟"

"جی ہاں"۔

"کیا نام ہے اس کا؟"

"یونکر پیٹ کوک"۔

"پیدائش؟"

"۱۹۱۰۔ کیٹ منسہوپ میں"۔

"اس کا فائل لے آؤ" مجسٹریٹ نے سیکرٹری سے کہا۔

اس کی فائل کے آنے میں کافی وقت لگ گیا۔ جیسے کسی حکم پر تینوں مردوں نے سگریٹ سلگا لئے اور دھول اور روشنی کو ایک دوسرے میں گڈمڈ کرنے لگے۔

تب مجسٹریٹ نے یونکر پیٹ کوک کی فائل کھولی۔ پیدائش ۱۹۱۰۔ کیٹ منسہوپ میں، جلد کا رنگ سفید، ایک بیٹی ایوون ماریا، پیدائش ۱۹ جون ۱۹۴۴۔ لیوڈے رٹز میں۔ ماں ہینڈے رینا ہائی لونگو، پیدائش ۱۹۳۰۔ رے ہوبوٹ میں، جلد کا رنگ سیاہ۔ ایک بیٹی کوسٹانزیا جوئے، پیدائش ۸ مئی ۱۹۴۵۔ وال فش بخت میں،

جلد کا رنگ سفید ۔ماں ہینڈے ریناہائی لونگو، پیدائش ۱۹۳۰ء رے ہو بوٹ میں، جلد کا رنگ سیاہ۔آگے کچھ نہیں لکھا ہے"۔

"مجھے پتہ ہے۔آگے کچھ نہیں لکھا ہے۔اور آپ اس میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتے۔میں اسے مانتا ہوں۔پھر ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ واضح ہے کہ ہم کبھی کے میری کشتی میں چلے گئے ہوتے۔انگولا میں مثال کے طور پر ہم شادی کر سکتے ہیں۔مگر یہ اتنا آسان نہیں ہے، مے نیر۔کیونکہ میں نے ایک پلاٹ خریدا ہے اور اس پر مکان بنانا شروع کر دیا ہے۔اس کے علاوہ میں نے مقیاس عمق البحر کا آلہ خریدا ہے، جس کی قیمت مجھے ابھی ادا کرنی ہے۔میں اپنے پیچھے قرض چھوڑ کر جانا پسند نہیں کرتا ہوں۔سمجھتے ہیں آپ؟ میں اس چیز کو یہیں پر طے کرنا چاہتا ہوں۔اس لئے میں جناب مجسٹریٹ صاحب ان دونوں محترم گواہوں کی موجودگی میں درخواست کرتا ہوں کہ میں پرتگالی پیڈرو دیاز، جلد کا رنگ سفید، اس ملک میں سیاہ فام قرار دیا جانا چاہتا ہوں، تاکہ میں اپنی منگیتر ویرما ہنڈے رینا مارتھا ہائی لونگو، جلد کا رنگ سیاہ، جس کو میں نے حاملہ کیا ہے، کے ساتھ بالآخر بیاہ رچا سکوں۔نظام کی پابندی ضروری ہے"۔

پیڈرو نے اپنے آپ کو زبان پر پڑھے لکھوں جیسی قدرت کے ساتھ بولتے ہوئے سنا۔سیکرٹری کا قلم رک گیا۔وہ بائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے ساتھ اس سے کھینچا تانی کرنے لگا، جیسے اس کی مرمت کرنا مقصود ہو۔مجسٹریٹ نے اپنا سر کچھوے کی طرح اندر کھینچ لیا۔تیسرا آدمی، یہ مے نیر فان ڈیر مروے یا فان ڈین برگ یا جو بھی اس کا نام تھا، آنکھیں بھینچے ہوئے ویرما کی طرف گھورے جا رہا تھا، جیسے وہ سراب نظر تھی، جس کا مقام کہیں دور دراز تھا، مگر گرم اور سرد ہواؤں کے ملاپ کے سبب ٹوٹنے والی شعاعوں کے قانون کے باعث یہاں پر اس کا سایہ پڑ رہا تھا' یہاں تک کہ کانچ کی آنکھ میں بھی چمک در آئی تھی۔ان نظروں کی بربریت نے ویرما کو اٹھ جانے اور پیڈرو کے پہلو میں جا کر کھڑے ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

"لکھیں..." مجسٹریٹ نے پکار کر کہا۔

"... معزز شاہدوں..." سیکرٹری ہکلایا۔

"... کہ میں پرتگالی پیڈرو دیاز..." پیڈرو نے لکھوایا۔

"میں امید کرتا ہوں کہ آپ کوئی مذاق نہیں کر رہے ہیں" مجسٹریٹ نے تھکاوٹ سے چور کہا۔

"میں امید کرتا ہوں، مے نیر مجسٹریٹ کہ جلد ایک کاغذ میرے ہاتھ میں ہو گا جس پر لکھا ہو گا کہ میں آج سے سیاہ فام ہوں"۔

زیگفریڈ لینز
Siegfried Lenz

لا پرواہ

فن لینڈ کا رہنے والا مہینے کے اواخر میں آیا۔ میں باورچی خانے کے صوفے پر پڑا سیگریٹ پی رہا تھا۔ کئی گھنٹوں سے اوور کوٹ میں لپٹے ہوئے یونہی پڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا مجھے ایلزا کو آئس کریم کی دوکان سے، جہاں پر وہ ویٹریس کے طور پر کام کرتی تھی، جا کر لانا چاہیئے۔ میں اس کے سرخی مائل موٹے ہاتھوں کے بارے میں سوچ رہا تھا، جو آئس کریم کے کپوں کو داغ دار مرمرین میزوں پر سرکاتے تھے، پیٹ پر بندھے ہوئے بڑے کیسہ میں سے بھان نکالتے تھے، چاکولیٹ کے ٹکڑوں کو کریم کے بڑے گولوں کے اوپر بکھیرتے تھے۔ میں اس کے چھوٹے گندے بھائی بہنوں کے بارے میں سوچتا رہا، جو ہماری شادی کے ابتدائی دنوں میں جانے بوجھے تجسس کے ساتھ ہمارے ہاں لگے بندھے پھرتے تھے، یہاں تک کہ میں نے انہیں بھگا دیا۔ اور جو اب ہر روز آئس کریم کی دوکان کے سامنے ٹہلتے پھرتے تھے، چوکس ڈاکوؤں کی طرح خفیہ اشارے کے انتظار میں، جو ان میں سے کسی کو اندر آنے اور خاموشی سے آئس کریم وصول کرنے کو کہتا تھا۔ اور جب کہ میں اس بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے سخت تھکاوٹ کو محسوس کیا اور ایلزا کا انتظار گھر پر کرنے کا فیصلہ کیا۔

تب فن لینڈ کے باسی نے گھنٹی بجائی۔ ایک چوڑا چکلا آدمی، ستے ہوئے چہرے والا، اوور کوٹ کو بازو پر ڈالے، ایک براون رنگ کے بیگ کو اپنے پاؤں کے درمیان دھرے ہوئے۔ مسکرا کر میری طرف تکتا ہے۔ خاموشی سادھے رہا اور مجھے تکتا رہا۔ ایک بیباکانہ انداز اور صامت تحقیر کے ساتھ اور پیشتر اس کے کہ میں کچھ پوچھتا، اس نے سر کو اطمینان کے ساتھ ہلایا۔ اپنے بیگ کو اٹھا کر باورچی خانے میں

در آیا اور اس کے ساتھ سرکے کی ترشی جیسی بو باس۔

"ہمارے پاس صرف پیسوں کی کمی ہے" میں نے کہا" اس کے علاوہ کچھ نہیں ہر دوسری چیز وافر طور پر موجود ہے"۔

اس نے سر کو جنبش دی، حیرت سے اور ساتھ کے ساتھ ہاتھ کی مدافعانہ حرکت سے۔ اس کے چہرے پر ایک دبی ہوئی حیرت انگیزی کا تاثر پھیل گیا۔ جس سے میں نے نتیجہ اخذ کیا کہ میں پہلا شخص نہیں تھا، جس کے پاس وہ اس سلسلے میں آیا تھا۔ پھر اس نے باورچی خانے کا جائزہ لیا۔ چھبنے والے صوفے کے پاس گیا۔ سپرنگوں کا امتحان اس طرح کیا کہ وہ مکوں کو کھینچ کر ایکا ایکی گدے پر مارتا تھا۔ اور بالآخر وہ سنک کی قریبی سٹول پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کے آلوچے کے گہرے رنگ والے سوٹ پر نگاہ ڈالی۔ پتلون کی ٹانگیں کھلے گھیرے والی تھیں، کسی ملاح کی طرح کوٹ کے نیچے اس نے گول گلے والا پل اوور پہن رکھا تھا۔ اور اسے کہا کہ میں کوئی چیز اپنی بیوی کے بغیر خرید یا بیچ نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ وہ اس وقت اکیلی خاندان کی فلاح و بہبود کی ذمہ دار تھی۔ جس پر اس نے اس بات پر متاسفانہ رنگ میں سمجھنے کا اشارہ آنکھوں سے کیا۔ سگریٹوں کا کیس نکالا اور اپنے دو آخری سگریٹوں میں سے ایک مجھے پیش کیا۔ ہم نے خاموشی سے سگریٹ پیئے۔ وہ گیس کے چولہے کو دیکھتا رہا۔ اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ وہ فن لینڈ کا رہنے والا ہے اور شہر میں اسے کوئی کام تھا۔ اس کا گٹھا ہوا جسم آگے اور پیچھے ہلکا سا جھونکا کھاتا تھا۔ اس کے ہونٹ کھلے، جیسے وہ کسی سابقہ مزے کو تلاش کر رہے ہوں۔ اور ان نے کھڑکی میں سے نیچے بچوں کے کھیل کے خالی میدان پر نگاہ دوڑائی۔ مسکراتے ہوئے سر کو ہلایا اور سرگوشی میں کچھ کہا، جسے میں نہ سمجھ سکا۔ میں نے تھکاوٹ کو لوٹتے ہوئے محسوس کیا۔ ایلزا کے بارے میں سوچا، جسے اب جلد آنا چاہیئے اور اس کی طرف تاسف کے کنائے سے دیکھا۔ وہ کنائے کو سمجھ گیا، جس میں خاموش مطالبہ مضمر تھا۔ وہ میرے قریب آیا اور پوچھنے لگا کہ کیا میں اسے اپنا باورچی خانہ کرائے پر دینے کو تیار ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ آہستہ آہستہ گھوم گیا اور اپنے پھیلائے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ اس حقیر خواہش کی تشریح کرتے ہوئے تنگ کمرے کی طرف اشارہ کرنے لگا، جیسے وہ

کہنا چاہتا تھا: "صرف یہ، اس سے زیادہ نہیں" ۔ اگر ایلیزا کا وجود نہ پایا جاتا، تو میں بلا تردد مان جاتا، مگر چونکہ مجھے پتہ تھا کہ باورچی خانہ اس کے لئے کتنی اہمیت رکھتا تھا، میں نے یہ بات دہرائی کہ میں اپنی بیوی کی غیر حاضری میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا ۔ تذبذب کے عالم میں وہ باورچی خانے کی دیواروں کی طرف تکنے لگا، جن پر دھندلے دھبے پھیکے پڑ جانے والے نقشوں کی طرح پھیلے ہوئے تھے ۔ صوفے کا جائزہ لیتا رہا ۔ الماری، جس پر ایلیزا کے گھنگریالے چھلے پڑے ہوئے تھے ۔ اس نے اپنے انتخاب کو منسوخ نہ کیا ۔ وہ گیس کے چولہے کے پاس گیا ۔ امتحان کرتے ہوئے ٹونٹی کو کھولا، بغیر دیا سلائی یا گیس جلانے والے آلے کو ہاتھ میں لینے کے ۔ اپنے جسم کے اوپر والے حصے کو گیس نکلنے والی سی سی کی آواز کو سننے کی امید میں جھکایا ۔ میں انتظار کرتا رہا، یہاں تک کہ وہ سیدھا کھڑا ہو گیا ۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ چولہے کی قیمت ابھی پوری ادا نہیں ہوئی اور یہ کہ ہم اس کی ادائیگی اس طرح پر کرتے ہیں کہ جب بھی ہمیں گیس کی ضرورت ہوتی ہے، ہم اس کے چھید میں ایک سکہ ڈالتے ہیں ۔ لگتا تھا کہ وہ اس بات کا قائل ہو گیا تھا، کیونکہ اس نے تصدیق میں سر کو ہلایا اور مجھ سے پوچھا... ایک ایسے رنگ میں جیسے فیصلہ ہو چکا تھا... کہ اس کو باورچی خانہ کب مل سکتا تھا اور پھر مجھے یہ دکھانے کے لئے کہ وہ گیس کے چولہے کو خوب استعمال کرنا چاہتا تھا، اس نے ایک ہاتھ جیب میں ڈالا اور چند سکوں کو ایک دوسرے سے رگڑنے لگا ۔ مجھے یہ جاننے کے لئے اس کے ساتھ باتیں کرنے کی کوئی خواہش نہ تھی کہ اسے ہمارے شہر میں کیا کام تھا اور اس نے کس وجہ سے ہمارے باورچی خانے کو کرائے پر لینے کا فیصلہ کیا تھا ۔ مجھے اپنے آپ کو اس کے معاملات میں دخل اندازی سے باز رکھنے، رازداری سے بچنے، کچھ نہ جاننے، کوئی قیاس نہ کرنے کا احساس تھا ۔

پھر وہ دوبارہ نزدیک آیا ۔ میں نے اس کے سرکے کی ترشی والے سانس کو سونگھا، اس کی سوجھی ہوئی آنکھوں کو دیکھا، جن کو التجا کرنے کے لئے جھپکنے میں ناکامی ہوئی ۔ آخری ہلا، آخری کوشش، جس کے ذریعہ وہ مجھے منانے کی امید رکھتا تھا' مسکراتے ہوئے اس نے اپنا زعفرانی پیلا بٹوا نکالا، میرے ہاتھ کو کھولا اور ساری رقم اس پر دھر دی... تین ہرے بیس مارک والے نوٹ ۔ اور میرے ہاتھ کو بند کر دیا اور

خالی بٹوے کو اپنے کوٹ میں ڈال دیا۔ ایک نئی برتری کا احساس اس پر چھا گیا، قانونی حق داری کی برتری۔ اب جب کہ اس نے رقم مجھے پکڑا دی تھی اور ایک ایسے دوستانہ انداز میں، جس نے مجھے حیران کر دیا تھا، اس نے اپنا بازو میرے کندھے پر رکھا۔ میری طرف نیچے سے تکنے لگا، کھلے چہرے سے، ہشاش بشاش، پیچھے ہٹا اور مجھے سامنے سے دیکھنے لگا۔ میرے گرداگرد گھوم گیا اور کہنے لگا کہ وہ ہمارے باورچی خانے کو زیادہ دیر تک اپنے پاس رکھنے کا ارادہ نہ رکھتا تھا۔ صرف اتنے وقت تک جتنی دیر لگتی ہے۔ اس نے کہا کہ اس کا ارادہ ساٹھ مارک کی لاگت پوری کرنے کا نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ باقی ماندہ سہ پہر اس کے لئے کافی ہو۔

نوٹ اصلی تھے۔ میں نے انہیں اوور کوٹ کی جیب میں کھلے ہی ڈال لیا۔ اور اسی لمحے ایلزا کو کام کی جگہ سے لانے کا فیصلہ کیا۔ فن لینڈ والے نے مجھے چند سکے دکھائے اور پوچھا کہ کیا وہ اس کے لئے کافی ہوں گے۔ چونکہ مجھے پورا یقین نہیں تھا، اس لئے میں نے سارے سکوں کا، جو میرے پاس تھے، اضافہ کر دیا۔ میں نے ایک اشارہ کیا، جس کے ذریعہ میں نے باورچی خانہ اس کے حوالے کر دیا۔ مفلر کو کس کر لپیٹا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے کو بند کرنے سے قبل میں نے سنا کہ اس نے اپنے آپ کو صوفے پر گرا دیا اور جوتے اتار دیئے، جو گرنے کی آواز کے ساتھ فرش پر جا پڑے۔

آئس کریم کی دوکان کے رستے میں میں نے پہلا بیس مارک کا نوٹ تڑوایا۔ سگریٹ اور ایلزا کے لئے رُم کی گولیاں خریدیں۔ سوچا کہ کیا مجھے موچی سے اپنے جوتے لانے چاہیئں، جو کبھی کے مرمت ہو چکے تھے، مگر میں دوکان کے پاس سے گذر گیا۔ بندار دھند سے ڈھکی ہوئی سہ پہر کو بندرگاہ میں گڑگڑانے والے جہازوں کی سیٹی نے جھنجوڑا۔ ٹھنڈی، نم ہوا پھیپھڑوں میں بیٹھتی جا رہی تھی۔ عورتوں کے بالوں کو بگاڑتی اور شو کیسوں کے گلاس پر جمتی جاتی تھی۔ پل والے چوراہے پر ایمر جنسی کار رکی۔ دو ایڈورکر ایک آدمی کو، جس کے چہرے پر زخم آئے تھے، سٹریچر پر اٹھا کر لے گئے۔ پولیس کے سپاہیوں نے بریک کی لکیروں پر آٹا بکھیرا، پیمائش کی اور اس کی تصویریں کھینچیں۔ میں نے رُم کی گولیوں کا ایک اور لفافہ خریدا، جو میں ایلزا کو

دوسری صبح دینا چاہتا تھا۔

جب میں آئس کریم کی دوکان میں داخل ہوا، تو ایلزا کی ساتھی، ٹھگنی سی ہڈیوں کا ڈھانچہ، مخمل کا لباس پہنے ہوئے، اندھیرے میں سے میری طرف آئی۔ مجھے دیر سے پہچانا اور کہنے لگی کہ ایلزا مچھلی والے کی طرف گئی ہوئی تھی۔ اس کے اوور کوٹ کی طرف اشارہ کیا، جو ابھی وارڈروب میں لٹک رہا تھا۔ اس نے مجھے ہیٹنگ کے قریب صوفے پر بیٹھنے کو کہا۔ میں انتظار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ایلزا کے کوٹ کو کھونٹی پر سے اتارا اور اس کو بازو پر ڈال کر مچھلی کی دوکان کی طرف چل دیا۔ دوکان سڑک کے پار تھی۔ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ کیا ایلزا دوکان میں تھی۔ مگر جب ایک موٹا فلس دار ہاتھ نمائش کے لئے رکھے ہوئے مال کی طرف بڑھا، دو بڑی بھونی ہوئی مکریل مچھلیوں کو ان کی بھوری تھوتھنیوں سے پکڑا اور ان کے سمیت غائب ہو گیا، تو میں جان گیا کہ ایلزا ابھی اندر تھی اور مجھے شام کے کھانے کا پتہ چل گیا۔

اس نے میری طرف قدرے حیرت کے ساتھ دیکھا۔ خریداری کا جالی دار تھیلا مجھے پکڑا دیا۔ اپنا کوٹ پہنا اور میرے بازو میں اپنا ہاتھ ڈال دیا اور وہ مجھے اس سمت میں دھکیلنے لگی، جس طرف ہمارا فلیٹ تھا۔ ہماری سڑک سے ذرا پہلے میں نے اس کے متواتر ریلے، اس نرم اور فطری دباؤ کے مقابلے میں ایک دوسرا دھکا لگا دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ کس طرح ہمارے جسم کسی قدر ایک دوسرے سے جدا ہونے لگے، ان کشتیوں کی مانند جو ایک جگہ رسی سے بندھی ہوں اور مختلف دھاروں میں آ جائیں۔ میں نے اس کی سخت مدافعت کو محسوس کیا، اس کی حیرانی کو۔ اور جب میں نے اس کا رخ کسی قدر زور لگا کر موڑا اور نمائش گاہ والی سڑک کو جانے پر مجبور کیا، تو وہ رک گئی اور حیرت سے میری طرف تکنے لگی۔

میں نے اسے رُم کی گولیوں والا سیلوفان کا لفافہ دیا، جسے اس نے شک کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے رکھا، بغیر اس میں سے کھانے کے۔ اس نے پوچھا "تمہارے پاس پیسے کہاں سے آگئے؟" اور میں نے کہا "ایک فن لینڈ کے رہنے والے نے ہمارا باورچی خانہ کرائے پر لیا ہے، صرف تھوڑے وقت کے لئے، بس عارضی طور

پر۔ شاید آج شام تک۔ اس نے پیشگی ادائیگی کر دی ہے"۔ بے اعتباری سے اس نے اپنا بازو کھینچ کر علیحدہ کر لیا۔ خریداری کے جالی دار تھیلے کی طرف ہاتھ بڑھایا، جسے میں نے اپنی پشت کے پیچھے چھپا رکھا تھا۔ ہتھیلیوں کو بیزاری کے ساتھ اپنے کانوں پر دبایا، جب ایک طیارہ کم بلندی پر ہمارے اوپر سے گذرا۔ "آؤ" میں نے کہا "ہم نمائش میں چلتے ہیں۔ بعد میں ہم کھانا کھانے چلیں گے اور پھر سینما میں"۔ ایلزا نے ایک ہاتھ جالی دار تھیلے کی طرف بڑھایا، جو میں نے اسے نہ دیا اور پوچھا "وہ ہمارے باورچی خانے میں کیا کرے گا؟ کیا وہ چولہے کو استعمال کرے گا؟ کیا تم نے صاف کر دیا تھا؟" ٹیکنیکل سکول کے طالب علموں کا ایک گروپ نمائش گاہ سے ہماری طرف آیا۔ ایلزا نے پھر میرے بازو میں بازو ڈال دیا اور میں نے کہا "فن لینڈ والا ایک سنجیدہ آدمی ہے۔ اس نے مجھے ساٹھ مارک پیشگی ادا کر دیئے ہیں۔ آؤاب، آج تم میری مہمان ہو۔ باقی ہر چیز کے لئے کافی وقت ہے"۔

تھوڑی دیر کے بعد اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ اس نے میری کلائی کو ٹٹولا اور اسے اپنی سرخی مائل انگلیوں کے ساتھ جکڑ لیا اور ہم بیکری کی نمائش کے گلاس کی چھت والے ہالوں میں چلے گئے۔ ہمارا استقبال حلوائیوں والی مسلی ہوئی ٹوپیاں پہنے ہوئے، لمبے ایپرن باندھے ہوئے اور پیستا رنگ کے پاجاموں میں ملبوس مردوں نے دروازے پر کیا۔ ہمیں ایک کھردرے کنکریوں والے رستے پر اوپر کی طرف بھیجا، دستی اشتہار پکڑائے۔ اشتہاری کتابچے "بیکری کی حقیقت" کے بارے میں وضاحتی بروشر۔ ایلزا نے اپنے رخسار کو میرے کندھے سے لگا لیا۔ رُم کی گولی کو دانتوں سے کاٹا۔ میں نے دیکھا کہ اسے دھیمی سنسنی کس قدر مزا دے رہی تھی، جس میں اسے مہمان نے ڈال دیا تھا، جس کے بارے میں اس نے مجھ سے بے شمار بار پوچھا تھا۔ نمائش کے شو کیسوں کے سامنے اس نے میرا بازو چھوڑ دیا۔ خوشی سے سرشار اور مشوش۔ ادھر ادھر بھاگنے لگی، بلا مقصد، ہکا بکا۔ اشارے کی انگلی کے سرے کو شیشے کے شو کیسوں کی دیواروں پر مارنے لگی۔ میرا نام بلند آواز سے پکارنے لگی۔ تیزی سے اشارے کرنے لگی۔ آگے نکل گئی۔ ایک نئی دریافت کی طرف، بیشتر اس کے کہ میں اس کے پاس پہنچتا۔ ایک بھاری بھرکم حلوائی کی طرف مسکرا کر دیکھنے لگی۔

چٹخارے لینے لگی ۔ کھلے بندوں پیٹ کو کھجلانے لگی ۔ پھر مجھے اشارے کرنے لگی ۔ مٹھائیوں سے بڑھ کر اسے کوئی چیز نہ بھاتی تھی ۔ جھاگ دار پیسٹری ، تہ دار کیک اور خستہ کیک ، شجر کیک کے چمکدار کنگرے ، جوزی مکھن دار کیک کی چپٹی شیرینی ۔ " محبت کی ہڈیاں " اور " نیگرو کے بوسے " ۔ حتیٰ کہ رسوائے زمانہ سرخ ، ہرے اور گلابی پھلوں کے زہریلے شیرین ٹکڑے ۔ بلکہ پھینٹی ہوئی ملائی کی بیمار سفیدی ۔ ہر چیز اس کو ایک الجھے ہوئے ولولے میں ڈھال رہی تھی اور لگتا تھا کہ وہ سب کچھ فوراً نگل جانا چاہتی تھی ۔ اس نے اپنا شک ، مجھ سے اپنی مایوسی بھلا دی تھی ۔ یہاں تک کہ ہم غیر ملکی مٹھائیوں کے ہال میں آئے اور اب فن لینڈ کی شہد کی سادی براؤن پیسٹری کے سامنے وہ میری طرف مڑی ۔ سیلوفان کے خالی لفافے کو مروڑا اور کہنے لگی " میں گھر جانا چاہتی ہوں ۔ کون جانے ہمارے باورچی خانے میں کیا ہو جائے ۔ فن لینڈ والا وہاں پر بالکل اکیلا ہے " ۔ " نمائش کے بعد ہم کھانا کھانے جائیں گے " میں نے کہا " تم نے مجھ سے وعدہ کر رکھا ہے " ۔ اس کے ملائم چہرے پر ، جو کوئی چیز چھپا نہ سکتا تھا ، تذبذب کے آثار نمودار ہوئے " اور اگر کچھ ہو گیا تو ؟ " اس نے پوچھا " اگر اس نے ہمارا باورچی خانہ کرائے پر لیا ہو ، صرف ...." اس نے ٹھنڈا سانس لیا ، میری طرف نظر جما کر اور استفساراً دیکھا ، مغموم سے مسکرائی ، گویا مجھے یہ بتانا چاہتی تھی کہ وہ ہر چیز کے لئے تیار تھی ، جب وہ اس غیر یقینی صورت حال پر قابو پا لے گی کہ اس کے باورچی خانے میں کیا ماجرا ہو سکتا تھا ۔ مگر میں نے کہا " پھر ہم پہلے سینما میں چلتے ہیں " ۔ وہ خاموش رہی اور شک سے اپنا پیچھا چھڑا سکنے کے بغیر ساتھ چل دی ۔

سینما میں گرمی تھی اور سیلن ۔ کاغذ ، جس میں مچھلیاں لپٹی ہوئی تھی ، چکنا ہونے لگا تھا ۔ میں نے جالی کے تھیلے کو فرش پر رکھ دیا ۔ فلم شروع ہو چکی تھی ۔ فلم ایک گانے والی کے بارے میں تھی ، جس کا خیال تھا کہ اس نے اپنی آواز کو ایک خاص موقعہ پر کھو دیا تھا ۔ اور جو اب کوشاں تھی اس کو ماضی کے ایک امید شکن سفر پر دوبارہ پانے کی ۔ جب تک وہ تلاش میں تھی ، ایلزا نے میرا ہاتھ تھامے رکھا اور میں اس کی انگلیوں کے بدلتے ہوئے دباؤ سے جان سکتا تھا کہ وہ اس تلاش میں کس قدر شامل تھی ، جو گانے والی کو مختلف قیمتوں کے ہوٹلوں میں ، مختلف آمدنیوں والے

مردوں کی طرف اور بالآخر ابرتسن کے ایک چھوٹے سے گرجا گھر میں لے گئی، جہاں پر آواز امید کے مطابق بحال ہو گئی۔ اس مقام سے آواز نے ہیرو کا رول کھیلنا شروع کر دیا۔

آہستہ آہستہ ایلزا کی انگلیوں کا دباؤ کم ہونا شروع ہوا۔ اور وہ ایکا ایکی بغیر ایک لفظ کہنے کے اٹھ کھڑی ہوئی، بغیر بتانے کے قطار میں سے دھکم پیل کرتی ہوئی گذری اور گیٹ کی طرف چل دی، جیسے اس کا مجھ سے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ میں نے اندھیرے میں جالی کے تھیلے کو تلاش کیا۔ نشست جھول کر پشت سے جا لگی۔ ایک دھیمی بڑبڑاہٹ اور رگڑ کی آواز ساری قطار میں سے گذر گئی اور راہداری میں پہنچنے تک میرے ساتھ گئی۔ ایلزا میرا انتظار سینما کے باہر والے ہال میں، جہاں پر ہوا کے جھونکے لگتے تھے، کر رہی تھی۔ ایک تیز جھٹکے کے ساتھ مجھ سے تھیلا لے لیا۔ اسے مال متاع کی طرح مضبوطی سے پکڑے ہوئے مجھے گردن سے اشارہ کیا اور مجھ سے آگے آگے سڑک کی طرف چل دی۔ میں نرم روی سے اس کے پیچھے چلتا رہا۔ اسے جالینے کی یا اسے نظر میں رکھنے کی میں نے کوئی سعی نہ کی۔ جبکہ وہ دھوپ کے سبب بے رنگ ہو جانے والے پتلے اوور کوٹ میں ملبوس، جس کے بٹن بند کرنا وہ بھول گئی تھی، ہمارے فلیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ ایک بحری جہاز کی دھند کی وسل پھر ایک بار بجی، قریب اور بے قراری کے ساتھ اور بالکل میرے عقب میں، یوں کہ میں نے مڑ کر دیکھا یہ سمجھتے ہوئے کہ جہاز کا اگا گیلی سڑک پر میری طرف آتا ہوا دکھائی دے گا۔ جہاز کا اگا ٹیلی فون پر لگے ہوئے حاجزوں تک پہنچنے والا۔ جب میں نے گھوم کر دیکھا، تو میری نظر تمباکو کی ایک دوکان میں ایک فلٹر والے سیگریٹ کے اشتہار پر پڑی۔ میں نے ٹسٹ کرنے کے لئے ایک پیکٹ خریدا۔ دوبارہ سڑک پر آیا۔ ایلزا کہیں پر دکھائی نہ دیتی تھی۔

پوسٹ آفس کے سامنے بچے ایک پاگل بوڑھے کو تنگ کر رہے تھے، جس کے پاجامے کی ایک لات میں سے ایک میٹر بھر لمبا گندا سا فیتہ باہر کو لٹک رہا تھا، جیسے جہاز کی بھول جانے والی رسی، جب وہ ہڑبڑاہٹ کے ساتھ اور دھمکیاں دیتے ہوئے بالشت بالشت اندر کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب کہ بچے اس کو پریشان

کر رہے تھے، اس طرح کہ وہ بار بار فیتے کے سرے پر پاؤں رکھ دیتے تھے۔ جونہی وہ ایک ٹکڑے کو اندر کھینچنے اور اپنے پاجامے کی لات کے نیچے ٹھونسنے میں کامیاب ہو جاتا تھا، تو ایک بھلا سا لڑکا جان بوجھ کر ابھی باہر لٹکنے والے سرے پر کود جاتا تھا۔ ایک جھٹکا سارے اکٹھے کئے ہوئے گولے کو باہر نکال لاتا تھا۔ بوڑھا بلا آواز دھمکیاں دیتا تھا۔ بلا آواز کام کرتا تھا۔ اس کے ہونٹ بلا آواز شکایت کرتے ہوئے ہلتے تھے۔ پھر ایک سپاہی آن نکلتا ہے اور اسے فیتے کو آرام کے ساتھ اندر کھینچنے کا موقع بہم پہنچاتا ہے۔ بوڑھا جنگلے کے سہارے پوسٹ آفس کی طرف چڑھ گیا اور میں جلدی کرنے کے بغیر اس مکان کر طرف گیا، جہاں پر ہم رہتے تھے۔ نیچے والے فلیٹوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور ہمسائے ان کے سامنے کھڑے تھے، جنہوں نے مجھے دیکھتے ہی بولنا بند کر دیا۔ غیر ارادی طور پر پیچھے ہٹ گئے اور جیسے خفیہ تصدیق میں سر ہلانے لگے۔ اور میں نے محسوس کیا کہ وہ آگے آگئے، جب میں سیڑھیوں پر چڑھا۔ قدم قدم میرا ساتھ دینے لگے اگلی منزل تک، جہاں پر بھی فلیٹوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ہمسائے سرگوشیوں میں کی جانے والی گفتگو سے الگ ہو جاتے تھے، جونہی وہ مجھے پہچان لیتے تھے اور قابو میں کی ہوئی دہشت کے ساتھ میرا پیچھا کرتے تھے۔ پہلی منزل پہ میں نے گیس کی بو کو سونگھا، جو تیز ہوتی گئی، جوں جوں میں اپنے فلیٹ کے قریب آتا گیا۔ ہمارے فلور پر ایک عورت میری طرف جھپٹی، اپنے ہاتھوں کو اٹھایا۔ اس کا ننھا سا منہ ایک چیخ کے لئے کھلا، مگر مجھے اس کی چیخ کا سننا یاد نہیں پڑتا۔ میں نے عورت کے چہرے سے ہٹ کر دوسرے چہروں کی جانب دیکھا اور میں راہداری کی مستقل ملگجی روشنی میں بھی ان کی خاموش حقارت کو دیکھ سکتا تھا۔ اپنے فلیٹ میں داخل ہونے سے پیشتر میں نے جان لیا تھا کہ وہ فن لینڈ والے کو اٹھا کر لے جا چکے تھے۔

ہائینز مولر

Heinar Müller

آئرن کراس

اپریل ۱۹۴۵ء میں میکلن برگ کے قصبے شارگارڈ کے ایک اسٹیشنری فروش نے اپنی بیوی، بیٹی اور خود کو گولی مارنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے گاہکوں سے ہٹلر کی شادی اور خودکشی کے بارے میں سنا تھا۔

وہ پہلی جنگ عظیم میں ریزرو آرمی آفیسر رہ چکا تھا اور اس وقت کا ریوالور اس کے پاس تھا اور دس گولیاں۔

جب اس کی بیوی شام کا کھانا لے کر باورچی خانے سے آئی، تو وہ میز کے پاس کھڑا ریوالور کو صاف کر رہا تھا۔ اس نے آئرن کراس کو کوٹ کے کالر پر لگا رکھا تھا، جیسے تہوار کے دنوں میں لگایا کرتا تھا۔

فیوہرر نے خودکشی کر لی ہے۔ اس نے بیوی کے سوال کے جواب میں کہا اور وہ اس کی وفاداری کو نبھائے گا۔ کیا وہ اس کی بیوی ہوتے ہوئے اس اقدام میں اس کی پیروی کرنے کے لئے تیار ہے۔ بیٹی کے بارے میں اسے شک نہیں تھا کہ وہ اپنے باپ کے ہاتھوں عزت کی موت مرنے کو بے عزتی کی زندگی پر ترجیح دے گی۔

اس نے بیٹی کو بلایا، جس نے اسے مایوس نہ کیا۔

بیوی کے جواب کا انتظار کرنے کے بغیر اس نے دونوں کو اپنے کوٹ پہننے کو کہا، کیونکہ وہ شورش برپا کرنے سے بچنے کے لئے انہیں شہر سے باہر کسی موزوں مقام پر لے جائیگا۔ اس نے ریوالور کو لوڈ کیا اور بیٹی سے کوٹ پہننے میں مدد لی۔ گھر کو تالہ لگایا اور چابی کو لیٹر بکس کی درز میں سے اندر پھینک دیا۔

جب وہ تاریک سڑکوں پر شہر سے باہر کی طرف جا رہے تھے، تو بارش ہو رہی تھی۔ مرد آگے تھا اور عورتوں کی طرف دیکھنے کے بغیر جا رہا تھا، جو کچھ فاصلے پر اس

کے پیچھے آ رہی تھیں۔ وہ ان کے قدموں کی چاپ کو سڑک پر سن رہا تھا۔

سڑک کو چھوڑنے کے بعد جنگل کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر اس نے شانے پر سے گھوم کر دیکھا اور جلدی کرنے کو کہا۔ درختوں سے عاری میدان اور تیز ہونے والی رات کی ہوا میں ان کے قدم بارش کے سبب گیلی زمین پر کوئی آہٹ پیدا نہ کر رہے تھے۔

اس نے انہیں پکار کر کہا کہ وہ اس سے آگے چلیں۔ ان کے پیچھے چلتے ہوئے وہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آیا اسے ان کے بھاگ جانے کا خطرہ تھا یا وہ خود بھاگ جانا چاہتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ بہت آگے جا چکی تھیں۔ جب وہ اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیئں، تو اس نے جان لیا کہ اسے بھاگ جانے سے ڈر لگتا تھا۔ اور اس نے چاہا کہ وہ بھاگ نکلیں۔ وہ رک گیا اور اس نے پیشاب کیا۔ ریوالور کو اس نے پینٹ کی جیب میں ڈال رکھا تھا، جو پتلے کپڑے کے اندر سے ٹھنڈا لگ رہا تھا۔ اور جب وہ عورتوں کو پانے کے لئے تیزی سے چلا، تو ریوالور ہر قدم پر اس کی ٹانگ پر لگتا تھا۔ اس نے رفتار کو کم کر دیا۔ مگر جب اس نے ریوالور کو پھینک دینے کے خیال سے جیب میں ہاتھ ڈالا، تو اسے اس کی بیوی اور بیٹی دکھائی دیں۔ وہ رستے کے بیچوں بیچ کھڑی تھیں اور اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

وہ واردات تو جنگل میں کرنی چاہتا تھا، مگر اس بات کا خطرہ کہ گولیوں کی آواز کو کوئی سن لے گا، اس جگہ پر بھی کچھ ایسا زیادہ نہ تھا۔

جب اس نے ریوالور کو ہاتھ میں لیا اور اس کو چلانے کے لئے تیار ہوا، تو اس کی بیوی سسکتی ہوئی اس کے گلے سے چمٹ گئی۔ وہ خاصی بھاری تھی اور اسے اپنے آپ کو چھڑانے میں خاصی دقت ہوئی۔ وہ اپنی بیٹی کی طرف گیا، جو اس کی طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے تک رہی تھی، ریوالور کو اس کی کنپٹی پر رکھا اور آنکھیں بند کر کے لبلبی دبا دی۔ اس کو امید تھی کہ گولی نہیں چلے گی۔ مگر اس نے گولی کی آواز کو سنا اور لڑکی کو لڑکھڑاتے اور گرتے ہوئے دیکھا۔

عورت کانپ رہی تھی اور چیخیں مار رہی تھی۔ اسے اس کو تھامنا پڑا۔ کہیں تیسری گولی کے بعد جا کر وہ خاموش ہوئی۔

اب وہ اکیلا تھا۔

وہاں پر کوئی شخص موجود نہ تھا، جو اسے ریوالور کو اپنی کنپٹی پر رکھنے کا حکم دیتا۔ لاشیں اسے نہیں دیکھ رہی تھیں، کوئی بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ تھیٹر کھیلا جا چکا تھا۔ پردہ گر چکا تھا۔ اب وہ جا کے اپنا میک اپ اتار سکتا تھا۔

اس نے ریوالور کو جیب میں ڈال لیا۔ اور اپنی بیٹی پر جھکا۔ پھر اس نے بھاگنا شروع کر دیا۔

وہ پگڈنڈی سے سڑک تک بھاگتا ہوا گیا۔ پھر سڑک کے ساتھ ساتھ، مگر شہر کی سمت میں نہیں، بلکہ مغرب کی جانب۔ پھر وہ سڑک کے کنارے پشت کو ایک درخت سے ٹیک کر بیٹھ گیا اور اپنے بارے میں سوچنے لگا۔ گہرے سانس لیتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کا معاملہ کچھ ایسا ناامیدی کا مرقع نہ تھا۔

اسے صرف آگے کی طرف چلتے جانا چاہیئے، مغرب کی جانب۔ قریب کی آبادیوں سے کتراتے ہوئے۔ کہیں نہ کہیں اسے چھپنے کا موقعہ مل جائیگا۔ شاید کسی بڑے شہر میں، ایک نئے نام کے تحت۔ ایک بے نام مہاجر، متوسط اور محنتی۔

اس نے ریوالور کو سڑک کی نالی میں پھینک دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ چلتے ہوئے اس یاد آیا کہ اسے آئرن کراس کا پھینکنا بھول گیا تھا۔ اس نے اسے اتار پھینکا۔

۱۲۷

ماریو سنیشی

Mario Szenessy

بطخوں سے میری توبہ

مندا، مندا، بہت مندا ہے ان دنوں کاروبار۔ اور پتلا، بہت پتلا ہے کریانے والے کا حال۔ سلسلہ وار دوکانیں اور سپر مارکیٹیں اس کو گھیرے ہوئے ہیں۔ اور ڈیسکونٹ والی دوکانیں اس کو چھٹی کا دودھ یاد دلا رہی ہیں۔ میں نے یہ سب کچھ آتے ہوئے دیکھا تھا، بیس برس ادھر اور جب انا کہتی تھی: "آلبرٹ، جانی تم چکی پانی والی کوٹھڑی میں پہنچ کے رہو گے۔ جوہری کی ایک اور دوکان بارسیلونا میں اور فر کی ایک اور فرم نیاپل میں اور وہ تمہیں زبردستی پکڑ کر لے جائیں گے"۔ تب میں کہتا تھا: "میری کھانڈ کی گڑیا، میری آفتاب کی کرن۔ آؤ میرے پاس پلنگ پہ، پھر تمہیں ایسے بھوت نظر نہیں آئیں گے اور تمہاری طبیعت بہل جائے گی"۔

یوں کہتا تھا میں اسے اور سدا اس کا دل بہل جاتا تھا۔ اور میں اگلے روز نیاپل کے لئے روانہ ہو جاتا تھا یا بارسیلونا کے لئے۔ اور نئی دوکان کا افتتاح ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ کرتا تھا۔ ملازم میں شروع سے ہی اپنے اپنے فن کے ماہرین کو رکھتا تھا' ذکاوت اور ذہانت کے پتلوں کو۔ انہیں تنخواہیں بھی میں ابتداء سے ہی عام تنخواہوں سے چار گنا دیتا تھا، پورا سال۔ بونس اور کرسمس کی گریجویٹی کا تو خیر میں یہاں پر ذکر ہی نہیں کرتا۔ انہیں بس تھوڑا سا اوور ٹائم کام کرنا ہوتا تھا۔ اور سال کے سال دو ہفتوں کے ایک اسپیشل کورس میں حصہ لینا ہوتا تھا۔ کبھی لاگو ماجورے میں، کبھی کوستا اسمیرالڈا پہ۔ میں اس بات کا ہمیشہ خیال رکھتا تھا کہ وہ نت نئی جگہیں دیکھیں دن میں انہیں بس تین گھنٹے ایک کلاس میں جانا ہوتا تھا۔

"آلبرٹ" میری بیوی کہتی تھی، جب کبھی میں برلن یا شٹوٹگارٹ کی ٹکنیکل یونیورسٹی کے کسی پروفیسر سے رابطہ قائم کرتا تھا۔ "آلبرٹ، جانی بات بگڑ جائے گی،

گارنٹی لے لو کہ بات بگڑ جائے گی۔ میں تو اسے آتا ہوا دیکھ رہی ہوں۔ مجھے نظر آرہا ہے کہ تم اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن جیل کی کوٹھڑی میں گزاروگے"۔

"انا، کھانڈ کی گڑیا" میں کہتا تھا "خواہ مخواہ اپنا جی ہلکان نہ کرو۔ آؤ ہم پلنگ پہ لیٹتے ہیں۔ پھر تمہیں اچھی اچھی باتیں سوجھیں گی"۔ اور دوسرے روز پروفیسر سے بات کرنے اور معاوضہ طے کرنے کے لئے میں نے شٹوٹگارٹ کا سفر کیا۔

ڈوبرونک میں مزے تھے، سپلٹ میں بھی اور کوسٹا دیل سول پر بھی۔ میں سویرے سویرے کانفرنس ہال میں جھانکتا تھا۔ بس ذرہ سی دیر کے لئے، یہ دیکھنے کی خاطر کہ کوئی سویا ہوا تو نہیں رہ گیا تھا۔ پروفیسر سنجیدگی کی تصویر بنا کانفرنس کی میز کے ایک سرے پر بلیک بورڈ کے سامنے کھڑا ہوتا تھا اور کہتا تھا: "معزز خواتین و حضرات: ہمارا آج کا موضوع بہت اہم ہے۔ آج ہم کلارک ڈوموں آلارم سسٹم پر گفتگو کریں گے"۔ میں اتنے میں باہر نکل کر پیاری انا کے پاس پہنچ جاتا تھا اور کہتا تھا: "آؤ میری جان، اب ہم کار میں سوار ہو کر سیر کو چلتے ہیں۔ اس کے بعد ہم گھر جائیں گے اور پلنگ پر لیٹیں گے تاکہ تمہیں اور قسم کی باتیں سوجھیں"۔

اور میری پیاری، میری اچھی انا سیر کے لئے جانے، آثار قدیمہ یا آرٹ گیلری کو دیکھنے اور بعد میں پلنگ پر لیٹنے پر آمادہ ہو جاتی تھی، تاکہ اسے اور قسم کی باتیں سوجھیں۔

دوسرے روز مجھے کسی قدر دیر ہو گئی۔ میں لیکچر کی ابتداء کے وقت پر نہ پہنچ سکا۔ لیکچر کے عین بیچ کانفرنس ہال میں آن ٹپکا۔ میرے کانوں میں پڑا: "سب سے اہم چیز خواتین و حضرات ایک چھوٹا سا برقی رو کی مزاحمت کرنے والا پردہ ہے، دو او ہم کا۔ آپ کو اسے سب سے پہلے تلاش کر کے فیوز کر دینا چاہیئے"۔ یہ سلسلہ دو ہفتوں تک چلتا رہا۔ اس کے بعد میرے کارندوں نے مزید دو ہفتے صحت کی بحالی کی خاطر خوبصورت ساحلی مقامات پر گزارے۔ پھر دھوپ میں بھوری کی ہوئی چمڑیوں کے ساتھ، خوش باش اور علم و ہنر سے لدے پھندے اپنے گھروں کو مائی لینڈ، ہنوور یا اوٹریشٹ کو سدھارے۔

میں بھی مطمئن اور بہت سی خوش آئند امیدوں کے ساتھ روانہ ہوا۔ بس انا

ذرا چڑچڑی سی اپنے کونے میں دبکی بیٹھی رہی۔ میں نے ویانا اور زالزبرگ کے درمیان کسی جگہ پر کار روکی اور اسے کہا: "فکر مندی سے اپنے بال چٹے نہ کرو، میری کھانڈ کی گڑیا۔ ہم یہاں پر تھوڑی دیر کو رک جاتے ہیں اور ایک چھوٹا سا آرام دہ ہوٹل ڈھونڈتے ہیں اور فوراً پلنگ پر لیٹتے ہیں تاکہ تمہیں اور قسم کی باتیں سوجھیں۔"

"تم چور ہو آلبرٹ" اس نے کہا "ایک روز راز کھل جائے گا۔ تم جیل میں پہنچو گے اور میں تمہارے بغیر کیا کروں گی؟ میں وسط دسمبر میں اپنی بہن کے پاس امریکہ چلی جاؤں گی۔ میں اس کرسمس پہ ان مسلسل ٹیلی فون کالوں کو برداشت نہیں کر سکتی۔ میرے اعصاب جواب دے چکے ہیں۔ میں تباہ ہو جاؤں گی"۔

"انا، انا، میری کھانڈ کی گڑیا، میری گلہری، وہ رہا ہوٹل۔ آؤ ہم کمرے میں چلتے ہیں۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے، جیسا کہ ڈاکٹر نے کہا ہے... آرام، آرام اور پھر آرام... اگر تم امریکہ چلی جاؤ گی، تو مجھے کون تسلی دے گا۔ اور میرے ساتھ بستر میں کون گھسے گا لمبی رات کے اختتام پر، آخری ٹیلی فون کال کے بعد، جس کا پیغام یقیناً ہو گا: یہاں کولون میں سب ٹھیک ہے چیف؟"

اس نے مجھے چور کہا ویانا اور زالزبرگ کے درمیان، اس دلفریب رستے پر۔ اور میں سچ مچ چور ہوں۔ میں اس کا انکار نہیں کرتا۔ مگر میں اس کے سوا کر بھی کیا سکتا ہوں۔ آج کل کے حالات کے پیش نظر۔ ان سلسلہ وار دوکانوں اور میل آرڈر بزنس اور سپر مارکیٹوں کے ہوتے ہوئے؟ میں کیوں کر اپنی دوکان چلا سکتا ہوں۔ اور اپنے ملازموں کو اونچی تنخواہیں دے سکتا ہوں۔ پروفیسروں کو، جو ایک کورس کی فیس دس ہزار مانگتے ہیں اور تعطیلات کے شاندار ہفتوں کو ڈوبرونک، سپلٹ یا کوسٹا دیل سول اور دوسری چیزوں کو ایک طرف رہنے دیں؟

ابھی چند دن قبل میں نے دکنی پھلوں کے ایک کاروباری کے ساتھ بات کی، اور آپ کی کیا رائے ہے کہ اس نے کیا کہا؟ یہ کہ وہ برباد ہو چکا ہے۔ امریکنوں نے اس کا کیلے کا کاروبار تباہ کر دیا ہے، کیونکہ وہ اپنے کاروباری معاہدے اس کی بجائے سلسلہ وار دوکانوں کے مرکزی آفس سے کرتے ہیں۔ ہوں، میں نے سوچا: پھر وہی

سلسلہ وار دوکانیں ۔ مجھے اس غریب پر ترس آگیا۔ اس کا کہنا ہے کہ خوش قسمتی سے وہ کچھ وقت گزار سکتا ہے۔ کیونکہ خطرے کو بھانپتے ہوئے کچھ سال قبل اس نے شہد کا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ وہ اسے مشرقی یورپ سے درآمد کرتا ہے۔ شہد، آپ کو بتاؤں، نکڑ والی کریانے کی دوکان والا کیا کرتا ہے؟ وہ کھانڈ کو جوش کھاتے پانی میں گھول لیتا ہے۔ اس میں کچھ دودھ کی ترشی ڈالتا ہے اور پھر اس جوشاندے میں چند ملی گرام خوشبو ڈال دیتا ہے۔ اس طرح اسے بغیر درآمدیوں کے واسطے کے خالص اور بہترین شہد مل جاتا ہے۔ مجھے وہ یہ شہد رعایتی بھاؤ پر دیتا ہے۔ اور میری بھلے لوگ انا کو آج تک پتہ نہیں چلا کہ ہم ناشتے میں بناوٹی چیز کھاتے ہیں۔ وہ تو اصرار کرتی ہے:

"میرے پیارے اس مزیدار شہد سے اور لو۔ یہ تقویت دیتا ہے اور جسم کو فربہ نہیں کرتا۔ میں تو سدا سے قدرتی چیزوں کی قائل ہوں"۔

چور... مگر عادی قسم کا نہیں، نہ ہی جیب کترا، جو اسٹیشنوں پر گھومتا ہو۔ نقابوں اور پستولوں والا بدمعاش بھی نہیں۔ نہ ہی سخت دل۔ نہ ایسا، جو اپنے بھائی بندوں کا ایک بال بھی۔ بیکا کرتا ہو۔ میں نہ تو دیوالیہ ہوں، نہ ایسا شخص، جس نے اپنی زندگی تباہ کر لی ہو۔ منگتا بھی نہیں، جو چوری کے مال کے بیوپاریوں کو اپنی ہڈیوں کا گودا تک چوسنے دیتا ہو۔ چوری کے مال کے بیوپاری ہی تو تھے، جن سے میں نے یہ آئیڈیا لیا تھا، بیس برس قبل۔ جب میں کولون میں اپنی جواہرات کی دوکان میں بیٹھا تھا... میں پیشے کے اعتبار سے جوہری اور سنار ہوں... ہاں ہاں مجھے خوب علم ہے کہ سونے سے کیا کچھ بناتے ہیں۔ اور نگینے کیسے جڑے جاتے ہیں۔ نیلے، سرخ اور ہرے رنگ والے۔ بالخصوص ہرے رنگ والے زمرد، جن کو میں ہر دوسری چیز سے بڑھ کر پسند کرتا ہوں۔ جب میں کسی ایسے خوبصورت، بڑے اور چمکتے دمکتے زمرد کو دیکھتا ہوں، تو میرے معدے میں کھلبلی مچ جاتی ہے۔ دل دھڑکنے لگتا ہے۔ انگلیوں میں کھجلی شروع ہو جاتی ہے۔ سچ مچ یہ احساس تقریباً ویسا ہی ہے، جیسے جب میں اپنی پیاری انا کے ساتھ پلنگ پہ پسرتا ہوں۔ تب میرے دماغ میں اوپر نیچے ہونے لگتا ہے، اور میرے اعصاب میں کھینچا تانی شروع ہو جاتی ہے۔ تب میں قدرت کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں۔ اس زبردست مگر مہربان قدرت کے حضور، جو ایسے پتھروں کو جنم

دیتی ہے ۔ یہ سچ مچ کے قدرت کے شاہکار... اور پھر یہ پہاڑ ہیں اور دریا، جو پیدا کرتے ہیں ان بھنبھنانے والی شہد کی مکھیوں کو نہیں اور نہ ہی نکڑ والے بیوپاری کو... اس طرح بیٹھا ہوا تھا میں ۱۹۵۰ء میں اپنی کولون والی جواہرات کی دوکان میں ۔ چھ کلائی بند، پچیس انگوٹھیاں، تین گلے بند سنبھالے اور خالی معدے کے ساتھ ۔ کیونکہ ان دنوں ہمارے پاس کچھ نہیں تھا ۔ نہ تو ناشتے میں شہد اور نہ ہی بہت سے پلنگوں اور صوفوں والا مکان، جو ایک جوہری کے شایان شان ہوتا ہے ۔ تب ایک چیتھڑوں میں ملبوس بوڑھا آیا ۔ منہ میں شراب کے بھبکے لئے، آنکھیں مچکاتا ہوا اور اپنے آپ کو اس قدر اہمیت دیتا ہوا، جیسے وہ بذات خود روٹ شیلڈ ہو... پھر اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ٹھونسا اور ایک گدلا سا کاغذ نکالا اور اس میں سے ایک انگوٹھی برآمد کی میرا سانس رکے کا رکا رہ گیا اور لہو میں جوش آگیا ۔ ایک بڑا زمرد اور دو ہیرے، جو انگوٹھی پر کسی ننھے پرندے کی طرح چہچہا رہے تھے ۔ اور میرا دل مرجھا گیا، کیونکہ مجھے پتہ تھا کہ انگوٹھی چوری کا مال تھی ۔ اور یہ کہ مجھے اسے بوڑھے سے نہیں خریدنا چاہیئے اور یہ بھی کہ میں اسے کوڑیوں کے مول لے سکتا تھا ۔ مگر یہ کہ مجھے اسے ہاتھ تک نہ لگانا چاہیئے ۔ بوڑھا روتا دھوتا رہا کہ وہ اچھا سودا کرنا چاہتا تھا، مگر بیوپاریوں کے ساتھ اس کی بات نہیں بن سکی تھی، کیونکہ وہ اسے جانتے تھے ۔ اس لئے انہوں نے اسے صرف ایک سو کی پیش کش کی تھی ۔ اگرچہ انگوٹھی دوستی کے سودے میں بھی کئی ہزار مارک کی مالیت رکھتی تھی ۔ نہیں انگوٹھی میں نے اس سے نہیں خریدی ۔ مگر جب میں نے اس کے سبز لشکارے کو دیکھا، اس سمندر کے چمکارے کو، اس جنگلوں اور تند خو دریاؤں کے پیغام کو، تو مجھے ایک بات سوجھی ۔ یہ بیوپاری ہی تو تھے، جو جواہرات کے کاروبار کے مندے کا سبب تھے ۔ انہیں جواہرات سال ہا سال تک پوشیدہ رکھنے پڑتے تھے یا وہ انہیں ماہر جوہریوں کو دکھاتے تھے، جو اول تو لیتے نہ تھے اور اگر خریدتے تھے، تو اصل مالیت کا محض ایک معمولی سا حصہ دیتے تھے ۔ بیوپاریوں کو، جو چوروں اور جوہریوں کے درمیان حائل تھے، الگ کرنا ضروری تھا ان کے بغیر جوہریوں کا کاروبار پھر سے چل نکلے گا ۔ سنار کا ہونا بھی ضروری تھا، کیونکہ صرف وہ زیور کی شکل وصورت کو بدل کر پولیس کی دسترس سے بچا سکتا تھا ۔

اس روز میں خوشی سے سرشار اپنی انا کی طرف گھر گیا اور دل بھر کر آلو کا بھرتہ کھایا اور سیب کی کھیر۔ اور جب بعد میں ہم پلنگ پہ لیٹے ہیں، اپنے اکلوتے پلنگ پہ، جو اس زمانے میں ہمارے پاس تھا اور جب میں نے اپنی انا کو قلابے میں لے کر پیار کیا اور دھرے سے اس کی گود میں اترا، تو مجھے ایک دوسری بات سوجھی۔ صرف بیوپاری کو ہی الگ کرنا کافی نہ تھا، بلکہ بیوپاری اور چور کو ایک ہونا چاہیئے۔ گویا ماہر جوہری اور چور کی وحدت ضروری تھی۔ اور جب بوڑھا اپنے بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس دوسرے روز پھر میرے پاس آیا اور انگوٹھی خریداری کے لئے پیش کی، تو مجھے اہم ترین بات سوجھی۔ "باباجی" میں نے پوچھا "تم نے خوبصورت انگوٹھی کہاں سے چرائی ہے؟"

"اسٹیشن والے ہوٹل سے۔ اور کہاں سے چراتا" اس نے کہا۔ تب میں جان گیا کہ مقام واردات اور بیچے جانے والے مقام کو ایک دوسرے سے کئی سو کلو میٹر دور ہونا چاہیئے۔ جواہرات، جنہیں انسان کولون میں چراتا ہے، انہیں لزبن یا اوٹریشٹ میں بیچنا چاہیئے۔

تین سال لگے مختلف ملکوں میں قرض حاصل کرنے، دوکانیں کھولنے اور مناسب کارندے حاصل کرنے میں، تب جا کے اس خیال کو عملی جامہ پہنایا جا سکا۔ ان تین سالوں کے دوران، اس بات کا میں اقرار کرتا ہوں، مجھے خود ہاتھ لگانا پڑتا تھا تالوں کو توڑنا، شو کیسوں کو خالی کرنا، سیفوں کو کھولنا۔ ان دنوں مجھے خود گلے بندوں، بازو بندوں اور انگوٹھیوں کی شکل وصورت کو بدلنے میں ہاتھ بٹانا پڑتا تھا۔ مگر آگے چل کر یہ کام دوسرے لوگوں نے سنبھال لیا۔ میں گھر پہ بیٹھتا ہوں اور مختلف ملکوں سے ٹیلی فون کالوں کا انتظار کرتا ہوں۔ میرے کارندے خود بخود کام کرتے ہیں اور مجھ سے انڈی پنڈنٹ۔ میینا والے اپنے ساتھیوں کو نہیں جانتے۔ بس کبھی کبھار یہ ہوتا ہے کہ آلارم کے ماہرین اپنے تربیتی کورسوں کے علاوہ کسی دوسرے کام کے سلسلے میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ میں نے پانچویں دہائی میں فر کے کام کو بھی اپنے کاروبار میں شامل کر لیا تھا، اپنی انا کی وارننگ کے باوجود۔ وہ ان دنوں بے حد ناخوش تھی۔ ہمارے میاں بیوی کے تعلقات میں ایک کرائسس سا

آگیا تھا۔ مگر ہم اس سے بغیر حرج یا نقصان کے بچ کر نکل آئے۔ ہماری شادی بھی اور ہماری دوکانیں بھی۔ ان دنوں میں ہمارا شہد کا استعمال بے حد بڑھ گیا تھا۔ اس وقت سے میں ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو ایک پوری بالٹی گھر لاتا ہوں۔

اس وقت سے ہمارا کاروبار خوب چل رہا ہے۔ اور یورپ بھر میں انا کے ساتھ ہمارے بہت سے پلنگ ہیں اور ہم ہر سال اپنے سارے پلنگوں کے لئے نئے گدے خرید سکتے ہیں۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ ہماری کامیابی کا راز کیا ہے؟ سوائے کرسمس کے تہوار کے اور کچھ نہیں۔ صرف یہ مبارک راتیں ہیں، جن میں بہت کچھ ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے، جو عام حالات میں ممکن نہیں۔ اس رات کو دوکاندار اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ اور اپنے بچوں میں تحفے بانٹتے ہیں۔ اس وقت ان کے دماغوں میں سوائے خاندان کے، موم بتیاں روشن کرنے کے، کھانا کھانے اور شراب پینے کے کچھ نہیں ہوتا۔ ان کی بیویاں بطخوں کو رسیوں سے باندھ کر بالکنیوں پر لٹکا دیتی ہیں، تا کہ انہیں خوب ٹھنڈ لگے اور کرسمس کے پہلے روز زبان پر مکھن کی طرح پگلیں۔ ان دنوں میں ملک بھر میں چسکارے لئے جاتے ہیں اور ہر کوئی منہ کے ذائقے سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے۔ باپ فرش پر لیٹے بچوں کی گاڑیوں کی لائینیں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑنے میں ہاتھ بٹا رہے ہوتے ہیں۔ اس وقت برف سے ڈھکے ہوئے گھروں میں امن و امان کا سماں ہوتا ہے۔ صرف ہمارے کارندوں کی ٹولیاں اپنے پنجوں کے بل چل رہی ہوتی ہیں۔ سب سے آگے آلارم کے ماہرین ہوتے ہیں، پھر سیفوں کو کھولنے والے، پھر بوریوں والے اور سب سے آخر میں آدمی، جنکا کام پہرہ دینا ہوتا ہے، مثال کے طور پر لزبن سے ایک گروپ کولون آتا ہے۔ اور ماہرین کی جیب میں آلارم سسٹم کے نقشے ہوتے ہیں، جن کو نیاپل والے گروپ نے دیکھا بھالا ہوتا ہے، اور تمام جزئیات تک درج کی ہوتی ہیں، دوکانوں کے تعمیری نقشوں سمیت۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں کام ختم ہو جاتا ہے۔ اور سارا گروپ اسی رات کے اندر اندر سرحد عبور کر جاتا ہے۔ ہمارے پاس تیز رفتار کاریں ہیں۔ بہت تیز رفتار کاریں، جو خالی آٹو باہنوں پر اڑتی چلی جاتی ہیں۔ صرف چند لمحوں کے لئے سرحد پر رکتی ہیں اور اپنی

بیرکوں میں سے نیند سے بوجھل آنکھوں کو ملتے ہوئے نکلنے والے کسٹم کے کارندوں کے ساتھ بے حد خوش اخلاقی سے پیش آتے ہیں ۔ اور فوراً تمام سوٹ کیسوں کو کھولنے کی پیش کش کرتے ہیں ۔ اور ان کے تالوں کو کھولنے لگتے ہیں ۔ مگر کسٹم والے اشارہ کر کے روک دیتے ہیں ۔ پاسپورٹوں پر ایک تھکی ہوئی سی نظر ڈالتے ہیں، اور کہتے ہیں: "اوانتی" ۔ "وائٹر فاہرن" یا بعض اوقات "جاؤ جہنم میں" "یا" دے پیشے وو، ساوانائیگے بیاں تو" ۔

صبح تک تقریباً ہر کوئی اپنی اپنی منزل پر ہوتا ہے اور مجھے کسی ٹیلی فون بوتھ سے فون کرتے ہیں: "یہاں پر ہلورشم ہے ۔ سب ٹھیک ہے، چیف" اور اپنے اپنے بستروں پر دراز ہو جاتے ہیں ۔

اس قدر آسان بات ہے ۔ پہلے کسی کو ایسی بات سوجھنی چاہیئے اور عمدہ عمدہ تجویزیں دماغ میں آنی چاہیئں ۔ آدمی کو اس بات کا تجربہ ہونا چاہیئے کہ کرسمس کس قدر دلکش ہوتی ہے اور کرسمس کی رات کس قدر خاموش ۔ اور پھر معدے کی کیسی خوش آئند امیدیں وابستہ ہوتی ہیں مکھن کی طرح نرم کرسمس کی بطخ کے ساتھ، جو رسی پر لٹک رہی ہوتی ہے ۔ تب جا کر چودہ طبق روشن ہوتے ہیں اور آدمی اپنے کارندوں کو پنجوں کے بل دوڑاتا ہے، چھتوں پر چڑھاتا ہے، دیواروں میں سے پار کرواتا ہے اور آلارم کے آلات کے اندر چلنے والی بجلی کی رو کو تلاش کرنے پر لگاتا ہے، چمٹیوں، ویلڈنگ کے آلات، ٹرانسسٹروں اور ایمپیر میٹروں کے دھندے میں ڈالتا ہے ۔ چمکتے دمکتے زیورات یا فروں کے ساتھ بوریوں کو بھرواتا ہے، جو راتوں کو تارے سے چھوڑتی ہیں ۔ اور پھر ان سے سرحدیں عبور کرواتا ہے ۔ سوئے ہوئے کسٹم کے کارندوں کے پاس سے گزارتا ہے ۔ آٹو باہنوں پر پوری رفتار سے اڑنے اور دھند میں ہمیشہ کے لئے گم ہونے دیتا ہے ۔ پھر جنوری میں دلچسپ کام سونے کو پگھلانے کا، جواہرات، ان سرخ، سبز، نیلے الماسوں اور ہیروں کی پڑتال کا ۔ ہم جنوری میں انا سمیت سفروں پر نکل کھڑے ہوتے ہیں ۔ فروں اور ہیروں کو چھوتے ہیں اور مالوں کے ڈھیروں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں ۔ اور ہر روز کسی دوسرے شہر میں پلنگوں پر دراز ہوتے ہیں ۔ ہماری تلاشی کسٹم والے جب تک چاہیں لیتے پھریں ۔ انہیں کچھ

نہیں ملے گا۔ اور انٹرپول کو پیچھے لگانے والے ہمارے پاس زیادہ سے زیادہ شہد کی ایک بالٹی پائیں گے۔ اور وہ ذاتی استعمال کے لئے ہے۔ اس لئے تجارتی مال نہیں ہے۔ ہمیں البتہ اسے ہمیشہ ساتھ لے جانا پڑتا ہے۔ کیونکہ کسی جگہ ایسا عمدہ شہد نہیں ملتا، جیسا ہمارے نکڑ والے دوکاندار کے ہاں سے۔ کسی دوسری جگہ اس کا ذائقہ اس قدر قدرتی نہیں ہوتا، جتنا اس کے شہد کا۔

قدرتی بات ہے کہ بعض اوقات گڑ بڑ بھی ہو جاتی ہے۔ پانچ برس ادھر ہمارے ہلورشم کے کارندوں نے بارسیلونا کے گروپ کی تیاری کے کام کی روشنی میں نیاپل میں ہماری اپنی دوکان کو لوٹ لیا، آخری انگوٹھی تک۔ اور مجھے اطالوی پولیس کو اس بات کی وضاحت کرنی پڑی کہ میں نے انشورنس کیوں نہیں کروا رکھی تھی۔ پولیس والے اکثر عقل کے بودے ہوتے ہیں، مگر یہ اطالوی اس سلسلے میں سب کا نمبر کاٹتے ہیں۔" بالآخر معاملہ خراب ہو گیا۔ بالآخر معاملہ بگڑ گیا۔ میں نے ہمیشہ کہا تھا" ۔ انا رونے لگی اور مجھے مشکل پڑ گئی۔ یہاں تک کہ میں اسے کسی ماہر نفسیات کے پاس لے جانے والا تھا۔

تین برس قبل ہمیں ایک اس سے بڑی مصیبت نے آن گھیرا۔ بہت بڑی مصیبت۔ میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ کہاں پر۔ بس اتنا کہوں گا کہ اس ملک میں جہاں پر لوگ نئے سال کے روز بطخیں کھاتے ہیں۔ لزبن والے گروپ نے کام کو اکتوبر میں مکمل کیا اور کولون والوں نے واردات کی۔ فروں کو چرانا تھا اور کاغذات میں صرف لکھا تھا: " سارا مال ٹرک میں لادا جائے" ۔ تمام کاغذات ٹھیک ٹھاک تھے۔ اور اس صورت حال سے نپٹنے کے لئے کہ کسٹم والے پیچھا نہ چھوڑتے ہوں، لکھا تھا کہ اتنی تعداد میں فروں کو نیاپل لے جایا جا رہا تھا۔

مگر انسان سوچتا ہے اور خدا کاموں کا رخ موڑتا ہے۔ فر والے کاروباری نے نومبر کے اوائل میں دیوالیہ نکال دیا تھا۔ اور گودام کو خالی کر کے سامان خورد و نوش کے ایک بیوپاری کے حوالے کر دیا تھا، جس نے ساری جگہ کو ریفریجریٹروں اور فریزروں سے اٹ دیا تھا۔ اور انہیں اوپر تک ڈیپ فریزڈ بطخوں سے بھر دیا تھا۔ کولون والے گروپ کو حیرت ضرور ہوئی اور اس نے پھر ایک بار آرڈر کے کاغذات کو

دیکھا (مگر بد قسمتی سے ٹرک کے کاغذات پر نظر نہ ڈالی) اور ساری بطخوں کو ٹرک میں لاد دیا۔

اور ٹرک چل دیا۔ اگرچہ اس قدر سرعت کے ساتھ نہیں، جیسے ہماری پورشے اسپورٹس کاریں۔ ٹرک خالی آٹو باہنوں پر بھاگتا چلا گیا اور سرحدوں کو بھی پھلانگتا گیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ کسٹم والے ایسے وقتوں میں اپنی ڈیوٹی کس طریق سے ادا کرتے ہیں۔ اگر انہوں نے ٹرک کے کاغذات کو دیکھا ہوتا، جن میں لکھا تھا کہ اتنی تعداد میں منک کی سمور اور اتنی تعداد میں چنچلا کی فریں وغیرہ وغیرہ.... اور اگر انہوں نے عقبی پٹھے کو کھولا ہوتا، تو ان کی عقل پر پڑا ہوا پردہ ہٹ جاتا۔ کیونکہ ٹرک فروں سے نہیں، بلکہ ڈیپ فریزڈ بطخوں سے بھرا ہوا تھا۔ مگر کسٹم والوں نے کچھ کیا ہی نہیں!

ستم بالائے ستم یہ کہ اس سال موسم سرما بے حد گرم تھا، بالخصوص پہاڑوں میں۔ اس بات نے ہماری فرم کو بہت بڑا دھچکہ پہنچایا۔ سوئیزرلینڈ کے بیچوں بیچ خون آلودہ پانی ٹرک میں سے رسنے لگا۔ اور ہمارے کارندوں کو فوراً ٹرک کو چھوڑ کر ایک غیر آباد جنگلی علاقے کا رخ کرنا پڑا۔

اس عرصے میں ہم اپنی پیاری انا کے ساتھ ایک عادل کی نیند سو رہے تھے۔ اور خواب دیکھ رہے تھے خوبصورت بیش قیمت پتھروں کے اور ڈھیروں سونے کے اور نرم نرم فروں کے۔ گیارہ بجے کے قریب ہم نیند سے ہڑبڑا کر اٹھے، کیونکہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ "کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے" انا چلائی پیشتر اس کے کہ میں ریسیور اٹھاتا۔ اور جب میں نے اسے اٹھایا، تو سچ مچ پیغام ملا "چیف، معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ ہم سوئیزرلینڈ میں پھنس گئے ہیں۔ آپ فوراً خود آئیں۔ ہم کرائے کی کار لے کر آپ کا انتظار زیورچ کے ہوئی اڈے پر کریں گے"۔

"میں نے کہا تھا۔ میں نے ہمیشہ کہا تھا" انا پیٹ رہی تھی۔ "اب شور نہ مچاؤ" میں نے کہا "ہر بات سدھر جائیگی"۔ اور میں نے ہوائی اڈے پہ ٹیلی فون کیا اور زیورچ جانے والے جہاز میں دو سیٹیں ریزرو کروالیں۔ ہمارے پاس سامان باندھنے کے لئے دو گھنٹے کا وقت تھا۔

"شہد نہ بھولنا، شہد نہ بھولنا" انا نے پکار کر کہا" میں تمہیں کیسے سوئیٹزرلینڈ کی جیل میں پیکٹ بھیجا کروں گی۔ مجھے تو وہاں کے قواعد کا علم ہی نہیں ہے"۔

"اب چپ ہو جاؤ" میں نے کہا"چپ ہو جاؤ۔ قید خانے کا ابھی ذکر ہی کہاں ہے۔ مجھے نظر آرہا ہے کہ مجھے تمہیں ماہر نفسیات کے پاس لے جانا پڑے گا"۔

"ماہر نفسیات کے پاس۔ آلبرٹ تم میرے ساتھ یہ نہیں کر سکتے۔ میں ماہر نفسیات کے پاس نہیں جاؤں گی۔ میں کوئی بازاری عورت تھوڑی ہی ہوں۔ میں کمپلیکسوں کا شکار بھی نہیں ہوں۔ میں نے ہمیشہ کہا تھا کہ کبھی گڑ بڑ ہو جائے گی اور اب گڑ بڑ ہو گئی ہے۔ اس کا تم انکار نہیں کر سکتے۔ یہ کوئی بڑ نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے"۔

قصہ مختصر ہم زیورچ میں اترے۔ کرائے کی کار میں بطخوں تک پہنچے، جو اس دوران میں بدبو دینے لگی تھیں۔ یہ میری زندگی کا مشکل ترین مسئلہ تھا۔ ہم بطخوں کو جنگل میں نہ پھینک سکتے تھے۔ بدبو کے سبب ان کو فوراً تلاش کر لیا جاتا۔ پھر یہ قضیہ بہت بدمزہ صورت اختیار کر جاتا۔ ان کی بدبو آسمان تک پہنچتی، کیونکہ جب ایک فروں کا ٹرک غائب ہو جاتا ہے، تو پولیس کہتی ہے: "خیر، اس بات کو ہم جانتے ہیں۔ ایسی وارداتیں ان دنوں میں بہت ہونے لگی ہیں۔ یہ معاملہ تو بالکل ناقابل حل ہے۔ اس سلسلے میں انسان کچھ نہیں کر سکتا"۔ اور انہوں نے مسل کو ایک طرف رکھ دیا ہوتا۔ فروں کا کاروباری انشورنس کمپنی سے پیسے وصول کرتا، بیشتر صورتوں میں ہنستے کھیلتے ہوئے اور معاملہ ٹھپ ہو جاتا۔ مگر بطخیں! ان کے مسئلے کو وہ لوگ یقیناً خاص اہمیت کا حامل بنا کر چھوڑتے اور ساری انٹرپول کو جمع کر لیتے۔ ایک آدمی نے تجویز پیش کی: "چلو ان کو ابدی برف کی سلطنت میں لے چلیں۔ وہاں پر نہ یہ پگھلیں گی اور نہ بدبو دیں گی۔ وہاں پر وہ ہمیشہ کیلئے غائب ہو جائیں گی"۔

"ارے عقل کے دشمن" میں نے کہا" تم نے شاید پہاڑوں پر چڑھنے والوں اور چوٹیوں کو سر کرنے والوں کے بارہ میں کبھی نہیں سنا۔ ذرا تصور کرو کہ کیا تماشا بنے، اگر ایک پہاڑوں پر چڑھنے والوں کا گروپ اس خبر کے ساتھ واپس لوٹے کہ انہوں نے گلیشیر پہ سینکڑوں ڈیپ فریزڈ بطخیں دیکھی ہیں۔ یہ بات اخباروں کے لئے

کھاجا بن جائے ۔ سرخیوں پر سرخیاں ۔ ہمیں یہ قضیہ کسی اور طریق سے حل کرنا چاہیئے ۔ کیوں نہ ہم ان وحوشوں کو لاشوں والی بھٹی کی نذر کریں!"

" لاشوں والی بھٹی میں، آسمان کی دہائی " انا پکاری " لاشوں والی بھٹی میں جلانا ۔ آلبرٹ تمہاری عقل جواب دے گئی ہے ۔ مجھے تمہیں ماہر نفسیات کے پاس لے جانا پڑے گا " ۔

" جانے بھی دو " میں نے کہا " ہم ابھی گردونواح کے دیہات میں جائیں گے اور سارے تابوت خرید لیں گے اور ان میں بطخوں کو ہوابستہ بند کر دیں گے " ۔

معاملہ اتنا سہل نہ تھا، اس بات کا میں اعتراف کرتا ہوں ۔ کرسمس کے دنوں میں یوں بھی بہت سے لوگ دماغ کی رگ پھٹنے سے مرتے ہیں، بالخصوص دیہات میں، کیونکہ وہ بے تحاشا کھاتے ہیں اور پھر فصد لینے کا بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ۔ پورے دو روز میں کہیں جا کے ہم بارہ تابوت خرید کر ان میں بطخوں کو ہوا بستہ بند کر سکے ۔ دو راتیں ہم نے گاؤں کے پبوں کے بالائی کمروں میں بسر کیں ۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں زندگی بھر ایسے پلنگوں پر نہیں سویا ہوں ۔ وہ ہمارے بوجھ تلے اس طرح چرچراہتے رہے، جیسے مرتے ہوئے خنزیر واویلا کرتے ہیں یا ملاحوں کی خشکی پر سوکھ جانے والی کشتی شور مچاتی ہے ۔ اور میری پیاری انا نے صرف اس قدر کہا " قید خانے میں اس سے بڑھ کر سختی کا سامنا کرنا پڑے گا " ۔

۲۷ دسمبر کو ہم نے مختلف مفتش الاموات کے ہاں چکر لگائے ۔ میں نے بارہ موت کے جعلی سرٹیفیکیٹوں کے لئے ابتداء میں پانچ ہزار پھر دس ہزار مارک دینے کی پیش کش کی ۔ مگر مفتش الاموات راضی نہ ہوئے ۔ وہ لاشیں دیکھنے پر مصر تھے ۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ سکتے کا شکار ہونے والوں یا اذیتوں کے ہاتھوں مرنے والوں کو سرٹیفیکیٹ دیں ۔ بارہ سکتے کے مریض! اس ذمہ داری کو اٹھانے کے لئے وہ تیار نہ تھے ۔

بالآخر ہمیں ایک مل ہی گیا، جو بیس ہزار لے کر یہ ذمہ داری اٹھانے کے لئے تیار ہو گیا ۔ وہ لومڑی کا جنا ایک پورا شریف زادہ نکلا ۔ اس نے کہا " اگر آپ پانچ ہزار کا اضافہ کر دیں، تو میں آپ کی بارہ لاشوں کے لئے نام اور مقام پیدائش اور

موت کے بارہ مختلف اسباب بھی پیدا کر لوں گا"۔

ٹرک اس وقت تک جنگل میں اسی جگہ پر کھڑا تھا۔ بطخوں کے تابوت اس میں ایک دوسرے پر دھرے تھے اور رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ ہم زیورچ کی لاشوں کی بھٹی پر گئے۔ جہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ مرنے والوں کے رش کے سبب دو روز تک انتظار کرنا پڑے گا۔ ہمیں چاہیئے کہ تابوتوں کو دو روز کے لئے لاشوں کے ہال میں رکھوا دیں۔ رکھوانا خوب ہے۔ اس کام کے لئے ضرورت ہوتی ہے پھولوں کے ہاروں کی بمعہ تعزیتی پٹیوں کے۔ ہر تابوت کے لئے کم از کم تین۔ ان کو پیدا کرنے میں ایک پورا دن لگ گیا۔ " تمہاری سوگوار بیوی ایلیزابتھ "۔ " محلہ نمبر ۲ کی شہری کمیٹی کی جانب سے ہمارے محسن کے نام "۔ " تمہاری روح کو سکون ملے۔ تمہارا غم زدہ ایڈوارڈ "۔ اب بطخوں کے تابوتوں کی زینت اس قسم کی عبارتیں بن رہی تھیں۔ اور مجھے تین ملکوں سے اپنے کارندوں کو بلانا پڑا، تاکہ تابوتوں کے لئے سوگواروں کا بھلا سا گروہ جمع ہو جائے۔

ہر تابوت پر ایک پادری نے ایک تعزیتی تقریر کی۔ میں نے اپنے سارے کارندوں کو کالے سوٹ اور بیواؤں کے لئے دوپٹے اور کالے ہیٹ مہیا کر کے دیئے۔ سب مل ملا کے ایک لاکھ پچاس ہزار مارک اس موقعہ پر گویا ہوا کی نذر ہو گئے۔ آخر میں مجھے بارہ خاک دان بطخوں کی راکھ سے بھرے ہوئے ملے۔ خوش قسمتی کی بات یہ تھی کہ میں ان سارے اخراجات کو ٹیکس میں سے منہا کروا سکتا تھا۔

یہ تین برس ادھر کی بات ہے۔ اس وقت سے مجھے ایسا سانحہ پیش نہیں آیا۔ میری پیاری انا بھی سارے قضیئے کو فراموش کر چکی ہے، بغیر کسی قسم کے اندرونی دھچکے کے۔ خاک دان البتہ ہمارے باغ میں دھرے ہیں اور عشق پیچاں کی بیل ان پر چڑھی ہوئی ہے۔ اور پیاری انا ان کی دیکھ بھال کرتی ہے، جیسے ان میں سچ مچ اہل خانہ کی باقیات دھری ہوں۔ جب وہ کرسمس کی بطخ کو رسی پر لٹکاتی ہے، تو ہمیشہ کہا کرتی ہے " کتنا پیسوں کا ضیاع۔ ہمیں چاہیئے تھا کہ کم از کم چند بطخیں بچا لیتے۔ اس طرح مجھے سال کے سال ایک تازہ بطخ مہیا کرنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑتی "۔

" مگر پیاری انا " میں کہا کرتا ہوں " ڈیپ فریز بھی تو محض محدود عرصے کے

لئے رکھ سکتے ہیں۔ شکر کرو کہ سارے جھنجٹ سے یکبارگی جان چھوٹ گئی"۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔ میں ریسیور اٹھاتا ہوں۔ کوئی شخص نیاپل سے بولتا ہے "یہاں پر نیاپل ہے۔ سب ٹھیک ہے چیف"۔

"امید ہے کہ انہوں نے پھر ہماری اپنی دوکان کو نہیں لوٹا ہوگا۔ یہ بد قسمتی کے کوے" انا کہتی ہے۔

"جانے بھی دو" میں جواب دیتا ہوں "ایسی بات عمر بھر میں صرف ایک بار ہوتی ہے۔ آؤ، میں ٹیلی فون کو بند کر دیتا ہوں۔ ہم پلنگ پر لیٹتے ہیں تاکہ تمہیں اور اور باتیں سوجھیں"۔

اس طرح گذرتے ہیں ہمارے تہوار... ہمارے مقدس تہوار۔ میل آرڈر بزنس والے اور سلسلہ وار دوکانیں یا سپر مارکیٹیں ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ ہماری دوکانیں خوب پھلتی پھولتی ہیں، ہلورشم میں، بارسیلونا میں، مائی لینڈ میں اور دوسرے سارے شہروں میں۔ ہمارا مستقبل محفوظ ہے۔ اور اگر خاک دان ہمارے باغ میں نہ ہوتے، تو سوئیٹزرلینڈ والا قصہ ہم کبھی کا بھول چکے ہوتے۔

ہر برٹ ہیکمن

Herbert Heckmann

آدمی جس نے اپنے آپکو بھلا دیا

مسٹر بولز ، جس کے بارے میں یہ کہانی ہے ، شکست کھانے کا ماہر اور دنیا جہان کے پانیوں سے دھلا ہوا تھا ۔ اس کے سر میں اتنی بے شمار اسکیمیں تھیں ، جتنے ہاتھ وہ ان کو عمل میں لانے کے لئے نہ رکھتا تھا.... خیر ابھی سے بتا دیتے ہیں کہ مسٹر بولز کو کوئی راستہ نہ سوجھتا تھا ۔ اور اس کے دوست کنی کاٹتے تھے ، تا کہ غم کے ہجوم میں اسے مزید پریشان نہ کریں ۔ اس نے دریا کا رخ کیا اور گندے ، چکنے پانی کا جائزہ لینے لگا ، جس میں وہ کود جانا چاہتا تھا.... مگر تھوڑا انتظار کرتے ہیں.... وہ سوچنے لگا کہ اس کو دفن کرتے وقت جنازے میں شامل لوگ اس کے بارے میں کیا سوچیں گے .... تھوڑا انتظار کرتے ہیں.... اس نے اپنے آپ کو طبی چیر پھاڑ کی میز پر لیٹا ہوا دیکھا ۔ جراحی کا نشتر چمکنے لگا ۔ مگر نہیں ، نہیں ، نہیں ، اتنی جلدی مسٹر بولز ہمت نہیں ہارتا ۔ اسے زندگی سے پیار تھا ۔ اور خود اپنے آپ سے ۔ وہ سیگار پینا پسند کرتا تھا اور بروگنڈ وائن ، اگرچہ اس لمحے میں اس کو ان کے بغیر گذارہ کرنا تھا ۔ اسے پیار کرنا بھاتا تھا اور وہ اپنے آپ سے پیار کرتا تھا ۔ نہیں ، نہیں ، مسٹر بولز نے دریا میں چھلانگ نہ لگانے بلکہ ایک سستے سے ریستوران میں جانے کا فیصلہ کیا ۔

سب جانتے ہیں کہ موت کے بارے میں سوچنے سے انسان کو بھوک لگ جاتی ہے ۔ جب کہ مسٹر بولز اپنے مختصر سے کھانے کا انتظار کر رہا تھا ، اس نے اخبار کو اٹھا لیا ، جسے کوئی دوسرا گاہک چھوڑ گیا تھا اور پڑھنے لگا کہ ایتھوپیا کے قیصر نے ایک ہوائی کمپنی کا افتتاح کیا تھا ۔ یونان میں زلزلہ آیا تھا ۔ یہ دیکھو ، اس نے دل میں سوچا کہ نیویارک میں اسٹاک ایکسچینج نے گزشتہ روز کی توقعات کو پورا نہیں کیا ۔ ایک دریا میں سیلاب آگیا تھا اور کینیڈا میں چار جڑواں بچوں نے ایک باپ کو بے حد خوش

کر دیا تھا۔

اشتہارات اموات پر پہنچ کر مسٹر بولز کو اپنے آپ سے بہت ہمدردی پیدا ہوئی اور جب ویٹریس نے اس کے سامنے گرما گرم شوربے کی پلیٹ رکھی، تو اس نے ملے جلے اشتہارات کے کالم میں پڑھا کہ شعبہ علم الابدان کو لاشوں کی تلاش تھی ..... اتنے پیسے اس شخص کو دیئے جائیں گے، جو اپنی لاش کو سائینسی تحقیقات کے لئے پیش کرے گا۔ ایک بے حد عجیب و غریب طرز بیان، مسٹر بولز نے اپنے شوربے میں چمچہ پھیرتے ہوئے سوچا۔ اس نے تیوری چڑھائی اور اپنی لاش کو بیچنے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ مرنے کے بعد، اس نے سوچا، اسے اس بات کی فکر نہ کرنی چاہیئے کہ اس کے جسم کا کیا بنتا ہے .... قبرستانوں کے لئے ضرورت سے زیادہ رقم خرچ کی جاتی تھی .... کھانے کے بعد اس نے اپنی آخری رقم کو بے حد تھکی ماندی ویٹریس پر قربان کر دیا۔ سڑک پر آیا اور پیدل چل دیا، اگرچہ بارش ہو رہی تھی۔ شعبہ علم الابدان تک وہ بھیگ کر پہنچا۔

"میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں ؟" ایک بے حد بالوں سے ڈھکے ہوئے شخص نے پوچھا اور ایک کاغذ کو عین درمیان میں تہہ کرنے لگا۔

"درحقیقت میں آپ کی خدمت کرنی چاہتا ہوں" مسٹر بولز نے جواب دیا۔ وہ اپنے اوور کوٹ کے بٹن کھولنے لگا۔ اسے سوجھتا ہی نہیں تھا کہ وہ اپنا مدعا کیسے بیان کرے۔ "میں اپنے آپ کو بیچنا چاہتا ہوں" اس نے کہنا شروع کیا اور کھسیانی ہنسی ہنسا۔ "مطلب یہ ہے، اگر مجھے یہ کہنے کی اجازت ہو، کہ میں اپنی لاش کو بیچنا چاہتا ہوں، اگرچہ میں فوری طور پر مرنے کا ارادہ نہیں رکھتا ہوں"۔

"کمرہ نمبر ۲۰۴"۔

کمرہ نمبر ۲۰۴ میں اس نے کہا "میں اپنے آپ کو سائنسی تحقیقات کی خاطر پیش کرنا چاہتا ہوں"۔

"آپ کن بیماریوں کا شکار ہیں ؟" ایک آدمی نے اس سے موٹے چشمے کے پیچھے سے پوچھا۔

"ابھی کسی کا نہیں، مگر آدمی کو دن کی تعریف شام پڑنے سے پہلے نہیں کرنی

چاہیئے" ۔ مسٹر بولز بڑبڑایا اور فرمائش کے بغیر اس نے اپنا اوور کوٹ کرسی پر رکھ دیا۔

"بچپن میں مجھے خسرہ ہوا تھا، اگر یہ بات آپ کے کسی کام آسکتی ہے" ۔
"دلچسپ، کیا آپ شادی شدہ ہیں ؟"
"ٹھیک سے نہیں، مگر کسی زمانے میں میرا ارادہ تھا۔ آپ سمجھتے ہیں ناں ؟"
"واضح ہے ۔ کیا آپ مذہبی طور پر بندھے ہوئے ہیں ؟"
"مجھے بپتسمہ دیا گیا تھا" ۔
"اس کے علاوہ کوئی شکایت ؟"
"اس وقت کوئی نہیں" ۔
مسٹر بولز کے چہرے پر سرخی پھیل گئی اور اس نے کپکپاتے ہوئے ہاتھ کے ساتھ ایک عبارت کے نیچے دستخط کیے ۔
"میں آپ کو کیسے اطلاع دوں گا، جب میں مروں گا ؟"
"یہ چیز آپ ہم پہ چھوڑ دیں ۔ ہمارے پاس آپ کا ایڈریس موجود ہے" ۔
"تو پھر میں رخصت لے سکتا ہوں ؟"
مسٹر بولز نے اپنا اوور کوٹ لیا اور کیش آفس کی طرف گیا ۔ اپنی قیمت وصول کی اور اپنے آپ کو سائینس کے رحم و کرم پر دیکھتا رہا، سفید کپڑوں میں ملبوس سائینس کے ۔

مگر بالآخر پیسوں کے ملنے کی خوشی غالب آگئی.... زیادہ دیر تک نہیں، کیونکہ پیسوں کی خوشی ان کو خرچ کرنے میں مضمر ہے ۔ اس طرح مسٹر بولز پھر اس مقام پر پہنچ گیا، جہاں سے اس نے اپنے آپ کو ہٹانے کی بے جگری سے کوشش کی تھی ۔

"کیا خیال ہے" اس نے اپنے آپ سے سوال کیا "اگر میں پھر ایک بار یہی کوشش کروں ؟" اس نے یہ بات ایک سے زیادہ بار نہ پوچھی .... اور وہ اپنے آپ کو دوبارہ فروخت کرنے کا ارادہ باندھ رہا تھا ۔ اس دفعہ وہ ایک دوسرے شہر میں گیا اور پہلے کی طرح ایک ایڈریس پیچھے چھوڑ آیا ۔ واضح طور پر ایک دوسرا.... اور چونکہ وہ اپنی قیمت کو صحیح معنوں میں جانچ رہا تھا، وہ فوراً اگلے شہر چل دیا اور پھر اگلے شہر اور ہر

جگہ پر اپنے آپ کو سائینس کی خدمت میں پیش کرتا گیا۔ اس طرح اس نے اچھا خاصا سرمایہ پیدا کر لیا، جو اس کی زندگی کو کم از کم وقتی طور پر کرب و حزن کے بغیر گذارنے کے لئے کافی تھا۔ ابتدائی شک و شبہات، جو اس کے دل میں پیدا ہوئے تھے، .... اتنا اس کے دفاع کے لئے کہنا پڑے گا.... بہت جلد اس کو نہیں ستاتے تھے۔ اس کے الٹ اس کو یہ بات بھلی لگنے لگی، اس قدر قیمتی ہونا بغیر خود کچھ کرنے کے، سوائے پائے جانے، سانس لینے، کھانے پینے کے۔

وہ خوب مزے کی زندگی بسر کرنے لگا اور اپنی سیوا کرنے لگا، جہاں تک اس کا بس چلتا تھا.... اور وہ خوب چلتا تھا۔ صرف بعض اوقات جب وہ بہت خوش ہوتا تھا .... مینڈک کی رانیں کھاتے وقت .... اسے اپنے آپ کو بیچنا یاد آتا تھا اور اسے سچ مچ مردار کی بدبو سونگھنے کا شبہ ہوتا تھا۔ "اخ" وہ اپنے آپ سے کہتا تھا "میں خود اپنی ملکیت تو ہوں نہیں" اور گہرا سانس لیتا تھا" سائینس کو میرے بارے میں فکر کرنی چاہیئے"۔

اس نے کہا اور اپنے آپ کو بھلا دیا۔

روزالی یگی

Rosali Jäggi

سادہ سی کہانی

مجھے بتایا گیا ہے کہ میں بہت مشکل کہانیاں لکھتی ہوں ۔ یہ بات درست ہے میں اس کی تلافی کرنے کی کوشش کروں گی ۔

ایک آدمی کا ایک عورت سے ملنا ہوتا ہے .... کیا یہ کافی آسان ہے ؟

آدمی کو عورت اچھی لگتی ہے ، مگر پیچھے اس کی دوست موجود ہے .... کیا بات بنتی ہے ؟

آدمی کو عورت اچھی لگتی ہے ، مگر وہ اس سے محبت نہیں کرتا .... کیا فرق واضح ہے ؟

مجھے تشریح کرنا پسند نہیں ہے ۔

آدمی عورت سے شادی نہیں کرنا چاہتا ۔ مگر عورت اس سے شادی کرنا چاہتی ہے .... کیا بات سمجھ میں آتی ہے ؟

اس کے باوجود وہ اکٹھے کچھ روز جنگل میں درختوں کے نیچے ، نیلے آسمان اور سفید بادلوں تلے بسر کرتے ہیں .... کیا مجھے اس کی تشریح کرنے کی ضرورت ہے ؟

پھر عورت خدا حافظ کہتی ہے ، کیونکہ وہ شادی نہیں کرنا چاہتا ۔

اور آدمی بھی خدا حافظ کہتا ہے ۔

کیا یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے ؟

مگر عورت اب بھی امید رکھتی ہے کہ وہ ایک روز اس کی طرف لوٹے گا ، جیسے پریوں کی کہانیوں والا شہزادہ ۔ وہ اسے فون کرتی ہے ، خط لکھتی ہے ، مگر وہ جواب نہیں دیتا ۔

کیا یہ بات قابل فہم ہے ؟

ایک ملاقات کے دوران وہ تجویز پیش کرتا ہے کہ وہ اکٹھے ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لیں، مگر وہ اس سے شادی کرنا چاہتی ہے اور ہوٹل کے کمرے والی تجویز کو رد کر دیتی ہے۔

میں پھر پیچیدگیوں میں الجھنے لگی ہوں۔

اب وہ حتمی طور پر اس سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا.... یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے۔

آدمی اب اپنے باپ کی دولت کے بل بوتے پر زندگی بسر کرتا ہے اور مشکل کتابیں لکھتا ہے۔ اب وہ اپنی دوست کے ساتھ بیاہا ہوا ہے.... یہ بات ہر کوئی سوچ سکتا ہے۔

عورت، جس کا آدمی کے ساتھ کسی زمانے میں ملاپ ہوا تھا، اب اکیلی رہتی ہے، نوکری کرتی ہے اور گاہے بگاہے بس وقتی طور پر چند ہفتے ایک مکان میں گذارتی ہے، جو ایک بڑے کمپلیکس کا حصہ ہے۔ لوگ اس کمپلیکس کو پاگل خانے کا نام دیتے ہیں۔

کیا یہ کہانی کافی سادہ ہے؟

گونتھر سوئیرن
Günter Seuren

تجربہ

"میں پشت کے رخ پر چلتا ہوں، کیونکہ میں اب مزید سامنے کی طرف نہیں چلنا چاہتا" آدمی نے کہا۔ وہ عام قامت سے قدرے بڑا تھا۔ پشت کے رخ پر چلنے پر توجہ کو مرکوز کرنے کی سعی کے سبب زرد رو تھا اور سرد ہوا کی وجہ سے اس کی ناک لال ہو رہی تھی۔ ایک تند پچھمی ہوا چل رہی تھی اور اس کے جھونکے، جنہیں دوسرے پیدل چلنے والے، جن کے ساتھ وہ آدمی ایک ہی سمت میں چل رہا تھا، پشت پر نسیم کے لپکے محسوس کرتے تھے، اس کے چہرے کے بیچوں بیچ ٹکراتے تھے۔ وہ دوسروں کے مقابلے میں آہستہ مگر متواتر کسی پشت کے رخ پر چلتے ہوئے کیکڑے کی طرح چل رہا تھا۔

"ایک روز" آدمی نے کہا" میں ایک پر سکون پارک میں بالکل اکیلا تھا۔ میں نے ایک کالی چڑیا کو اپنے قریب جھاڑیوں میں دانا چگتے ہوئے سنا۔ میں نے فاختاؤں کو کوکتے ہوئے سنا اور مجھ پر ایک گہرا سکون طاری ہو گیا۔ میں پشت کے رخ پر چند قدم چل کر گیا اور میں نے جان لیا کہ اگر انسان ہمیشہ سامنے کی طرف چلتا ہے، تو رستہ تنگ ہونے لگتا ہے۔ جب میں نے پشت کے رخ پر چلنا شروع کیا، تو میں گذری ہوئی اور ان دیکھی چیزوں کو دیکھنے لگا، بلکہ ان سنی چیزوں کو سننے لگا۔ مجھے معاف کیجیئے اگر میں اپنی باتیں آپ کو پوری طرح نہ سمجھا سکوں۔ مجھ سے منطق کی توقع نہ رکھیئے۔ جو راز میں نے پالیا ہے، اسے آدمی الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اور یہ گمان نہ کیجیئے کہ میں ماضی کی طرف لوٹنے والا شخص ہوں۔ نہیں، میں پیچھے کی طرف نہیں جاتا ہوں، میں.... "آدمی چند لمحوں تک خاموش رہا اور پورے اعتماد کے ساتھ سامنے کی طرف تکتا رہا۔" یہ بات آپ کو اچنبے میں ڈال دے گی.... مگر میں

خیالی پلاؤ پکانے والا شخص نہیں ہوں" ۔ "پھر آپ کیا ہیں ؟" ہمراہی نے پوچھا ۔ ایک آدمی ، جو عام رائج طریق سے سامنے کی طرف چل رہا تھا" اس طرح آپ آگے نہیں بڑھ سکتے ۔ ایک روز آپ رک گئے تھے ۔ شاید آپ گھاس کو اگتا ہوا سننا چاہتے تھے ۔ آپ فاصلہ پیدا کرنے کے لئے چند قدم پیچھے ہٹے ۔ کیا یہی بات تھی ؟ "

" پشت کی طرف چلنے والے آدمی نے اپنے ہمراہی کی طرف دیکھا ۔ اس کی نگاہ میں ملائمت تھی " میرا تجربہ ابھی تکمیل کو نہیں پہنچا" اس نے کہا ۔

" کیا آپ کا خیال ہے کہ آپ کا چلنے کا طریق بازی لے جائے گا ؟ " ہمراہی نے پوچھا ۔

" اس سوال کا جواب بہت مشکل ہے " آدمی نے کہا اور اپنی نظروں کو ایک مقام پر گاڑے رکھا ، جسے اس کا ہمراہی نہیں دیکھ سکتا تھا ۔ " یہ جانیں کہ میرا آئیڈیا نیا نہیں ہے ، جیسا کہ مجھے بعد میں یاد آیا ۔ ایک عرصہ ہوا خاک میں مل جانے والی ایک قوم کو بھی ہماری طرح کے مسائل کا سامنا تھا ۔ وہ بھی ایک ایسے مرحلے میں داخل ہو گئی تھی ، جب اس کی بقا خطرے میں تھی ۔ اس نے بھی ایک بظاہر نرالے طریق سے اس کو حل کیا تھا ۔ اگر آپ چاہیں ، تو اسے حیلہ بھی کہہ سکتے ہیں ۔ اس دن کے بعد جنگی محاربات قبیلوں کے مابین اس طریق سے لڑی جانے لگیں کہ محارب ایک دوسرے کی طرف پیٹھ پھیر کر کھڑے ہوتے تھے اور اتنی دیر تک اپنے حملے اور وار ہوا میں کرتے تھے ، یہاں تک کہ جنگجو یکے بعد دیگرے تھکے ماندے زمین پر گر جاتے تھے ۔ فوج کی فوج بھاری سانس لیتے ہوئے گھاس پر چت لیٹ جاتی تھی ۔ جس کے بعد آنے والی نیند کے وہ حقدار ہوتے تھے ۔ مقابلے دنوں تک جاری رہتے تھے ۔ مگر خون نہیں بہتا تھا اور سارے قضیئے کا نتیجہ عضلات شکنی ہوتا تھا ۔ کیا خیال ہے آپ کا اس بارہ میں ؟ "

" میں تسلیم کرتا ہوں .... وحشی قوموں کے لئے ایک کارآمد نسخہ " ساتھی نے جواب دیا " مگر ہمارے لئے بیسود ۔ آپکو پشت کے رخ پر چلنے کا فائدہ آخر کیا ہو گا ؟ "

" میں امید رکھتا ہوں " آدمی نے کہا " کہ میں لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کروا سکوں گا " ۔

"اس میں بہر صورت آپ کو کامیابی ہوئی ہے" ہمراہی نے کہا" یہ کامیابی لمبے وقت تک مسلسل پیانو بجانے والے کو یا اس آدمی کو بھی حاصل ہو جاتی ہے، جو پچاس کلو میٹر تک ہاتھوں کے بل چلتا ہے"۔

مگر پشت کے رخ پر چلنے والے آدمی نے اس قسم کی مثالوں سے ذرہ بھر طیش نہ کھایا۔

"میں امید رکھتا ہوں کہ لوگ جان جائیں گے" اس نے کہا" جب میں پہلی بار پشت کے رخ پر چلا تھا، تو میرا دل باغ باغ ہو گیا تھا"۔

"بہت خوب" دوسرے نے کہا" آپ پہلے آدمی نہیں ہیں، جو اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔آپ البتہ ایک قابل عمل تجویز پیش کرتے ہیں۔اس کے باوجود مجھے شک ہے کہ آپ کو کامیابی ہو گی"۔

"کامیابی یا نہیں" آدمی نے جوابدیا" ہمیں کوشش کرنی چاہیئے، ہم سبکو"۔

"معاف کیجیئے" ہمراہی نے کہا" میں سچ مچ کے واقعات کو مانتا ہوں۔کیا آپ کا نقص امن عامہ کے الزام کے تحت چالان نہیں ہوا"۔

پشت کے رخ پر چلنے والے نے پہلی بار اپنے ہمراہی کے چہرے پر بھرپور نگاہ ڈالی۔

"صرف ایک بار" اس نے مسکراتے ہوئے کہا" وہ ابتدائی دنوں کی بات ہے، جب میں ابھی اناڑی تھا"۔

"اور آج کل آپ کی کسی کے ساتھ ٹکر نہیں لگتی؟"

وہ خاموش ہو گئے۔آدمی لچکدار قدموں سے پشت کے رخ چلتا رہا۔ہمراہی کو اس کا ساتھ دینے میں خاصی دقت ہونے لگی۔آدمی، جو پشت کے رخ پر چل رہا تھا، تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا۔

"معاف کیجیئے" اس نے کہا" مجھے ذرا جلدی ہے، میں نے کسی کو وقت دے رکھا ہے۔خدا حافظ"۔

پھر وہ ہجوم میں غائب ہو گیا۔دوسرے نے اپنی رفتار کو سست کر لیا، جیسے کوئی سانس لینے کے لئے پیچھے رہ جاتا ہے۔

چند لمحوں کے بعد وہ حادثہ ہوا۔ جیسے سڑک کے تارکول میں پڑ جانے والے ایک دراڑ میں سے کئ آوازوں کی چیخ سنائی دی۔ لوگ رک گئے اور ایک مخصوص سمت میں دیکھنے لگے۔ شروع میں اکیلے دکیلے، پھر انسانوں کے گروپوں کے گروپ ایک تیزی سے بڑھتے ہوئے دائرے کی طرف حرکت کرنے لگے۔

جب ہمراہی بالآخر اس قدر آگے کھسک چکا تھا کہ وہ دائرے کے اندر دیکھ سکتا تھا۔ تو اس نے دیکھا کہ آدمی، جو پشت کے رخ پر چلتا تھا، کسی آسمان سے گرنے والی بڑی سی گڑیا کی طرح تارکول پر پڑا ہوا تھا۔ دائرے میں سے کسی نے کہا "کار کا کوئی قصور نہیں ہے، اس بات کی شہادت میں دے سکتا ہوں"۔ ایک دوسرے نے کہا" یہ شخص یقیناً نشے میں تھا۔ وہ پشت کے رخ پر چل رہا تھا"۔

ہمراہی دائرے کے اندر چلا گیا اور آدمی پر جا کر جھکا۔

"کیا آپ میری بات کو سمجھ سکتے ہیں ؟"

"ہاں" آدمی نے کہا، مگر اس نے کوئی حرکت نہ کی۔ وہ بائیں گال کے بل تارکول پر پڑا تھا اور زمین کی سطح سے بول رہا تھا" آپ کو کوشش کرنی چاہیئے، جب آپ بالکل اکیلے ہوں۔ کسی بھی جگہ پر۔ کسی باغ میں یا رات کے وقت کسی کھلے مقام پر۔ مجھے امید ہے کہ آپ کو اس میں مزا آیئگا اور مجھ سے زیادہ کامیابی حاصل کریں گے"۔

سپاہی دائرے میں داخل ہوئے۔

"کیا آپ ماجرا بیان کر سکتے ہیں ؟" ایک سپاہی نے ہمراہی سے پوچھا۔

"وہ پشت کے رخ پر چل رہا تھا"۔ ہمراہی نے کہا۔

"آج یہ چوتھا آدمی ہے، جس نے اس کا ارتکاب کیا ہے"۔ سپاہی نے کہا "لوگوں کو کیا ہو گیا ہے ؟"

ایکارٹ کلیسمن

Eckart Klessmann

تمباکو کا نیگرو

جو کوئی ہمبرگ میں ہوانا سیگار پینا چاہتا تھا یا جسے چرٹ میں روزانہ وارینا س یا ماراکائیبو (بہت فائن) تمباکو بھرنا ہوتا تھا، اسے پتہ تھا کہ یہ چیزیں کہاں پر ملتی تھیں۔ یوسٹس کی دوکان پر گروتنگر شٹرا سے ۲۰۔ یوہان فریڈریش یوسٹس نے "اٹلی میں اپنا پیشہ پکڑا تھا"۔ جیسا کہ اس زمانے میں کہا جاتا تھا۔ اور ۲۴ برس کی عمر میں ریاست ٹوسکانا کا قونصل جنرل مقرر ہوا تھا۔ اس سے خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے، کیونکہ انسان اہمیت کا حامل بن جاتا ہے اور عمدہ پوزیشن کا مالک۔

دسمبر ۱۸۳۵ء کے آخری دنوں میں یوسٹس نے ایک خط اپنی قدیمی تجارتی پارٹنر فرم اوورمن اینڈ شیون کو کاریبین جزیرے سینٹ تھوماس لکھا، جس سے یوسٹس کی فرم تین برسوں سے پورتوریکو تمباکو (نئی فصل) خریدتی تھی۔ اس نے اوورمن اینڈ شیون کو (مؤدبانہ) اطلاع دی کہ اس کی فرم کچھ عرصے سے بریمن کے راستے ہوانا سیگار منگوا رہی تھی، جو ہمبرگ میں ہر دلعزیز ہوتے جا رہے تھے۔ اس بات کا اثر مگر کسی طرح سے قدیمی تجارتی تعلقات پر نہیں پڑنا چاہیئے۔ اور خبر دی کو ولندیزی تجارتی حریفوں کا کاروبار مندا جا رہا تھا۔ اور کچھ برسوں سے میری لینڈ ویگسٹاف پھر سے خوب بک رہا تھا۔ بالخصوص "سپر فائن ییلو" اور "سپر فائن براؤن"، (اگرچہ ویگسٹاف کا استعمال ایک زمانے میں بالکل معطل ہو گیا تھا)، یہاں تک کہ چھوٹے کنستر کے لئے پورتوریکو تمباکو کے مقابلے میں، جسے وہ خوب اچھی طرح بلینڈ کر کے بطور کوالٹی تمباکو کے فروخت کرتا تھا، زیادہ قیمت لی جا سکتی تھی۔

جو کوئی اس خط کو جو مؤدبانہ انداز میں لکھا گیا تھا، بغیر کسی قسم کے ذہنی تحفظات کے پڑھتا ہے، اس کی توجہ ان پھندوں کی طرف نہیں جاتی، جو اس میں

پوشیدہ ہیں۔ مگر تجارتی معاملات کے واقف کاروں کو فوراً سمجھ آ گئی ہو گی کہ بین السطور سینٹ تھوماس کی فرم اوورمن اینڈ شیون کو اشارہ کیا گیا تھا کہ اپنے مال کا بھاؤ سستا کریں، وگرنہ... اور چونکہ یہ بات اوورمن اینڈ شیون کی فرم بلاشبہ اچھی طرح سمجھ جائے گی، اس لئے یوہان فریڈریش یوسٹس نے ایک پس تحریر کا اضافہ کر دیا۔

"میں نے سنا ہے کہ سینٹ تھوماس میں ننھے ننھے خوبصورت نیگرو پائے جاتے ہیں۔ ان کو یہاں پر لوگ اپنی دوکانوں کے باہر کھڑا کرتے ہیں۔ یہ آج کل کا فیشن ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ آپ کی فرم مجھے ایسی دستی صنعت کاری کا نمونہ اگلے مال برداری جہاز میں بھجوا سکے گی، بشرطیکہ وہ سستے داموں میسر آ سکے"۔

اپریل ۱۸۳۶ء کے ابتدائی دنوں میں، جب خدا خدا کر کے برف بالآخر ہمبرگ کی سڑکوں سے پگھل گئی تھی، فرم یوسٹس کی دوکان گرونگر شٹراسے ۲۰ کے دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک ملازم نے دروازہ کھولا اور بحری جہاز کے ایک بوڑھے کپتان کو اندر آنے کو کہا، جس کے پیچھے ایک چھوٹا سا نیگرو لڑکا تھا۔ کپتان مسٹر یوسٹس سے بات کرنے کا خواہشمند تھا۔ اس نے اپنی ٹوپی اتاری اور کہنے لگا کہ وہ سینٹ تھوماس کی فرم اوورمن اینڈ شیون کی طرف سے ارسال کردہ لڑکے (لفظاً لفظاً اس نے کہا: "ایس کالے بھجنگے مونڈے نوں") پہنچانے آیا تھا۔ اور یہ کہ مسٹر یوسٹس مہربانی کر کے کاغذ پر وصولی والی جگہ پر دستخط کر کے مال وصول ہونے کی تصدیق کریں۔

مسٹر یوسٹس نے لڑکے کی طرف یوں دیکھا، جیسے وہ تاخیر سے پہنچنے والا اور غیر متوقع کرسمس کا تحفہ تھا اور پوچھا کہ اس کا کیا مطلب تھا۔ وہ نہیں جانتا، کپتان نے جھنجلا کر کہا: "گل ٹھیک ٹھاک اے جی"۔ پھر اسے یاد آیا کہ اس کے پاس ایک خط بھی تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ خط کے ہمراہ مسٹر یوسٹس کا مطلوبہ نیگرو بھیجا جا رہا تھا۔ تجارت کی دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کی خواہشات کے ساتھ۔ مؤدبانہ سلام اوورمن اینڈ شیون۔

مسٹر یوسٹس کو احساس ہو رہا تھا کہ اوورمن اینڈ شیون نے اس کی

درخواست کو غلط سمجھا تھا۔ کیونکہ ایک چھوٹے نیگرو کو دوکان کے سامنے کھڑا کرنے کا مطلب یہاں پر لکڑی کے "گونگے چاکر" کا کھڑا کرنا سمجھا جاتا تھا۔ جس طرح کے کریبین جزیروں میں لکڑی کے بنائے جاتے تھے اور رنگ و روغن لگا کر تیار کئے جاتے تھے۔

"خدا کی مار" مسٹر یوسٹس کے منہ سے نکلا۔ مگر وہ اپنے فقرے کو دبا گیا "جیسے اولے برستے ہیں"۔

اب کپتان نے کسی قدر جھنجلا کر اپنے پیسے مانگے۔ یہ لڑکے کی ڈلیوری درست ہے ناں؟

ہاں، ہاں۔ مسٹر یوسٹس نے جواب دیا۔

سچی بات ہے، کپتان برودرسن نے کہا کہ اسے لڑکا بہت اچھا لگنے لگا تھا اور اگر مسٹر یوسٹس کسی طرح سے اسے لینے کے لئے تیار نہ ہوں، تو اسے کوئی اعتراض نہ ہو گا، اگر "کالا بھجنگا مونڈا" اس کے ہمراہ بحری سفر پر جائے۔

نہیں، نہیں، مسٹر یوسٹس نے خیالات میں گم جواب دیا، اگرچہ اس طرح مسئلے کا ایک غیر متوقع حل مل رہا تھا۔ کیا نیگرو بچے کو تھوڑی بہت جرمن آتی ہے یا شاید وہ ہمبرگ کی بولی پلاٹ بھی بول سکتا ہے؟

کپتان نے بچے کو کہنی ماری: "یان ہنزک کا گیت گاؤ"۔ یان ہنزک اوپ دے لمر سڑاٹ کا گیت ہمیشہ سے ہمبرگ میں ہر دل کو نرم کرتا آیا ہے۔ اور مسٹر یوسٹس بھی اس کے اثر سے نہ بچ سکا، جب اس نے کالے چہرے والے بچے سے سنا:

اون ویگو... ویگو لین، اون ویگو... ویگو لین
اور سہیلی اس کی تھی کتھرین
اور رہتی تھی وہ اب بھی اوپ دے...

"ایک بوڑھا طوطا اس سے بہتر نقل نہ لگا سکتا تھا"۔ مسٹر یوسٹس نے منہ بنا کر گیت کو روکتے ہوئے کہا، کیونکہ دل کی نرمی اچانک یہ خیال آنے سے جاتی رہی

تھی کہ اوورمن اینڈ شیون نے جان بوجھ کر اسے مشکل میں ڈالا تھا۔

اب کپتان بروڈرسن نے کاروباری لہجہ اختیار کرتے ہوئے پوچھا: "کیا آپ اس بحفاظت پہنچائے جانے والے مال کی وصولی کرتے ہیں یا نہیں؟" مسٹر یوسٹس جانتا تھا کہ اس کا فرض بطور ہانزے کے تاجر کیا تھا۔ "میں قبول کرتا ہوں"۔ اس طرح ننھا کالا گروتنگر شٹراسے ۲۰ کا حصہ بن گیا۔

ملازم کے پکارنے پر ڈورٹے حاضر ہوئی، جو چوبیس برسوں سے زیادہ عرصے سے باورچن تھی اور گھر بار کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ مسٹر یوسٹس نے اسے فوری طور پر بچے کی دیکھ بھال کرنے، اس کی زبان پر قدرت کا امتحان لینے، اسے اچھے سے کپڑے پہنانے اور ایک عیسائی نام دینے کا حکم دیا: "علی، سلیمان یا مصطفیٰ نہیں چلے گا"۔

بچے کا نام ابراہیم تھا، جسے فوراً غیر عیسائی قرار دیتے ہوئے رد کر دیا گیا۔ اس گیت کے حوالے سے، جس کے سارے بند اسے کپتان بروڈرسن نے یاد کروا دیئے تھے، اس کو ہمبرگ والا مخصوص نام ژان دے دیا گیا، جو پکارنے کے لئے کہیں زیادہ آسان تھا۔ جب ژان نے مکان کی اوپر والی منزل میں ایک رومن عورت کے بت کی نقل کے سامنے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا، تو ڈورٹے دوہری ڈر گئی۔ ایک تو اس وجہ سے کہ بچہ واضح طور پر عیسائی عقیدہ رکھتا تھا، اس لئے اس کو بپتسمہ دیا گیا تھا، اور دوسری اس وجہ سے کہ وہ رومن کیتھولک تھا، جن سے پروٹسٹنٹ ہمبرگ میں مسلمانوں سے بڑھ کر نفرت کی جاتی تھی۔ خیر جو ہوا، سو ہوا۔ ایک ننھا کالا عیسائی بچہ فروخت کیا گیا تھا۔ کیا یہ بات جائز تھی؟

اس لمحے سے ساٹھ سالہ باورچن نے ننھے ابراہیم یا ژان کے ساتھ اپنے بچے یا پوتے کا سا سلوک شروع کر دیا۔ وہ ساری محبت، جسے وہ اپنی سنسان زندگی میں کسی کو نہ دے سکی تھی، اس آٹھ سالہ بچے پر نچھاور کرنے لگی، جسے لوگوں نے اس ظالمانہ رنگ میں تجارتی مال کی طرح ہمبرگ بھجوا دیا تھا، بغیر اس سے پوچھنے کے اور انسانی حقوق کو پامال کرتے ہوئے۔ کیا غلامی ختم نہیں کی جا چکی تھی؟

"آؤ میرے ساتھ، تم بد قسمت بچے"۔ اس نے پڑھے لکھوں کی زبان میں کہا

جس کا بولنا اسے دشوار لگتا تھا۔ "تمہیں اس گھر میں ہر آسودگی ملے گی۔ میں یہ وعدہ کرتی ہوں اور اپنے نام ڈورتے کی قسم کھاتی ہوں۔ ابھی تمہارے لئے دودھ گرم کروں گی"۔ پھر ایک نظر اس کے کالے چہرے پر ڈالتے ہوئے اس نے تصحیح کرنی ضروری سمجھی: "نہیں، دودھ نہیں۔ جھاگ والی چاکولیٹ، ملائی اور ونیل کے ساتھ اور چھری کی نوک بھر ادرک سے اپنے ننھے کالے کلیجے کے ٹکڑے کے لئے تیار کروں گی، اس کے ساتھ گھر کی بہترین ڈبل روٹی۔ تمہاری اس گھر میں بڈھی ڈورتے کے پاس عیش ہی عیش ہو گی"۔

شریر ملازمہ نیلیے نے ساتھ کے کمرے سے حیرت کے ساتھ ان فقروں کو سنا اور دروازے میں سے اندر جھانک کر بچے کو دیکھا، جب ملازم ڈورتے کی اس تقریر کی یاد میں "ڈورتے کا کالا کلیجہ" کہہ کر پکارنے لگے، بالخصوص جب باورچن آس پاس نہ ہوتی تھی۔

ابراہیم، جو اب ژان کہلاتا تھا، جلد ہی اس کا عادی ہو گیا۔ اس کو نئے کپڑے پہنائے گئے۔ پاپلین کی پینٹ، لکیردار کاٹن کی قمیص، پاپلین کا نیلا کوٹ اور مضبوط جوتے۔ گھر سے باہر وہ سر پر ایک سفید ٹوپی پہنتا تھا، جس کا گھیرا کالا تھا۔ ژان نے کسی قدر ملاحوں کی زبان بھی سیکھ لی تھی، اس وجہ سے جب کبھی تجارتی مال آتا تھا، تو گرونتگر شٹرا سے ۲۰ کی غلام گردش میں سنائی دیتا تھا: "بادبان لگاؤ"... "سامنے کا بادبان ٹھیک کرو"... "لنگر ڈالو"۔ ملاحوں کو لطف آتا تھا یہ پوز کرنے میں جیسے وہ بچے کے احکامات کی پیروی کر رہے ہوں۔ وہ ہاتھ سے سلوٹ کرتے ہوئے کہتے تھے: "آئی، آئی کپتان"۔ ژان خوشی کے مارے جھوم جھوم جاتا تھا۔

ہمبرگ کے نئے سال کے ملگجے موسم کے باعث ژان اکثر لتھڑ پتھڑ گھر لوٹتا تھا۔ اب وہ آہستہ آہستہ مسٹریوسٹس کے لئے پہلی بار ہرکارے کا کام کرنے لگا تھا۔ اگرچہ بعض دوکانوں میں اسے مٹھائی وغیرہ دی جاتی تھی، مگر سڑک پر بعض اوقات آوارہ لڑکے گھوڑے کی لید یا کوئی دوسرا گند اس پر پھینک دیتے تھے۔ کبھی کبھار تو ایک آدھ تھپڑ بھی اس کے گالوں پر جڑ دیا جاتا تھا۔ اس کے کپڑے بدلنے اور اس کو نہلانے کا کام گھر میں یقیناً کسی اور کے سپرد کیا جا سکتا تھا، مگر ڈورتے اس کو خود کرتی تھی۔

وہ اسے لکڑی سے بنے ہوئے گرم پانی کے ٹب میں بٹھاتی تھی ۔ خود اس کو صابن لگاتی تھی اور اس کے لئے دھلے ہوئے کپڑے نکالتی تھی ۔ اگر ژان گیلے پاؤں گھر لوٹتا تھا، تو انہیں بہر صورت گرم پانی سے دھلانا ہوتا تھا ۔ کیونکہ ڈورتے کا کہنا تھا کہ ایک نیگرو بچے کو ہمبرگ کے سخت موسم کی عادت نہیں تھی ۔ وہ اس بات کو تصور میں بھی نہیں لا سکتی تھی کہ خود اس کی حالت افریقہ میں کیا ہوتی ۔ پھر اس نے ژان سے پوچھا کہ اس نے ہمبرگ کی کیا تصویر اپنے ذہن میں بنا رکھی تھی ۔

ژان نے، جس کا زبان پر قابو خوب ترقی کر چکا تھا، بتایا کہ کپتان بروڈرسن نے ایک بڑے شہر کا نقشہ کھینچا تھا، جس میں مشعل مینار پایا جاتا تھا ۔ جب کہ ملاحوں نے زیادہ تر شراب کی دوکانوں کا ذکر کیا تھا، جہاں پر بیئر اور شراب پینے کو ملتی تھی، جسے خوبصورت ترین لڑکیاں پلاتی تھیں ۔ یہاں پر ہر چیز سینٹ تھوماس سے مختلف ہے، یہ کہا اور چپ ہو گیا ۔ ڈورتے نے سب کو باورچی خانے سے نکال دیا اور کہا کہ ژان کو گھر کی یاد ستا رہی تھی ۔ جب وہ اچھی طرح جرمن بولنی سیکھ جائے گا، بالخصوص پلاٹ بولی، تب ہر چیز بہتر ہو جائے گی ۔ ٹھیک کہتی ہوں ناں، تم میرے کلیجے کے کالے ٹکڑے ؟

یہ بات حیرت انگیز تھی کہ کس قدر جلد ننھے بچے کو جرمن زبان پر قدرت حاصل ہو گئی تھی اور کس طرح تھوڑے عرصے میں پلاٹ بولی بھی اس کے منہ سے نکلنے لگی تھی ۔ جب کبھی وہ کسی رخصت ہونے والے کپتان کے لئے دروازہ کھولتا تھا اور زندہ دلی کے ساتھ کہتا تھا: " فیر کدی مڑ کے وی آنڑاں "، تو سخت سے سخت دل سمندری ریچھوں کا دل نرم ہو جاتا تھا اور وہ اچھی خاصی ٹپ دیتے تھے، جسے ننھا لڑکا مؤدبانہ طور پر سر کو جھکا کر وصول کرتا تھا ۔

ڈورتے نے یہ عادت بنا لی تھی کہ وہ اپنے کالے متوسل کو ہر رات خود بستر پہ سلانے کے لئے جاتی تھی اور اس کے ساتھ مل کر سونے سے قبل دعا مانگتی تھی ۔ ژان کو یہ بات بہت بھاتی تھی اگر وہ اس کو کوئی گیت بھی سناتی تھی، اکثر مذہبی گیت ۔ اور پھر ڈورتے کو " قیمتی خزانے " والا گیت بھی آتا تھا، جس کے وہ سارے بند گایا کرتی تھی ۔ بچے کو دو بند بالخصوص بہت بھاتے تھے:

تمہارے حسن کے صدقے
میں دل ہی دل میں کہتا ہوں
گزر جائیں گے دن میرے
جو اس دھرتی پہ لکھے ہیں

خدا جانے وہاں آگے
ستاروں کے جہانوں میں
سنہری قصر کے اندر
ہمارے ساتھ کیا بیتے

دوسرا گیت بھی ڈورنے کو دو بار اس کے سامنے گانا پڑتا تھا یہاں تک کہ وہ اسے جلد زبانی یاد ہو گیا:

سویا ہوا ہوں یا جاگ رہا ہوں
بیٹھا ہوا ہوں یا بھاگ رہا ہوں
سدا تمہارا خدمت گار
میری ہو تم ازلاً ابداً
پکا تم سے یہ اقرار
چاہے کچھ بھی کرتا ہوں
راتوں کو یا دن کے سمے
قصر میں گویا بستا ہوں
باہوں میں اپنی تھامو مجھ کو
چومو چومو گود میں لے لو
خوش ہوں یہاں پر اور وہاں پر

اس شعر پر بچہ باورچن کے ساتھ چمٹ جاتا تھا اور دہراتا تھا:

باہوں میں اپنی تھامو مجھ کو
چومو چومو گود میں لے لو
خوش ہوں یہاں پر اور وہاں پر

اس پر ڈورتے کے لئے اپنے آپ کو قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا تھا: " تم میرے کلیجے کے ٹکڑے " وہ کہتی تھی " تم خدا کے ننھے کالے تحفے "۔

ژان کو اب ہمبرگ میں پورا ایک سال ہو گیا تھا۔ اور وہ درست لہجے میں جرمن بولنے لگا تھا۔ ایک شام گانے کے بعد اس نے پوچھا: " یہ بتاؤ ڈورتے کہ کیا سنہری محل میں ایک شہزادی بھی رہتی ہے ؟ "

" ہر محل میں ایک شہزادی رہتی ہے "۔

" شاید وہ شہزادی بھی، جس کی مجھے خدمت کرنی ہے "۔

" تمہیں ؟ ایک شہزادی کی خدمت کرنی ہے ؟ کیا مطلب ہے اس کا ؟ "

اب ڈورتے کو پتہ چلا کہ ننھے ابراہیم کو سینٹ تھوماس میں کہا گیا تھا کہ اسے ہمبرگ میں روزانہ ایک شہزادی کو سنہری چینک میں چاکولیٹ ناشتے میں پیش کرنی ہو گی، لیموں جیسے زرد رنگ کے کوٹ اور ہلکے نیلے رنگ کی پتلون اور زعفرانی رنگ کے پیلے بوٹوں میں ملبوس ہو کر۔ اور یہ کہ ان پر سونے کی تاروں سے نقش و نگار بنے ہوئے ہوں گے۔ اور اس کے سر پر سرخ شملے والی سفید پگڑی ہو گی۔

باورچن کو اس موقع پر یہ بھی پتہ چلا کہ ژان کو بطور غلام بچے کے نہیں فروخت کیا گیا تھا۔ ہمبرگ والی شہزادی کی کہانی سنانے کے بعد آزاد شدہ غلام کے بیٹے سے، جو اپنی نانی کے پاس رہتا تھا، کیونکہ اس کی ماں مر چکی تھی، پوچھا گیا تھا کہ کیا اس کو اس شہزادی کی خدمت کرنے کی خواہش تھی۔ اگر وہ خواہش رکھتا تھا، تو کوئی ... اور یہ " کوئی " اوورمن اینڈ شیون کی فرم تھی، اگلے جہاز میں اسے کپتان بروڈرسن کے حوالے کر دے گا، جو اس کو بحفاظت ہمبرگ اور شہزادی کے پاس پہنچا دے گا۔ دوسرے الفاظ میں اس دھوکے کا مقصد مسٹر یوسٹس کو اس کا مطلوبہ تمبا کو کا نیگرو بہم پہنچانا تھا۔

ڈورٹے کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پھر اس نے کہا: "اوور مَن اینڈ شیون کیوں کر ایسا بے ہودہ قصہ سنا سکتے ہیں۔ ہمبرگ میں کوئی شہزادی نہیں پائی جاتی، نہ ہی کبھی وہاں پر کوئی شہزادی رہتی تھی۔ اس بات کو ہر شخص جانتا ہے، جس کے دماغ میں رتی بھر عقل پائی جاتی ہے"۔

ژان نے، جس کے آنسو بہہ نکلنے کو مچل رہے تھے، ایک ڈبیہ نکالی، جسے اب تک ڈورٹے نے کبھی صحیح طور پر نہ دیکھا تھا۔ اس پر فی الواقعہ ایک چھوٹا سا نیگرو اس قسم کے لباس میں ملبوس بنا ہوا تھا، جس کا ذکر ژان نے کیا تھا۔ اور وہ ایک سفید فام عورت کے لئے ... اسکو شہزادی کہہ سکتے ہیں ... ایک چاندی کی بنی ہوئی چینک کو چاندی کی طشتری پر رکھے ہوئے لئے جا رہا تھا۔ اور جو بات سب سے بڑھ کر تھی، وہ یہ تھی کہ ڈبیہ پر لکھا تھا: "یوسٹس، ہمبرگ ... بہترین تمباکو"۔

اس کو تو یقیناً پتہ ہوگا۔ ژان کے منہ سے بمشکل یہ الفاظ نکلے، جو آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے ڈورٹے کی طرف تک رہا تھا کہ وہ شہزادی کہاں پر رہتی ہے۔ آخر اس کی تصویر یونہی تو نہیں بنائی گئی تھی۔ اور مسٹر یوسٹس کا باعزت نام اس کے ساتھ لکھا گیا تھا۔

اور وہ بلک بلک کر رونے لگا اور اس نے اپنی باہیں ڈورٹے کی گردن کے گرد ڈال دیں۔ اس کے ننھے جسم کو جو ہچکیوں کے باعث کانپ رہا تھا اور جسے ڈورٹے کے ہاتھ تسلی دینے کی خاطر مصروف عمل تھے، کتنی ہی دیر اپنے آپ پر قابو پانے میں لگی۔ ژان نے کہا اس طرح کہ سلسلہ کلام ہچکیوں کے سبب بار بار ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا کہ وہ محض اس وجہ سے لٹنے ماں کے ساتھ اور اپنی مرضی سے ہمبرگ آیا تھا۔ کیا یہ سب محض دھوکہ تھا اس کو اپنے وطن سے نکلنے کی خاطر اور اس کی نانی سے جدا کرنے کے لئے۔ اور اگر اس سارے کام کا مقصد فقط اس کو دھوکہ دینا تھا، تو پھر وہ ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دینے کو تیار تھا۔

ڈورٹے نے، جسے اس بات سے بہت صدمہ پہنچا تھا، اس کی آخری خواہش کو ایک بہت بڑا گناہ قرار دیا۔ مگر اس میں اتنی سمجھ بوجھ ضرور پائی جاتی تھی، یہ جاننے کے لئے کہ بچے کے ساتھ بہت برا ہوا تھا، اگرچہ بے خیالی میں اور وہ یہ بھی جانتی تھی

کہ اب فوراً کچھ ہونا چاہیئے۔

شاید ایک شہزادی پائی جاتی ہے۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ مگر یقیناً ہمبرگ میں نہیں بلکہ آلٹونا میں، جو ہمسائے میں ہی تو آباد ہے اور ڈنمارک کے تحت ہے۔ اور چونکہ ان کے ہاں بادشاہ موجود ہے، اس لئے شہزادی بھی ضرور ہو گی۔ اور ہو سکتا ہے کہ ایک سچ مچ کی شہزادی شاہراہ پالملیئے پہ رہتی ہو، چھپ کر، جیسے ہر کوئی سمجھ سکتا ہے (ژان اس بات کو سمجھنے سے قاصر تھا)۔ مگر اس وجہ سے اس کی اصلیت میں فرق نہیں پڑتا۔ وہ اس بارہ میں پوچھ گچھ کرے گی۔

"اور اب تم سو جاؤ، میرے کلیجے کے کالے ٹکڑے" اس نے نرم آواز اور ایک کومل بوسے کے ساتھ کہا، جس کی توقع کوئی شخص اس تلخ مزاج عورت سے نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس نے بچے کے آنسو پونچھ کر کہا "میں تمہاری شہزادی کو ڈھونڈ نکالوں گی، مجھے میرے نام ڈورٹے کی قسم"۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی، اپنے بڑے رومال میں زور و شور کے ساتھ ناک کو صاف کیا اور کہنے لگی کہ شاید اس کو ٹھنڈ لگ گئی تھی۔

ژان کا ننھا دل شکر گزاری اور محبت کے ساتھ لبریز ہو گیا۔ اس نے ڈورٹے کے بارے میں سوچا، جو اسے شہزادی کے حضور لے جائے گی۔ اور چونکہ وہ روتا رہا تھا اور اس کی ڈھارس بندھائی گئی تھی، اس لئے وہ فوراً سو گیا۔ ڈورٹے کی آنکھ نہ لگ پائی تھی۔ اس بچے پر کیا کیا ظلم نہ ہوئے تھے، جیسے کالی چمڑی اور کیتھولک مذہب کا ہونا اس کے لئے کافی سزا نہ تھی۔ اگر اس کے بس میں ہوتا، تو وہ بدلہ لینے والے فرشتے کے روپ میں سیدھی سینٹ تھوماس اڑ کے پہنچتی اور اوورمن اینڈ شیون کے ان بنیا ذاتوں کو دکھا دیتی، سیدھے سیدھے ہاتھوں، جس کی توقع آدمی ہمبرگ کی ایک تکڑی باورچن سے رکھ سکتا ہے کہ "جیسے اولے برستے ہیں۔ خدا دے اور بندہ لے"۔

مگر پھر اس کو ایک بات سوجھی۔ اواخر اگست میں مسٹر بوتھ نے گرمیوں کی پارٹی کا پروگرام بنا رکھا تھا، جس میں مسٹر یوسٹس کو شمولیت کی دعوت دی گئی تھی، جان رچرڈ بوتھ، جو انگریز تھا، فلوٹ بیک کی سڑک ایلب چوسے پر واقع وسیع و عریض

پلانٹ نرسری کا مالک تھا۔ اور چونکہ وہ اپنے باپ جیمز کی طرح ہر موقع و محل کے مناسب حال کام کرنا جانتا تھا، اس لئے وہ اس سلسلے میں مدد دے سکے گا۔ ڈورتے نے سوچا کہ آدمی یقیناً کوئی خوبصورت سی بچی ڈھونڈ نکالے گا، جو ایک شام کے لئے شہزادی کا پارٹ کھیلنے کے لئے تیار ہو گی۔ باورچن اپنے ذہن میں لڑکیوں کا جائزہ لینے لگی تھی۔ کیا سیویکنگ، ینیش، جنیکل، ہیپے کی لڑکیاں... جانے بھی دو۔ ہمبرگ جیسے بھلے شہر میں خوبصورت بچیوں کی کمی نہ تھی۔ وہ اس بارے میں تفصیلاً بوتھ کے ساتھ مشورہ کرے گی۔

مانا کہ یہ ایک دھوکہ ہو گا، جو وہ ژان کو دے گی۔ مگر اس نے سوچا کہ یہ دھوکہ اچھی نیت سے دیا جائے گا۔ اس عمر کے بچے اس قسم کی خیالی باتوں کو دل و جان سے مانتے ہیں، یہ بات پکی ہے۔ مگر چونکہ اس نے پورے ایک سال تک اس بارے میں کچھ نہ کہا تھا، اس لئے شاید وہ اس کو اتنی اہمیت نہ دیتا تھا۔ واضح ہے کہ اس کی اس چھوٹی سی خواہش کو پورا کرنا پڑے گا۔ پھر اس کے بعد احتیاط کے ساتھ اس کو ساری بات بتانی ہو گی۔ اس وجہ سے اس کا دل تھوڑا ہی ٹوٹ جائے گا۔ آخر اس عمر میں بچوں کو جاننا پڑتا ہے کہ نہ تو ایسٹر کا خرگوش پایا جاتا ہے اور نہ ہی کرسمس کا سانتا کلاوز۔ ہم سب کو بھی تو، ڈورتے نے اپنی خیالی گفتگو میں سوچا، ہم کو بھی تو آخر یہ ماننا پڑا تھا اور جب ہمیں اصل حقیقت کا پتہ چلا تھا، تو سچی بات ہے کہ ہم کچھ ایسے حیران نہ ہوئے تھے۔ کیونکہ یہ شبہ ہمارے دل میں پہلے سے موجود تھا' ضرورت اب اس بات کی تھی کہ بچے کے خواب کو ہمبرگ کی جیتی جاگتی حقیقت میں ڈھال دیا جائے۔ اس رنگ میں اس نے ساری بات بوتھ کو بتائی۔

اس نے معاملے کو فوراً بھانپ لیا اور اپنے مالی کی بیٹی کرستینے کو بلا بھیجا۔ کرستینے کو، جو اٹھارہ برس کی تھی اور خوبصورتی اور ذہانت کا مرقع تھی، وہ پارٹ پسند آیا، جو اس کے لئے چنا گیا تھا۔

مسٹر یوستس، جسے ڈورتے نے ساری بات بتا دی تھی، نہ صرف ژان کو، بلکہ بوڑھی باورچن اور گھر کی خادمہ کو بھی فلوٹ بیک ساتھ لے جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ مگر وہ بے اعتباری سے بڑبڑایا کہ وہ ساری بات اسے کوئی ایسا اچھا شگون نہ

لگتی تھی۔

"اگر اس کو پتہ چل گیا، ڈورٹے، جو کچھ آپ کھیل بنا رہی ہیں، تو پھر شاید انجام ویسا نہ ہو گا، جیسا کہ آپ سمجھ رہی ہیں"۔

مگر ڈورٹے نے ضد میں سر کو ہلایا۔ مسٹر یوسٹس کو اس کی ساری اسکیم خراب نہ کرنی چاہیئے۔ بچہ اس کی ہر بات کو مانتا ہے۔ اس نے زور دے کر کہا اور سب جانتے ہیں کہ وہ بھی اس سے محبت کرتی ہے۔

"میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا اسے محبت کا نام دیا جا سکتا ہے" مسٹر یوسٹس نے کہا: "میں کاروباری ہوں اور محبت کے معاملات سے نابلد۔ مگر ایک بات میں آپ کو کہہ دیتا ہوں کہ اگر میرا کاروباری پارٹنر مجھے اس طریق سے دھوکہ دے، تو میں اس سے اپنی دوستی توڑ ڈالوں گا"۔

اب ڈورٹے ضد پر اتر آئی۔ کہنے لگی کہ وہ بچے کی کاروباری پارٹنر نہیں ہے۔ اور وہ اس بات کو بہتر سمجھتی ہے کہ بچے کا بھلا کس چیز میں ہے۔

"خوب" مسٹر یوسٹس نے کہا: "خدا کے نام پر"۔

ڈورٹے نے، جو آخری فقرہ کہے بغیر نہ رہ سکتی تھی، کسی قدر جوش و خروش سے کہا کہ مسٹر یوسٹس کو خدا کے بارے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ رہی یہ بات کہ ہر چیز ٹھیک ہو جائے گی، اس کی ذمہ داری وہ اٹھانے کو تیار تھی۔ آخر اس کا نام سینٹ کیتھرین چرچ کے سارے علاقے میں بلاوجہ ہی تو نہیں مشہور تھا اور عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس بارے میں وہ بڑے پادری ہرمن سے پوچھ سکتا ہے۔ بچے کی دلی خواہش کو اس طرح دھوکہ دیئے جانے کے بعد پورا کرنا ایک مسیحی فرض ہے۔ مسٹر یوسٹس کو بھی تو کچھ ایسا صدمہ نہ پہنچا تھا، جب اسے پتہ چلا تھا کہ ایسٹر کا خرگوش دراصل نہیں پایا جاتا۔

بوتھ کے گھر پر ایلب چوسے ۲۷۴ میں اگست کی اس سہانی شام کو ایک سو سے زیادہ لوگ جمع تھے۔ "یوسٹس کا کالا بھونگڑا" جس نام سے ژان کو سب لوگ جانتے تھے، اپنے لیموں جیسے زرد رنگ کے کوٹ اور ہلکے نیلے رنگ کی پتلون اور زعفرانی رنگ کے بوٹوں میں ملبوس، جن پر سونے کے تاروں سے نقش و نگار بنے

ہوئے تھے اور سر پر سرخ شملے والی سفید پگڑی پہنے ، پوری محفل کی آنکھوں کا تارا تھا۔ وہ مشروب اور کیک پیش کر رہا تھا۔ (" تمہیں شہزادی کی خاطر مشق کرنی ہو گی " ڈورٹے نے کہا تھا) مرد اسے بڑی فراخ دلی سے ٹپ دے رہے تھے اور عورتوں سے اسے بے شمار بوسے مل رہے تھے ... (" پیارا ہے کہ نہیں ؟ ") بالکل یوں لگتا تھا ، جیسے تھیٹر کا سماں ہو۔ ایکا ایکی بلند آواز سے کہا گیا : " شہزادی چاکولیٹ کا مشروب مانگتی ہے " ۔ ژان کو ، جو گھبراہٹ کی وجہ سے کانپ رہا تھا ، شہزادی کے کمرے کا رستہ دکھایا گیا۔ وہ چاندی کی طشتری کو ، جس پر چاندی کی چینک دھری ہوئی تھی ، مضبوطی سے پکڑے ہوئے اندر داخل ہوا اور لمبے سنہری بالوں والی شہزادی کے حضور کورنش بجالایا۔ اور چاکولیٹ کی پیالی بھر کر پیش کی ، بغیر اس کے کہ چھینٹے گرے ہوں۔ پھر اس سے کہا گیا :

" کیا تم آج پہلی بار یہ خدمت بجا لا رہے ہو ؟ "

" جی ہاں شہزادی " ۔

" تم سے بہتر شاید ہی کوئی کر سکے " ۔

" آپ بہت مہربان ہیں ، شہزادی " ۔

" طشتری کو وہاں پر رکھ دو " ۔

" جیسے آپ کا حکم ، شہزادی " ۔

" کیا نام ہے تمہارا ؟ "

" ابرا ... میرا مطلب ہے ژان کہتے ہیں مجھے " ۔

" میرے پاس آؤ ، پیارے ژان اور میرے گال پر بوسہ دو " ۔

ژان نے حکم کی تعمیل کی اور ایک باکرہ لڑکی کے جسم اور لاونڈل کی مسحور کر دینے والی خوشبو سونگھی۔ اس لمحے کالے ننھے نے اپنے دل میں عہد کیا کہ ہمیشہ کے لئے شہزادی کا وفادار رہے گا۔ اور اگر ضرورت پڑی ، تو اس کی خاطر جان دے دے گا۔

" تم واقع میں بہترین خادم ہو " شہزادی نے کہا " تم جیسا خادم مجھے کبھی نہیں ملا پیارے ژان اور شکریہ۔ صبح میں آٹھ بجے بیدار ہوں گی اور حمام کروں گی۔ تب

تم میری پیٹھ کو دھونا۔ صبح سویرے لاونڈل کا صابون ساتھ لیتے آنا اور یہ نہ بھولنا کہ میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں"۔

ژان طشتری کو اٹھائے ہوئے باہر نکلا اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے بادلوں پر چل رہا ہو۔ شہزادی کتنی اچھی ہے اور کیسی فرشتوں کی مانند اس کی خوشبو ہے۔ اور اب وہ صبح سویرے اس کی پیٹھ بھی دھوئے گا۔ یہ انعام کس چیز کے بدلے ملا تھا۔ وہ فوراً خوبصورت ترین اسفنج اس کے لئے ڈھونڈے گا۔ بے حد نرم اور بہترین خوشبو والا لاونڈل صابون۔ " میں تم سے پیار کرتی ہوں " اس نے کہا تھا۔ وہ یقیناً اس قابل نہیں ہے۔

وہ باورچی خانے میں گیا، جہاں پر سب بیٹھے ہوئے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ ہاں وہ اس کے ساتھ خوش ہو رہے تھے۔ اور یہ بات کتنی بھلی تھی۔ اس نے طشتری کو رکھ دیا۔ " مجھے شہزادی کے لئے لاونڈل صابون چاہیئے " اس نے خوشی سے دمکتے ہوئے کہا۔ قہقہوں کا شور اٹھا اور تالیاں بجائی گیئں: "لڑکی نے اپنا پارٹ خوب کھیلا تھا"۔

بچے نے، جو اس ساری بات کو نہ سمجھ پایا تھا اور نہ اس کو اپنے آپ سے منسوب کر رہا تھا، اپنی بات کو دہرایا: " سن رہے ہو؟ لاونڈل صابون "۔

" ارے بدھو " مالی نے کہا " اس بات پر مت جاؤ۔ شہزادی میری بیٹی ہے۔ سمجھتے ہو اس بات کو۔ انہوں نے تمہیں بس الو بنایا ہے "۔

" الو بنانا " اس کو ابھی ژان نہیں سمجھتا تھا۔ مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ کچھ ایسی اچھی بات نہ تھی۔

" ہاں " اس نے کہا اور بات کو ان سنی کرتے ہوئے کہنے لگا: " مجھے ایک نرم اسفنج بھی چاہیئے۔ مجھے صبح سویرے اس کی پیٹھ دھونی ہو گی "۔

" فیٹے " ایک آدمی نے مالی سے کہا: " کیا تمہارا خیال نہیں ہے کہ تمہاری کرسٹینے کھیل میں بہت دور نکل گئی ہے؟ "

" میرا بھی یہی خیال ہے " مالی نے کہا اور اس نے باورچی خانے کی میز پر مکہ مارا، پھر اس نے رخ پھیرا اور بچے پر گرجا: " اب ختم کرو اس بات کو، تم کالے لید کے

ٹکڑے۔ دفع ہو جاؤ۔ لنگر اٹھاؤ"۔

بچہ ڈر گیا۔ اسے ڈورتے نظر آئی اور اس کی پناہ لی: "ناں، ناں" اس نے بچے کی سوالیہ نظروں کا جواب دیا: "یہ بس ایک چھوٹا سا کھیل تھا، سمجھتے ہو تم۔ بس ایک تماشا۔ کرسٹینے شہزادی نہیں ہے۔ مگر ہم تمہیں خوش کرنا چاہتے تھے"۔ اور وہ دھیرے دھیرے ہنسنے لگی۔

بوتھ کے انگریز باورچی نے سر کو ہلایا: "دیٹ از رائٹ، مائی بوائے۔ ڈونٹ بی غمگین۔ اٹ واز فار فن۔ سمجھتے ہو۔ بس مذاق اور کھوسی۔ دیٹ از آل"۔

گویا شہزادی بھی نہیں؟ اور ساری بات بس مذاق تھی؟

راستے میں ایلب چوسے پر بے تحاشا بھاگتے ہوئے وہ بار بار دھراتا جاتا تھا: "بس مذاق اور کھوسی"۔

وہ بھاگتا چلا گیا۔ اور بھاگتا رہا، بھاگتا رہا۔ گرمیوں کی ہلکی سی بارش ہوئی اور اس کو بھگو گئی۔ مگر ژان کو اس کی پرواہ نہ تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں جا رہا تھا' بس کہیں دور۔

سب نے اس کا تمسخر اڑایا تھا۔ نوکروں نے اور مہمانوں نے، نقلی شہزادی نے اور جو بات سب سے زیادہ سنگین تھی، ڈورتے نے بھی۔ وہ تو ہنسی بھی تھی۔ گویا شہزادی کا کوئی وجود نہیں ہے۔ یقیناً اس بات کا علم سینٹ تھوماس میں بھی لوگوں کو تھا، جیسے کہ مسٹر یوسٹس کو پتہ تھا، جس نے اپنے تمباکو کے ڈبے پر تصویر بنوا رکھی تھی۔ اور یہ بات ڈورتے بھی جانتی تھی۔ تو سارے کا سارا بس جھوٹ تھا۔ اس کا تمسخر اڑانے کے لئے، اس کو بے وطن کرنے کی خاطر۔

وہ ایلب چوسے پر شہر کی طرف بھاگتا رہا تھا، پالملئے کے متوازی۔ بندرگاہ سے گزرتا ہوا اور اب بروک کے پل پر آن پہنچا تھا۔

ڈون فلیٹ کے پانی میں پورن ماشی کا چاند چمک رہا تھا۔ ژان اس چھوٹی سی دیوار کے پاس کھڑا تھا، جو سڑک اور پانی کے درمیان حائل تھی۔ ہلکی دھیمی روشنی میں کوئی فرق نہ پڑا، جب اس نے کہا: "سب نے میرا تمسخر اڑایا تھا"۔

وہ دیوار پر چڑھ گیا اور اس نے سفید روشنی کو پانی میں گرتے ہوئے دیکھا۔

کبھی نہ بھولنا کہ چاند دیوی تمہاری حفاظت کرتی ہے۔ اس کی نانی نے رخصت کے وقت اس سے سرگوشی کی تھی۔ چاندی کا ایک سکہ، جس پر دیوی کی تصویر بنی ہوئی تھی، اس نے اس کی جیب میں ڈال دیا تھا۔ تم اس سے بات کرنا، جب کبھی تمہیں خطرے کا سامنا کرنا پڑے۔ بہتر ہوگا جب اس کا عکس پانی میں پڑ رہا ہو۔ تمہاری آنجہانی ماں اس کے پاس ہوتی ہے اور وہ تمہیں دیکھتی ہے۔

"مجھے جواب دو"۔

مگر دیوی چپ سادھے رہی اور چمکتی رہی۔

"شہزادی پائی ہی نہیں جاتی۔ سرے سے تھی ہی نہیں"۔ اس کے منہ سے نکلا: "وہ سب اس بات کو جانتے تھے، مگر انہوں نے کچھ نہ کہا۔ کیونکہ وہ میرا تمسخر اڑانا چاہتے تھے"۔

دیوی چمکتی رہی اور چپ سادھے رہی۔

"مگر ڈورٹے" اور اب وہ رونے لگا تھا: "ڈورٹے، تمہیں ساری بات کا پتہ تھا پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟" آنسو اس کے چہرے پر بہہ رہے تھے، جب اس نے بلند آواز سے کہا:

سویا ہوا ہوں یا جاگ رہا ہوں
بیٹھا ہوا ہوں یا بھاگ رہا ہوں
سدا تمہارا خدمتگار
میری ہو تم ازلاً ابداً
پکا تم سے یہ اقرار
چاہے کچھ بھی کرتا ہوں
راتوں کو یا دن کے سمے
قصر میں گویا بستا ہوں
باہوں میں اپنی تھامو مجھ کو
چومو چومو گود میں لے لو

خوش ہوں یہاں پر اور وہاں پر

"ڈورٹے، او ڈورٹے، تم نے یہ کیوں کیا؟ تم نے کیوں مجھ سے یہ سلوک کیا تم کیوں مجھ سے محبت نہیں کرتی ہو؟"

وہ پانی میں گھورتا رہا اور سفید دیوی کو تکتا رہا، جو جواب نہیں دیتی تھی۔

مگر پھر دیوی نے اپنے بازو پھیلا دیئے: "آؤ میرے پاس، میں تمہیں تمہاری ماں کے پاس لے چلتی ہوں"۔

اور بچے نے سرگوشی میں کہا: "ہاں، میں تمہارے پاس آرہا ہوں"۔

فنکن ویرڈر کے دو مچھیروں کو ننھے کالے ابراہیم... ژان کی لاش بندرگاہ میں سے ملی۔ اور انہوں نے اسے پانی میں سے نکالا۔ اس کو کیتھرین چرچ کے قبرستان میں دفن کیا گیا اور اس کے کتبے پر اس کا نیا نام اور وفات کی تاریخ درج کی گئی۔ اس کا خاندانی نام کیا تھا اور وہ کب پیدا ہوا تھا، اس کو کوئی نہیں جانتا تھا۔

پیٹر بخسل

Peter Bichsel

غیر معمولی یادداشت والا شخص

میں ایک شخص کو جانتا تھا، جسے سارا ٹائم ٹیبل زبانی یاد تھا۔ کیونکہ واحد شے، جو اس کے لئے خوشی کا موجب تھی، وہ ریل گاڑی تھی۔ وہ اپنا وقت ریلوے اسٹیشن پر گاڑیوں کو آتے اور جاتے ہوئے دیکھنے میں گذارا کرتا تھا۔ وہ حیرت بھری نظروں سے ڈبوں، انجنوں کی طاقت اور پہیوں کے سائز کو اور چلتی گاڑی پر چھلانگ لگا کر سوار ہونے والے گارڈوں اور اسٹیشن ماسٹر کو دیکھا کرتا تھا۔

وہ ہر گاڑی کو جانتا تھا اور اس امر کو کہ وہ کہاں سے آئی ہے اور کہاں گئی ہے اور کب کس جگہ پر پہنچے گی اور کب وہاں سے دوسری گاڑیاں چلیں گی اور کب اپنی منزل پر پہنچیں گی۔

اسے گاڑیوں کے نمبر معلوم تھے اور یہ بات کہ وہ کن دنوں میں چلتی ہیں اور کیا ان میں ڈائیننگ کار ہوتی ہے اور کیا (جنکشنوں پر وہ دوسری گاڑیوں سے اترنے والی) سواریوں کا انتظار کرتی ہیں یا نہیں۔ اسے پتہ تھا کہ کن گاڑیوں میں ڈاک کا ڈبہ ہوتا ہے اور گاڑی کے ٹکٹ کی قیمت فراون فیلڈ کے لئے، اولٹن، فیڈر بپ یا دوسری جگہوں کے لئے کتنی ہے۔

وہ کسی شراب خانے یا سینما میں نہیں جاتا تھا، نہ ہی سیر کرتا تھا۔ اس کے پاس بائیسکل تھی نہ ریڈیو یا ٹیلی ویژن۔ وہ اخباریں پڑھتا تھا نہ کتابیں۔ اور اگر بالفرض اسے خط آجاتے، تو یہ امر یقینی ہے کہ وہ انہیں بھی نہ پڑھتا۔ اس کام کے لئے اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ کیونکہ وہ سارا دن ریلوے اسٹیشن پر گذارتا تھا اور صرف ان دنوں میں جب ٹائم ٹیبل بدلتا تھا، مئی اور اکتوبر میں، تو وہ چند دنوں کے لئے نظر نہ آتا تھا۔

تب وہ اپنے گھر میں میز پر بیٹھا ہوا زبانی یاد کر رہا ہوتا تھا۔ وہ نئے ٹائم ٹیبل کو پہلے صفحے سے آخری صفحے تک پڑھتا اور تمام تبدیلیوں کو ازبر کر لیتا تھا۔ اور ان تبدیلیوں پر خوشی سے پھولے نہ سماتا تھا۔

یوں بھی ہوا کہ کسی نے اس سے گاڑی کے چھوٹنے کا وقت پوچھ لیا۔ اس پر اس کا چہرہ کھل جاتا تھا۔ اور وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ سفر کی منزل کیا ہے۔ اور جو کوئی اس سے وقت پوچھ لیتا تھا، وہ یقیناً اپنی گاڑی کھو بیٹھتا تھا۔ کیونکہ وہ سوال کرنے والے کی جان خلاصی نہیں کرتا تھا۔ یہ بات اسے مطمئن نہ کر سکتی تھی کہ وہ صرف گاڑی کے چلنے کا وقت بتائے۔ وہ ساتھ کے ساتھ گاڑی کا نمبر، ڈبوں کی تعداد، دوسری گاڑیوں کے ساتھ اس کا میل اور ان گاڑیوں کے چھوٹنے کے اوقات بھی بتاتا تھا۔ یہ امر بھی کہ انسان اس گاڑی سے پیرس کا سفر کر سکتا تھا، جہاں پر گاڑی بدلنی ہو گی اور یہ کہ گاڑی وہاں پر کس وقت پہنچے گی۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ لوگوں کو ان معلومات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اگر کوئی اسے کھڑا چھوڑ کر آگے چل دیتا تھا، پیشتر اس کے کہ وہ اپنا سارا علم بے نقاب کر چکا ہو، تو وہ اس بات پر سخت برہم ہو جاتا تھا۔ وہ انھیں سخت سست کہتا اور اونچی آواز سے پکارتا تھا:

"آپ ریل گاڑیوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں!"

مگر وہ خود کبھی کسی گاڑی میں سوار نہ ہوتا تھا۔

یہ بات یوں بھی بے مقصد ہے، اس کا کہنا تھا، کیونکہ اسے پہلے سے علم ہے کہ گاڑی کب منزل مقصود پر پہنچے گی۔

"گاڑیوں میں صرف ایسے لوگ سفر کرتے ہیں، جن کا حافظہ کمزور ہوتا ہے" اس کا کہنا تھا "کیونکہ اگر ان کی یادداشت اچھی ہوتی، تو وہ میری طرح گاڑیوں کے چھوٹنے اور پہنچنے کے اوقات کو ازبر کر لیتے اور انہیں ان اوقات کو معلوم کرنے کے لئے سفر کرنے کی حاجت پیش نہ آتی"۔

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ میں نے کہا "بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو سفر کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ وہ چاؤ سے ریل گاڑی کا سفر کرتے ہیں اور کھڑکی میں سے باہر جھانکتے اور جن جگہوں سے گذرتے ہیں، انہیں دیکھتے ہیں"۔

اس پر وہ طیش میں آگیا، کیونکہ اسے خیال پیدا ہوا کہ میں اس کا مذاق اڑانا چاہتا تھا۔ اس نے کہا" یہ بات بھی ٹائم ٹیبل میں درج ہے کہ آپ لوتھر باخ، ڈائیٹنگن، وانگن، نیڈر بپ، اونسنگن، اوبر بخسٹن، ایگر گنگن اور ہیگنڈورف سے گذریں گے"۔

" ممکن ہے کہ لوگ گاڑی کا سفر اس وجہ سے کرتے ہیں کیونکہ انہیں کہیں پر جانا ہوتا ہے"۔ میں نے کہا۔

" یہ بات بھی درست نہیں ہو سکتی" اس نے کہا" کیونکہ تقریباً سبھی لوگ کبھی نہ کبھی واپس لوٹ آتے ہیں۔ بعض تو ایسے بھی ہوتے ہیں، جو ہر صبح یہاں گاڑی میں سوار ہوتے ہیں اور شام کو واپس لوٹ آتے ہیں.... ان کی یادداشت اس قدر ناقص ہے"۔

اس نے اسٹیشن پر لوگوں کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ وہ انہیں پکار پکار کے کہتا" الو کے پٹھو، تمہاری یادداشت ہے ہی نہیں"۔ وہ انہیں آواز دیتا" تم ہیگنڈورف سے گذرو گے"۔

وہ پکار کر کہتا" بے وقوفو، تم نے کل بھی یہ سفر کیا تھا"۔ اور جب لوگ یہ سن کر ہنسنے لگے، تو وہ انہیں پائیدانوں سے کھینچ کھینچ کر نیچے اتارنے کو کوشش کرنے لگا۔ اور انہیں دہائی دینے لگا کہ گاڑی کا سفر نہ کریں۔

" میں تمہیں سب کچھ بتا سکتا ہوں" اس نے چیخ کر کہا" تم دو بج کر ستائیس منٹ پر ہیگنڈورف سے گذرو گے۔ مجھے اس بات کا یقینی علم ہے۔ تم دیکھ لو گے کہ تم اپنے پیسے فضول خرچ کر رہے ہو۔ ٹائم ٹیبل میں سب کچھ درج ہے"۔

وہ لوگوں کو پیٹنے کی کوشش کرنے لگا۔

" جو کوئی میری نصیحت پر کان نہیں دھرتا، اسے اس کا مزہ چکھنا ہو گا"۔ اس نے چلا کر کہا۔

اسٹیشن ماسٹر کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا کہ اسے کہے کہ اگر اس نے شریفانہ طرز عمل کو نہ اپنایا، تو وہ اس کا داخلہ اسٹیشن پر بند کرنے پر مجبور ہو جائیگا۔ اس پر وہ شخص گھبرا گیا، کیونکہ وہ اسٹیشن کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس

کے بعد اس نے کوئی لفظ تک نہ کہا۔ وہ سارا دن ایک بنچ پر بیٹھا رہتا، گاڑیوں کو آتے اور ان کو روانہ ہوتے ہوئے دیکھتا اور صرف کبھی کبھار چند ہندسے دھیرے سے بڑبڑاتا تھا۔ وہ لوگوں کی طرف دیکھتا تھا اور ان کے طرز عمل کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

کہانی دراصل یہاں پر ختم ہو جانی چاہیئے۔

مگر سالہا سال کے بعد اسٹیشن پر ایک دفتر معلومات کھولا گیا، جس میں ایک کلرک یونیفارم پہنے ایک کھڑکی کے پیچھے بیٹھا ہوتا تھا۔ وہ گاڑیوں کے بارہ میں تمام سوالات کا جواب دے سکتا تھا۔ اس بات پر اس یادداشت والے شخص کو یقین نہیں آتا تھا۔ اس وجہ سے وہ ہر روز دفتر معلومات میں جاتا اور کلرک کا امتحان لینے کے لئے کوئی پیچیدہ سی بات پوچھتا تھا۔

اس نے پوچھا "اس گاڑی کا نمبر کیا ہے، جو چار بجکر چوبیس منٹ بعد از دوپہر اتوار کے روز گرمیوں کے مہینوں میں لیوبک پہنچتی ہے؟"

کلرک نے ایک کتاب کھولی اور مطلوبہ نمبر بتا دیا۔

اس نے پوچھا "میں موسکو کب پہنچوں گا، اگر میں یہاں سے نو بجکر انچاس منٹ کی گاڑی لوں؟" اور کلرک نے اسے بتا دیا۔

تب وہ یادداشت والا شخص گھر گیا۔ اس نے تمام ٹائم ٹیبلوں کو جلا ڈالا اور ہر بات کو بھلا دیا، جسے وہ جانتا تھا۔

دوسرے روز اس نے کلرک سے پوچھا "اسٹیشن کے باہر والی سیڑھی کے زینے کتنے ہیں؟" اور کلرک نے جواب دیا "مجھے معلوم نہیں"۔

اب وہ شخص اسٹیشن کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بھاگتا اور خوشی کے مارے چھلانگیں لگاتا اور پکارتا چلا گیا "اسے معلوم نہیں، اسے معلوم نہیں"

وہ گیا اور اس نے اسٹیشن کی سیڑھی کے زینے گنے اور ان کی تعداد کو اپنی یادداشت میں محفوظ کر لیا، جس میں اب گاڑیوں کی روانگی کے اوقات موجود نہ تھے۔

اس دن کے بعد کسی نے اسے ریلوے اسٹیشن پر نہیں دیکھا۔

اب وہ شہر میں باری باری ہر گھر میں گیا اور اس کے زینوں کو گنا اور ان کی تعداد کو محفوظ کر لیا۔ اب اسے ایسے ہندسوں کا علم تھا، جو دنیا کی کسی کتاب میں درج نہیں ہیں۔

جب اس نے سارے شہر کے زینوں کی تعداد کو جان لیا، تو وہ ریلوے اسٹیشن پر آیا اور ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر گیا۔ اس نے ایک ٹکٹ خریدا اور اپنی زندگی میں پہلی بار ایک دوسرے شہر جانے کے لئے ایک گاڑی میں سوار ہوا، وہاں پر زینوں کی تعداد کو گننے کی خاطر۔ اور اس کے بعد آگے سفر کرنے اور دنیا بھر کے زینوں کو گننے اور ایک ایسی چیز کو جاننے کے لئے، جس کا علم کسی دوسرے شخص کو نہیں اور جسے کوئی کلرک کسی کتاب میں سے معلوم نہیں کر سکتا۔

کرسٹوف میکل
Christoph Meckel

میرا بادشاہ

ایک تھکا دینے والی کانفرنس کے بعد، جس کے دوران میرے بادشاہ نے اپنے دو مشیروں کو گولی مار دی تھی۔ کیونکہ وہ ایک معاملے میں کھلم کھلا احتجاجوں کے سبب رنجیدہ تھا۔ میرے بادشاہ نے مجھے سیر کے لئے چلنے کی دعوت دی۔ ہم دونوں تھکاوٹ سے چور تھے، سروں کو ٹھنڈا کرنے کے خواہشمند تھے۔ اور چونکہ سہ پہر خوبصورت تھی، میں نے حیل وحجت نہ کی اور اپنے بادشاہ کے ساتھ ہو لیا۔

ہم قریب قریب گفتگو کرنے کے بغیر باغ کے قطعوں میں سے گذرتے ہوئے آخر میں سبزہ زاروں کے لمبے چوڑے تختوں کے بیچوں بیچ بنائی گئی ایک چیز کے پاس سے گذرے، جس نے میرے بادشاہ کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیا۔

دیکھو کنڈوتزے، میرے بادشاہ نے نیم شک کرتے ہوئے، نیم تفنن سے کہا ایک ایسی مچان میرے باغ میں! میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ تمہارا کیا خیال ہے

میرے بادشاہ اس کو حال ہی میں بنایا گیا ہے۔ میں نے جواب دیا۔

مجھے کیوں اس کے افتتاح کے موقعہ پر نہیں بلایا گیا۔ میرے بادشاہ نے پوچھا اور میری طرف شک کی نظر سے دیکھا۔

بادشاہ سلامت جان کی امان۔ میں نے جواب دیا۔ اس کا افتتاح ابھی نہیں ہوا ہے۔

ہم ان قطعوں کے گرد گھوم کر گئے، جن کے درمیان متذکرہ چیز، جو خاصی بڑی تھی، کھڑی تھی۔ میرے بادشاہ کو اس میں دلچسپی لگتی تھی، کیونکہ اس نے کچھ دیر کے بعد کہا۔

کیا خیال ہے تمہارا کنڈوتزے، کیا آدمی ممانعت کی تختیوں کے ہوتے ہوئے سبزہ زار میں داخل ہو سکتا ہے۔ اس چیز.... اس مچان کی طرف، اسے قریب سے دیکھنے کے لئے؟

بادشاہ سلامت کو غور فرمانا چاہیئے، میں نے کہا کہ دوسرے سیر کرنے والے بھی باغ میں موجود ہیں۔ اور یہ امر ناگوار لگنے اور رنج پیدا کرنے کا باعث بن سکتا ہے جب بادشاہ سلامت، جنہوں نے ممانعت کی تختیوں کو باغ کے قطعوں کے کناروں پر لگانے کا حکم دیا تھا، خود ہی سب سے پہلے ان کی خلاف ورزی کریں گے۔ جیسا کہ بادشاہ سلامت کے علم میں ہے، خلاف ورزی کرنے والے کی گردن ماری جائے گی۔

تم شاید ٹھیک ہی کہتے ہو، میرے بادشاہ نے خفگی سے کہا۔ چلو پھر ہم مچان کو فاصلے سے ہی دیکھتے ہیں۔

بادشاہ سلامت معاف فرمائیں، میں نے کہا، مگر عام طور سے لوگ اس.... اس مچان کو محض مچان ہی نہیں سمجھتے، جیسے کہ بادشاہ سلامت اس کو پکارتے ہیں، بلکہ لوگ اس مچان کو، اس عمارت کو ایک جنگی یادگار سمجھتے ہیں۔

ایک جنگی یادگار؟ میرا بادشاہ سخت رنجیدہ تھا۔ ذرا دیکھو تو کنڈوتزے...

درست، میں نے جواب دیا، مگر بادشاہ سلامت میں خود بھی اس عمارت کو ایک حد تک ایک جنگی یادگار سمجھنے کی طرف رجحان رکھتا ہوں۔

یہ تو... یہ بہر صورت ایک مچان ہے، میرے بادشاہ نے غصے سے کہا۔ مجھے صاف دکھائی دیتا ہے کہ یہ ایک مچان ہے اور سوائے مچان کے اور کچھ بھی نہیں...

بادشاہ سلامت کو یقین کرنا چاہیئے، میں نے اپنے بادشاہ کی بات کاٹی، کہ یہ چیز جنگی یادگار ہو سکتی ہے۔ میرے زور دینے والے انداز بیان سے بادشاہ شک میں پڑتا ہوا لگا۔ اس نے فوراً جواب نہ دیا اور کافی دیر کے بعد، جس کے دوران ہم خیالات میں ڈوبے ہوئے چوتھی یا پانچویں بار قطعے کے گرد گھوم چکے تھے، میرے بادشاہ نے کہا:

اور میں دعویٰ کرتا ہوں کہ یہ چیز یہاں پر ایک مچان ہے اور ایک جنگی یادگار بہر صورت نہیں۔ ایک جنگی یادگار کہتے ہو تم کنڈوتزے؟

بادشاہ سلامت فرماتے ہیں، میں نے جواب دیا۔

میں تمہاری بات نہیں مانتا۔ میرے بادشاہ نے ایک طرف سے تکتے ہوئے مختصراً کہا۔

ہاں تو ماننا یا نہ ماننا بادشاہ سلامت کے اختیار میں ہے، میں نے جواب دیا۔

اور تم اس بات پر اصرار کرتے ہو، میرے بادشاہ نے پوچھا۔

شاید، میں نے جواب دیا۔

ہوں، میرے بادشاہ نے کہا۔ کیا ہمیں آگے نہیں چلنا چاہیئے؟

ہم نے اپنا راستہ لیا۔ باغ کے دوسرے حصوں میں سے گذرے اور واپسی کے رستے پر پھر اس چیز کی طرف آئے۔

پھر اس معاملے کی طرف آتے ہوئے میرے بادشاہ نے کہا: تم اب بھی پہلے کی طرح یہی سمجھتے ہو کہ یہ ایک جنگی یادگار ہے؟

یقیناً بادشاہ سلامت، میں نے جواب دیا۔ اور میں، اگر بادشاہ سلامت اجازت دیں، اس دوران میں اس چیز کو دیر تک دیکھنے کے بعد بادشاہ سلامت کی مچان کو ایک پانی گھر سمجھنے لگا ہوں۔ مگر اس سے میں اپنی جنگی یادگار کی کسی طرح تردید نہیں کرتا ہوں۔

مگر تمہیں یہ خیال کیسے آیا کہ یہ پانی گھر ہو سکتا ہے... میرے بادشاہ نے غصے کے ساتھ اور اونچی آواز میں کہا۔

خیال کا یہاں پر کیا ذکر۔ میں نے ادب سے کہا۔ میں اس بات پر کہ یہ ایک مچان ہے، بالکل بحث نہیں کرنی چاہتا، بلکہ اس کو اپنی جنگی یادگار کی طرح رد کرتا ہوں۔ جیسے کہ ہر کوئی جانتا ہے، ان باتوں میں فرق پایا جاتا ہے۔

مگر تمہیں اس چیز کو ماننا چاہیئے، جس کو تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو۔

تم... خدا کی مار، میرا بادشاہ چلایا۔

بادشاہ سلامت مجھے معاف فرمائیں، میں نے سکون سے جواب دیا، میں یہی کچھ کر رہا ہوں۔ مگر جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں، وہ دوسری ممکنہ چیزوں کی نفی نہیں کرتا عوام میں بھی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ بعض موسیقی کی شہ نشین کی بات کرتے

ہیں ۔ دوسرے بت کے چبوترے کی ۔ اور لوگوں کو اس میں ایک جدید عبادت گاہ دکھائی دیتی ہے ۔ بعض بے شرم زبانیں ایسی بھی ہیں ، جو بیت الخلا کی بات کرتی ہیں' میں البتہ ، اگر یہ بات بادشاہ سلامت کی طبیعت پر بوجھ کا باعث نہ ہو ، تو مزید ایک اور ، جیسا کہ میرا خیال ہے ، نہایت اہم امکان کو زیر بحث لا سکتا ہوں ...

نہیں ، میرے بادشاہ نے جھنجلا کر کہا ۔ مجھے یوں بھی یقین ہے ، فی الواقعہ ، میرے خیال میں اب مجھے نظر آرہا ہے ، سچ مچ ، مگر میں دیکھتا ہوں ...

خاموشی سے ہم اپنے رستے پر چلتے رہے اور مجھے اپنے بادشاہ کا رویہ میری خیر و عافیت کے سلسلے میں کسی قدر پریشان کن لگا ۔

اگلے روز میرے بادشاہ نے اپنے ایک اعتباری کے ہاتھ دوپہر کا کھانا میری رہائش گاہ پر بھجوایا ۔ اعتباری کو مناسب وقفے کے بعد آکر برتن لے جانے کی ہدایت تھی ۔ کھانا میں نے محتاط طریق سے کھایا ۔ کیونکہ مجھے نہایت واضح طور پر ایک واقعہ یاد تھا ، جو میری زندگی کو بے حد خطرے میں ڈالتے ہوئے ایک شکار کے دوران پیش آیا تھا ، جس میں شرکت کی میرے بادشاہ نے چند ہفتے قبل دعوت دی تھی ، جس کا مطلب ہے ، حکم دیا تھا ۔ میں نے شراب کو طشتری پر واپس رکھ دیا ، کیونکہ اس میں سے ایک عجیب سی بو آرہی تھی ۔ دوسری چیزوں کی خوشبو اور ذائقہ ویسا ہی تھا ، جیسا کہ ہونا چاہیئے ۔ اعتباری لوٹ کر آیا اور برتن بمعہ شراب کے اٹھا کر لے گیا ۔ تھوڑی دیر کے بعد میرے نوکر نے اطلاع دی کہ بادشاہ کا اعتباری آدمی برتنوں سمیت سیڑھیوں پر سے گر گیا تھا ۔ سب کچھ چکنا چور ہوا پڑا تھا اور ہمارے بادشاہ کا اعتباری ابھی ابھی منہ پر جھاگ لئے ہوئے ابدی نیند سو گیا تھا ۔

پیشتر اس کے کہ میں اسی گھڑی ملک کو چھوڑ گیا ، میں نے اپنے بادشاہ کے نام یہ پیغام لکھا:

مجھے افسوس ہے کہ بادشاہ سلامت نے اپنے اعتباری کی اس قدر ناقص تربیت کی ہے ، اتنی کم غذا دی ہے یا اس کو اس قدر کھینچ کر رکھا ہے کہ جیسا کہ ابھی وقوع میں آیا ہے ، بادشاہ سلامت کا اعتباری وہ شراب ، جو بادشاہ سلامت نے مجھے ، کنڈوتزے ، کو بھیجنے کا حکم دیا تھا ، برتن اٹھا کر لے جاتے ہوئے سیڑھیوں پر پی گیا ہے'

مجھے اس حادثے کا افسوس ہے، کیونکہ اعتباری ان چیزوں کی پاداش میں، جو بادشاہ سلامت میرے لئے مخصوص تھیں، فوت ہو گیا ہے۔ واضح طور پر سیدھی سادی باتوں کے نتیجے میں مخصوص تھیں، جن کا اظہار میں نے اس خاص چیز کے بارے میں کرنے کی جرأت کی تھی۔ اور اگرچہ میں بادشاہ سلامت کو اس سے سوائے اس نتیجہ کے جو بادشاہ سلامت نکال چکے ہیں، کوئی دوسرا نتیجہ نکالنے کا مشورہ نہیں دے سکتا، میں اپنے آپ کو اس بات کا پابند سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنی سلامتی نفس کی خاطر فوراً رخصت لینی چاہیئے...

لوگوں نے مجھے بعد میں بتایا کہ اس نے شور شرابا مچایا اور چھ آئینے توڑ ڈالے، مجھے یہ بات قرین قیاس لگتی ہے، مگر مجھے اعتبار نہیں ہے کہ اس کے سوا کچھ قابل ذکر اثر اس کے اندرونے پر بھی پڑا تھا۔

والٹر کاپاخر
Walter Kappacher

نئی عینک

کچھ دنوں سے مسٹر یاٹز کراس ورڈ معموں کو حل کرنے کے لئے ، جو اس کی اولین مصروفیت تھی ، عینک کا استعمال کرتا تھا۔ اس کی آنکھیں کچھ عرصے سے بہت جلد تھک جاتی تھیں۔ اس وجہ سے وہ ڈاکٹر کے پاس گیا تھا، جس نے اسے فوری طور پر عینک استعمال کرنے کو کہا۔

یہ امر کچھ ایسا واضح نہیں ہے کہ عینک کا ان احوال سے کیا تعلق ہے، جن کا ذکر یہاں پر مقصود ہے۔ بات یوں ہے کہ عینک کی خریداری وقت کے اعتبار سے اس لمحے کے پہلو بہ پہلو عمل میں آئی ، جب سے ... بس کھل کے کہہ دیتے ہیں ... اس کو بعض اوقات اپنی عقل پر شبہ ہونے لگا ہے۔

اس کی ابتداء یوں ہوئی کہ اس نے ایک روز مالٹز کا لفظ عمودی خانوں میں درج کیا اور پھر اس لفظ پر، جو کسی طور سے غیر معمولی نہیں ہے، ایک لمبے عرصے تک ، جیسا کہ اس نے محسوس کیا، نظر ٹکائے رہا۔ اس کو لگا کہ اس کے لئے عینک کے ساتھ پڑھنا عینک کے بغیر پڑھنے سے زیادہ دشوار تھا۔

اس نے عینک لگائی اور اس سے ایک لفظ یا ایک فقرے کو دیکھنے لگا۔ پھر اسے ناک کی پشت پر سے اس جگہ کو شیشوں کے بغیر دیکھنے کے لئے اتارا۔ اسے کوئی فرق نظر نہ آیا۔ تمہیں ابھی عینک لگانے کی عادت نہیں ہے، اس نے سوچا۔ بعد میں مسٹر یاٹز کو صرف یہ بات یاد رہی کہ وہ مکمل طور پر خالی الذہن ہو کر ایک لمبے عرصے تک مالٹز کے لفظ کو گھورتا رہا تھا۔ اور یہ کہ جتنا لمبا عرصہ وہ اس کی طرف تکتا رہا، اتنا ہی وہ لفظ اجنبی سے اجنبی تر لگنے لگا تھا۔ اور جتنی بار وہ اس لفظ مالٹز کو اوپر سے نیچے حرف حرف پڑھتا تھا، اسی قدر وہ لفظ اس کے لئے بے معنی ہوتا چلا گیا۔ بالآخر اس نے اس لفظ کو کئی بار اونچی

آواز سے ادا کیا۔ اس سے کوئی نتیجہ نہیں نکالنا چاہیئے، اس نے سوچا، بس وقتی طور پر اٹھاؤ اور اس نے اپنی توجہ کو ایک اور لفظ کی طرف مبذول کر لیا: لفظ سمر۔ اس کو سمر کے ساتھ وہی مالٹر والا ماجرا پیش آیا۔ لفظ سمر کم و بیش دس بار پڑھے جانے کے بعد اس کے لئے ایک اجنبی لفظ بن گیا، بلا مطلب... سمر، سمر، سمر اس نے چلانا شروع کیا۔ مگر اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اگر آدمی اس بات کو اہمیت نہ دے کہ لفظ سمر اس کے دماغ میں یکدم لفظ صنوبر کے ذریعہ ایک طرف دھکیل دیا گیا۔ صنوبر سے اس کا خیال سرخی کی طرف گیا اور ڈر کے مارے اس نے فوراً لفظ صنوبر کی تحقیق کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس طرح تو آدمی پاگل ہو جائے، اس نے سوچا۔ ہیٹ اور اوور کوٹ کو لے کر وہ سیر کرنے کے لئے نکل گیا۔

وہ سیر کرتا ہوا موکرن روڈ پر سے گزرا، اس کا معمول کا رستہ۔ نہر کو پار کیا، دائیں ہاتھ والے ویران کوچہ کی طرف مڑا اور ہمیشہ کی طرح کیمسٹ مائیر کے باغ میں بنے ہوئے بنگلے پر نظر ڈالنے کے لئے رک گیا۔ مائیر اس کا اسکول کے دنوں کا دوست تھا، جس کے ساتھ البتہ کئی برسوں سے اس کا آنا جانا بند تھا۔ یاٹز خوابوں میں کھویا ہوا کھڑا تھا اور مکان کو گھورے جا رہا تھا، جیسے اسے اس کے اپنی جگہ پر پائے جانے کے باعث حیرت ہو رہی تھی۔ مکان کے سامنے والے حصے پر نیا روغن نہیں ہوا تھا۔ مکان میں کوئی چیز ایسی اوپری نہ تھی۔ انگور کی بیل ہمیشہ کی طرح پہلو والے حصے پر چڑھی ہوئی تھی۔ ہمیشہ کی طرح؟ اس کو لگا کہ اس پر پھر وہی حالت طاری ہونے لگی تھی۔ ہپناٹزم جیسی قوت کے ساتھ کیمسٹ کا مکان اس کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ جلد ہی اس کو لگنے لگا کہ وہ مکان، جسے وہ بے شمار سیروں سے جانتا تھا، اس کے اسکول کے دوست کا نہیں تھا۔ بالخصوص بے تحاشا پھیلی ہوئی انگور کی بیل میں اس کو دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس نے اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا تھا کہ انگور کی بیل کیسے ایک مکان کی دیوار کو مکمل طور پر اوجھل کر سکتی ہے۔ یہاں تک کہ آدمی مکان کے اس مقام پر دیوار کا رنگ نہیں بتا سکتا۔ اس نے مکان کا جائزہ بڑے غور سے لیا۔ ہر کھڑکی، دیوار کی ہر کارنس، ٹین کی بھوری چھت کی طرز بناوٹ کا موازنہ اپنے حافظے میں محفوظ تفاصیل کے ساتھ کیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا (اس کے ہاتھ کانپنے لگے تھے) کہ یہاں پر ایک سراسر نامعلوم مکان

کھڑا تھا۔

کیا وہ راستہ بھول گیا تھا؟ وہ تھوڑا سا لوٹ کر گیا اور جانے پہچانے کو ڈھونڈنے لگا، جس پر وہ بھروسہ کر سکے۔ اس میں کامیابی ہوتی نظر آنے لگی۔ یہ بل کھاتی ہوئی خیابان، وہ سامنے دائیں ہاتھ پہ ٹرانسفارمیٹر کی کوٹھڑی، نہر کے ساتھ ساتھ وہ جھاڑیاں یہ تمام چیزیں اس کے لئے اجنبی نہ تھیں۔ مگر شاید اسے دھوکہ لگ رہا تھا، کیونکہ غور سے اور باریک بینی سے دیکھنے پر یہ چیزیں اجنبی تھیں۔ وہ بے سود سوچنے میں لگا رہا کہ کیا کبھی اس کی سیروں کے دوران اس نے ٹرانسفارمیٹر کی کوٹھڑی کو دیکھا تھا۔ اس کا جواب وہ پورے وثوق کے ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔

وہ سوچ سوچ کے ایک کے بعد دوسرا قدم دھر رہا تھا، آنکھیں رستے پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس نے سوچا کہ گھر کا رستہ نہ ملنے کا خدشہ بے بنیاد تھا۔ انسان پوچھ بھی تو سکتا تھا۔ خوش قسمتی سے پتہ میرے شناختی کارڈ پر درج ہے۔ اسے لوگوں کے بارے میں سننا یاد آیا، جو ہر وقت نام اور پتہ اپنے اوور کوٹ پہ ٹانکے رکھتے ہیں۔ میرا معاملہ ابھی اتنا بھی گیا گزرا نہیں ہے، اس نے سوچا۔

اس نے دل میں عہد کیا کہ وہ چیستانی رسالوں میں دلچسپی کو... وہ ہر چند روز کے بعد ان کا ایک بنڈل خریدتا تھا... کم کر دے گا۔ اور اس کی بجائے انسانی روابط کو بڑھائے گا۔ مگر اپنے بلاک میں سے وہ کس کے ساتھ رابطہ قائم کر سکتا تھا؟ کووالسکی، واحد انسان، جس کے ساتھ انسان کام کی بات کر سکتا تھا، چند سال ہوئے مر گیا تھا۔ ایک موٹر کار نے اسے روندھ ڈالا تھا۔ بعض اوقات یانژ سوچتا تھا کہ کیا ابھی انسانوں کے درمیان روابط پائے جاتے ہیں۔ کچھ کاریں اس طرف جا رہی ہیں، اس نے سوچا، اور دوسری دوسری طرف۔ بس یہ حال ہے۔

اس شام اسے بغیر کسی کی مدد کے گھر لوٹنے میں کامیابی ہوئی۔ انعامی معمہ سے بھی، جو اس کے لئے اس قدر دردِ سر کا باعث بنا ہوا تھا، وہ نپٹ سکا۔ بعد میں اس نے اپنے آپ کو اپنی کافی کی پیالی کو مسلسل گھورتے ہوئے پکڑا۔ اس نے اپنے آپ کو مسکرانے پر مجبور کیا اور ہاتھ کو سر کے مختصر سے بالوں پر پھیرا۔ ہاں، بلاشبہ وہ کافی کی پیالی اس کی نہیں تھی، جسے وہ بیس یا اس سے زیادہ برسوں سے استعمال کر رہا تھا۔ یہ

کوئی اجنبی چیز تھی ۔ وہ یہاں کیسے آ گئی ۔ ایک براؤن پیالی ، دھتکاری ہوئی ، تڑقا ہوا روغن ۔ اس نے پیالی کو پکڑا اور کوڑے کرکٹ کے ڈبے میں یوں دے مارا کہ وہ کرچی کرچی ہو گئی ۔ تم سٹھیا گئے ہو پیارے ، اس نے سوچا ۔ پنشن ملنے کے بعد عمر سات میلوں والے لانگ بوٹ پہن لیتی ہے ۔

وہ اپنے کمرے میں ادہر ادہر ٹہلنے لگا، یہاں تک کہ بے چینی کچھ تھم گئی ۔ ڈرتے ڈرتے اس نے روٹی کاٹنے والی چھری کا امتحان کیا ۔ میں دھوکہ نہیں کھاتا ہوں ، اس نے سوچا ، یہ چھری کی دھار ہے اور وہ دستہ ۔ یہاں پر چھری کو پکڑتے ہیں ، اس نے کہا اور اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ سے خون نکل رہا تھا ۔

کچھ دنوں کے بعد سویرے سویرے اس کو اس چیز نے آن لیا ۔ یہ بات شاید مضحکہ خیز لگے ، مگر اسے یہ یاد کرنے میں کامیابی نہ ہوئی کہ وہ کپڑوں کو پہنتے ہوئے کس کپڑے سے ابتداء کیا کرتا تھا ۔ مذبذب اس نے جرابیں ، قمیص ، جانگیا ، بنیان ، واسکٹ کو اٹھایا اور سوچتا رہا کہ اسے کس کپڑے سے ابتداء کرنی چاہیئے ۔ کن نقطہ ہائے نظر ، کن قواعد کو ملحوظ رکھنا ہو گا ۔ پہلے وقتوں میں اس نے اس بارہ میں کبھی سوچا بھی نہ تھا ۔ کپڑے پہننے کے بعد ، جس پر خاصا وقت لگ گیا، اس نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا ۔ اور اسے لگا کہ وہ سچ مچ بدل گیا تھا ۔ اب صرف اوور کوٹ اور ہیٹ ۔

لفٹ کو اس نے کبھی استعمال نہیں کیا تھا ۔ روابط ، اس نے سوچا ، انسانوں کے ساتھ روابط ۔ اور نئے ولولے کے ساتھ وہ سیڑھیوں سے نیچے اترا ۔ باہر ایک سرخی مائل دوپہر تھی ۔

تو ہم ابھی ایک تجربہ کرتے ہیں ، اس نے کہا اور ایک راہی سے گھڑی کا وقت پوچھا ۔ اس نے کندھے اچکائے ، ٹوپی کو سرکایا اور گلی کے سرے پر گھوم گیا ۔ آدمی نے تمہاری بات کو نہیں سمجھا ، یاٹز نے سوچا ، تمہیں اونچے سے بولنا چاہیئے ۔ انسانوں کے ساتھ اختلاط کی کمی کے سبب تمہیں بھول گیا ہے کہ انسان کو سمجھنے کے لئے کتنی اونچی آواز میں بولنا چاہیئے ۔ غالباً ، اس نے کہا ، میں نے اپنا سوال اس آواز میں کیا تھا ، جس میں میں اپنے دل میں باتیں کرتا ہوں ۔

اگلے راہی کو یاٹز نے تنگ کرنے کے بغیر گزرنے دیا ۔ اس کو ایکا ایکی خطرہ پیدا

ہو گیا تھا کہ وہ کہیں بہت اونچی آواز میں نہ پکار بیٹھے۔ اس کے علاوہ اسے یاد آیا کہ پہلا راہی ایک غیر ملکی ہو سکتا تھا اور اس وجہ سے اس کی بات کو نہ سمجھ پایا تھا۔ بالکل، ایک غیر ملکی۔ کیا اخبارات روزانہ بے شمار غیر ملکیوں کے ہمارے شہر میں ہونے کے بارہ میں نہیں لکھتے تھے؟ آدمی ایک غیر ملکی کو کیسے پہچان سکتا ہے؟ یاٹز نے پھر ایک بار جسارت کی۔ لگتا تھا کہ جب یاٹز نے سوال کو دہرایا، تو وہ اس کو سمجھ گیا۔ اجنبی نے بازو کو اٹھایا اور اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ یاٹز نے اوپر کی طرف دیکھا۔ گھوما اور راہی کے پیچھے خالی نظروں سے تکنے لگا۔ ایک دیو ہیکل طیارہ مکانوں کی گھاٹیوں کے اوپر سے چنگاڑتا ہوا گزر گیا۔ ساتھ ہی تیل کی ایک کالی فلم اوپر سے نیچے کی طرف پھیل گئی۔

پھر یاٹز کی طرف بالمقابل سے ایک عورت آئی اور اسے تنگ فٹ پاتھ پر اس کی خاطر رستہ بنانا پڑا۔ عورت نے بائیں طرف بچنا چاہا اور یاٹز جیسے جادو کے اثر کے تحت بائیں طرف کو جھکا۔ اب دونوں گھبرا گئے۔ عورت دائیں طرف کو جھکی۔ یاٹز نے اسی رنگ میں رد عمل دکھایا اور بھاری بھر کم عورت کے ساتھ ٹکرا گیا۔ "یہ کچھ میرے ساتھ کبھی پیش نہیں آیا" عورت پکاری۔ یاٹز دیر تک اس کے پیچھے تکتا رہا۔ سڑکوں کی لائیٹیں جلنے لگیں۔ کیا دیر ہو چکی تھی؟ یاٹز ان سارے خیالات سے بچنا چاہتا تھا، جو اس کی کھوپڑی میں گھات لگائے ہوئے بیٹھے تھے، تا کہ اس پر حملہ کریں۔ وہ مسلسل گنگناتا رہتا تھا۔

ایکا ایکی وہ ڈر گیا۔ ایک آدمی اس کے سامنے رک گیا تھا اور اس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ یاٹز اب جان گیا۔ آدمی اس سے اپنے سگریٹ کے لئے آگ چاہتا تھا۔ ایک جھرجھری اس کے بدن میں سے گزر گئی۔ ایک آدمی نے اس سے بات کی تھی۔ ایک انسان۔ اس کا انسانوں کے ساتھ رابطہ تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ کس طرح اس کا سر قابو سے باہر ہو کر ہلنے لگا تھا۔ اس نے معذرت کے ساتھ کندھوں کو اچکا دیا، نہ جانتے ہوئے کہ وہ آدمی کو کیسے سمجھائے کہ اس کے پاس لائٹر نہیں تھا۔ اور وہ شکر گزار تھا کہ آدمی نے اس کی طرف رجوع کیا تھا۔ یاٹز اس کے ساتھ مصافحہ کرنا چاہتا تھا، نہ جانتے ہوئے کہ اس کو کونسا بازو آگے بڑھانا چاہیئے۔ مگر اجنبی نے صرف سر کو ہلایا اور آگے نکل گیا۔

راحل ہوٹ ماخر

Rahel Hutmacher

فرار

تم میرے پاس کیوں آئے ہو۔ کس لئے مجھ سے مدد کی درخواست کرتے ہو، میں تمہیں یہاں پر نہیں رکھ سکتی۔ چلے جاؤ۔ میں تمہاری مدد نہیں کر سکتی۔ میری بھی تو کوئی مدد نہیں کرتا۔

کم از کم دروازہ تو بند کر دو۔

کیا کسی نے دیکھا ہے کہ تم یہاں پر داخل ہوئے ہو۔ واضح ہے کہ تم کہو گے نہیں۔ مگر تم کیا جانو کہ انسان کو کس بات کا خیال رکھنا چاہیئے، اگر اسے فرار ہونا پڑے۔ تمہیں کبھی احتیاط کرنے کی، اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ تمہاری ہمیشہ سے حفاظت کی جاتی رہی ہے۔ تمہارے نوکر اپنے قابل اعتماد ہونے کے لئے مشہور ہیں۔

میں کیوں تم سے اس طرح بولتی ہوں، تم کہتے ہو۔ مجھے ہنسی آ رہی ہے۔ تمہیں اچھا نہیں لگتا کہ کوئی تم سے اس طرح بولے۔ تمہیں اس کی عادت نہیں ہے' ٹھیک۔ تم مؤدبانہ طریق کے عادی ہو اور آہستہ آوازوں کے۔ میں مؤدب نہیں ہوں، کسی سے بھی نہیں۔ تمہارے ساتھ بھی نہیں۔ اور میں آہستہ بھی نہیں بولتی ہوں۔ اگر میری تربیت اچھی ہوئی ہوتی اور میں آہستہ بولنے کی عادی ہوتی، تو کبھی کی بقید حیات نہ ہوتی۔

میں کس وجہ سے اتنے غصے میں ہوں۔ تم پہ مجھے سچ مچ ہنسی آ رہی ہے۔ تم میرے گھر میں آتے ہو۔ تمہاری تلاش ہو رہی ہے۔ ساری دنیا کو اس بات کا علم ہے' تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں چھپاؤں۔ اگر کسی نے دیکھا ہے کہ تم اندر آئے ہو، کیا خیال ہے تمہارا کہ پھر کیا ہو گا۔ تمہیں وہ واپس لے جائیں گے۔ تمہارے ساتھ وہ

اچھے رنگ میں پیش آئیں گے۔ مگر میرے ساتھ کیا ہو گا۔ اس بارے میں تم نے نہیں سوچا۔

نہیں، نہیں یہ ٹھہرو۔ اس وقت بہت روشنی ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ سارا گاؤں دیکھے کہ میرے دروازے سے ایک شخص نکلتا ہے، جس کو ہر جگہ پر ڈھونڈا جا رہا ہے۔

تمہیں کیوں کر میرا خیال آیا۔ کیا تم کسی اور گھر کا انتخاب نہیں کر سکتے تھے میرے گھر کے سوا۔ تم بے وقوف کہیں کے۔ مجھے تمہارے بغیر بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ تم کیوں سیدھے میرے پاس آئے ہو۔

کون سی مشکلات، پوچھتے ہو تم۔ لوگ مجھ پر جادوگر ہونے کا الزام لگاتے ہیں، اگر تمہیں یہ جاننے کی خواہش ہے۔ میں ناپسندیدہ عاشقوں کو لمبی نیند سلا دیتی ہوں۔ اور ایسے محبت کرنے والوں کو، جنہیں پسند کیا جاتا ہے، طاقت سے نوازتی ہوں۔ راتوں میں غیر مرئی صورت میں گھومتی ہوں۔ میں پرواز کرتی ہوں۔ لوگ مجھے دیکھ نہیں سکتے۔ مگر مجھے اندھیرے میں نظر آتا ہے، لوگ کہتے ہیں۔

تم ڈر گئے ہو۔ مجھے نظر آ رہا ہے، اگرچہ تمہاری تربیت اچھی کی گئی ہے۔ تم کوشش کر رہے ہو کہ مجھ پر تمہاری گھبراہٹ نہ کھلے۔ میرے سامنے تمہیں تکلف کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنی گھبراہٹ کو ظاہر ہونے دو۔ میں اس بات کی عادی ہوں۔ تو اب ہم کیا کریں۔

جب تک روشنی ہے، تم میرے گھر سے نہیں جا سکتے۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ تمہارا حلیہ کیا ہے۔ میں اپنے سر کو ابھی کچھ عرصے تک سلامت رکھنا چاہتی ہوں۔

تم نے آخری بار کب کھانا کھایا تھا۔

میرے سامنے تمہیں تکلف برتنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکی ہوں۔ مجھے بتاؤ کہ کیا تمہیں بھوک لگ رہی ہے۔ یقیناً تم بھوکے ہو گے۔ تم جیسے لوگوں کو بہت سا کھانا کھانے کی عادت ہوتی ہے۔

مہربانی۔ میں مہربان نہیں ہوں۔ میں ایک دکھی اور بدصورت عورت ہوں، جس پر جادوگرنی ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اور جو برے الفاظ سے پکاری

جاتی ہے۔ اب تم کھانا کھاؤ۔

کیا تم یہاں پر اکیلی رہتی ہو، تم پوچھتے ہو۔ فریب نہ کھاؤ، ہر شخص اکیلا ہے بعض اوقات یوں لگتا ہے، جیسے انسان پائے جاتے ہیں، جو اکیلے نہیں ہوتے۔ وہ مل کر بیٹھتے ہیں اور آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ مگر جب وہ بولتے ہیں، تو کوئی کسی کی بات دراصل نہیں سنتا۔

محبت کرنے والوں کی جوڑیاں، تم کہتے ہو۔ تم کیا جانتے ہو۔ انہیں یہ بات سب سے زیادہ واضح طور پر نظر آتی ہے۔ کبھی انہیں سن کر تو دیکھو کہ وہ ایک دوسرے کو کیا کہتے ہیں۔ میرے پاس رہو، وہ کہتے ہیں اور مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ مگر اس وجہ سے مشترکہ جلد ان کے جسموں پر نہیں اگتی۔

تم مجھ سے ایسا سوال کیوں کرتے ہو۔ نہیں، محبت نہیں پائی جاتی، تم بے وقوف کہیں کے۔ وقتی طور پر اندھا پن پایا جاتا ہے اور ایک خاموش مروت۔ مگر محبت نہیں پائی جاتی۔

کیا تم نے کافی کھا لیا ہے۔ خوب، آؤ اب ہم سوچتے ہیں۔ اگر وہ آئیں اور یقیناً میرے گھر وہ سب سے پہلے آئیں گے، تو ہمیں کیا کرنا ہو گا۔ کیا میں تمہیں ایک درخت کا روپ دے دوں یا اپنی انگلی پہ ایک انگوٹھی کا یا ایک پرندے کا۔ وہ دروازہ کھولتے ہیں اور ایک پرندہ ان کے سروں کے اوپر سے باہر اڑ جاتا ہے۔ ہاں یہ بات ممکن ہے۔

تمہیں پرندے کے طور پر کیا کرنا ہو گا۔ میرے خدا۔ تم ان کے سروں کے اوپر سے باہر اڑ جاتے ہو، میں نے تمہیں کہا جو ہے۔

تمہاری زندگی پرندے کے طور پر، تم پوچھتے ہو۔ تم مجھے یوں گھبراہٹ سے نہ دیکھو۔ پرندے کے طور پر تمہاری زندگی اس زندگی سے بہتر ہو گی۔ کیا تمہارا یہ خیال نہیں ہے۔

تمہیں اپنی جماہی کو روکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر تم تھکے ہوئے ہو، تو تمہیں جماہی لینے کا حق پہنچتا ہے۔ تم لیٹ جاؤ اور سو جاؤ۔ جب میں انہیں آتے ہوئے دیکھوں گی، تو تمہیں جگا دوں گی۔

ا۔ی۔مائیر
E.Y. Meyer

سائبیریا کا سفر

جب وہ دوپہر کے وقت گھر سے نکلا، تو اس کا ارادہ شہر جانے کا تھا، بیئر پینے کے لئے یا جس چیز کو خواہش اسے تب ہو گی، اور یہ دیکھنے کے لئے کہ شاید کوئی واقف کار مل جائے، جس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کر سکے، سہ پہر کے ڈھلنے تک، چھ بجے کے لگ بھگ وہ گھر واپس آنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ رات کے ساڑھے گیارہ بجے پب کے بند ہونے تک ۔ یہی اس نے اپنے والدین سے کہا، جن سے اس نے سرسری طور پر رخصت لی تھی۔

پہلے ریستوران میں، جس میں وہ داخل ہوا، اسے کوئی واقف کار دکھائی نہ دیا اور چونکہ ہال بے حد بھرا ہوا تھا اور صرف ایک میز پر ایک بوڑھے کے سوا کوئی نہ بیٹھا ہوا تھا، وہ بلا تردد اس کے پاس بیٹھ گیا۔

بوڑھے کے بال، جس کے سامنے وہ بیٹھا ہوا تھا، بالکل سفید تھے اور وہ بیئر پی رہا تھا۔ اس نے بھی اپنے لئے بیئر کا آرڈر دیا۔ اور جب وہ پی رہا تھا، تو ایکا ایکی اسے بوڑھا جانا پہچانا لگنے لگا۔ اسے یوں لگا، جیسے بوڑھا کسی ایسی ہستی کے ساتھ مشابہت رکھتا تھا، جسے وہ بے حد پسند کرتا تھا۔ مگر وہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کس کے ساتھ۔ ضروری نہیں تھا کو وہ ہستی بڑی عمر کی ہوتی یا مرد ہوتی۔ مگر بوڑھے کو متواتر تکنے کے باوجود وہ یہ فیصلہ نہ کر پایا کہ وہ کس سے مشابہت رکھتا تھا۔

اس سے قطع نظر وہ اپنے دل میں بوڑھے کے لئے اچھے جذبات پیدا ہوتے ہوئے محسوس کر رہا تھا، جسے وہ بالآخر اس ہستی سے جدا نہ کر پاتا تھا، جس کے لئے وہ ان جذبات کا پیدا ہونا جان رہا تھا۔ جس کی شناخت اس کو یاد نہیں آ رہی تھی۔

جب بوڑھے نے، جسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ایک عرصے سے اس کی طرف تکا جا

رہا تھا، اچانک مسکرانا شروع کر دیا۔ اور وہ اس ہستی کے ساتھ گڈ مڈ ہونے لگا، جس کی شناخت اسے یاد نہیں آ رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ ان دونوں میں امتیاز نہ کر سکتا تھا۔ اور اسے خیال پیدا ہونے لگا ایک ایسے آدمی کے سامنے بیٹھے ہونے کا، جسے وہ پسند کرتا تھا، مگر جس کو وہ اس کے باوجود نہیں جانتا تھا۔

اس عرصے میں اس نے بیئر کا دوسرا پیگ خالی کر دیا تھا۔ جب کہ بوڑھا اپنے خالی پیگ کو سامنے رکھے ہوئے بیٹھا تھا۔ مگر دوسرے اور تیسرے پیگ کے بعد بھی اسے یہ احساس نہ تھا کہ شخصیتوں کو آپس میں گڈ مڈ کرنے کا سبب شراب بنی تھی۔ اگرچہ انسان تصور کر سکتا ہے کہ وہ اب کسی قدر نشے میں آ چکا تھا۔

بوڑھا خاموشی سادھے ہوئے اسے پیتے ہوئے تکتا رہا تھا اور اس نے اپنا منہ اس وقت کھولا تھا، جب وہ ساتویں یا آٹھویں پیگ کا آرڈر دے چکا تھا، سرسری طور پر یہ کہنے کے لئے کہ وہ دونوں اس سہ پہر کو سائبیریا کا سفر کریں گے اور شام تک واپس گھر لوٹ آئیں گے۔

یہ بات کہ اس معاملے میں کچھ گڑبڑ تھی، اسے اس وقت سوجھی تھی، جب بوڑھا اور وہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچ چکے تھے... مگر اس کا اعتماد اس شخص پر اتنا گہرا تھا کہ ایسا خیال اسے پریشان نہ کر سکتا تھا۔ اس شخص کو، جو اس کے ہمراہ سائبیریا جا رہا تھا، وہ لمبے عرصے سے جانتا تھا اور باوجود اس امر کے کہ وہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کون شخص تھا، وہ اسے پسند کرتا تھا۔ اور باوجود اس کے کہ جیسا کہ اسے اب آن کر احساس پیدا ہوا تھا، اس کا چہرہ اس کی یادداشت کی آنکھ کے سامنے کم کم آتا تھا۔

شاید اس وجہ سے کہ اس نے کچھ زیادہ ہی بیئر پی لی تھی، گاڑی میں جلد اس پر تھکاوٹ کا حملہ ہونے لگا۔ اور اگرچہ وہ اپنے آپ کو یاد دلانے کی کوشش میں لگا رہا تھا کہ اسے جاگتے رہنا چاہیئے، وہ بالآخر سو گیا۔ دیر تک بوڑھے کو اور اسے اس گاڑی میں بیٹھنا ہوگا اور انہیں بعد میں کئی بار گاڑیاں بدلنی ہوں گی۔ اور پھر سائبیریا پہنچنے اور شام پڑنے تک واپس آنے کے لئے وقت بھی ناکافی ہوگا۔

جب اس کی آنکھ کھلی، تو اگرچہ اس کی گھڑی پر ابھی پانچ بج رہے تھے، بوڑھا اور وہ ٹرانس سائبیریا میل کے لکڑی اور پیتل سے بنے ہوئے نہایت شاندار اور

کشادہ ڈبے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اور کھڑکیوں کے سامنے سے یخ بستہ اور برفانی ہواؤں سے آلودہ آسمان سے عاری سفید لینڈ اسکیپ دوڑتا جارہا تھا، جس میں درخت بہت کم تھے اور گھران سے بھی تھوڑے۔

اس کے ہمراہی کے اشاروں کنایوں سے پتہ چلتا تھا کہ وہ جلد اپنی منزل پر پہنچنے والے تھے۔ اور جب چند منٹوں کے بعد گاڑی ایک تن تنہا ایستادہ چوبی اسٹیشن کے سامنے رکی، تو وہ نیم بیداری کے عالم میں اپنے ہمراہی کے پیچھے گاڑی سے اترا۔ اور اس کو اس بات پر کہ وہ واقعہ میں سائبیریا میں تھے، تب اعتبار آیا، جب اس کو باہر سردی نے آن جکڑا۔

اس کو جلدی سے اسٹیشن کے انتظار گاہ میں داخل کرنے کے بعد بوڑھا آگے عمارت کے اندر چلا گیا، جب کہ وہ خود انتظار گاہ کی ایک نکڑ میں لگے اور غراتے ہوئے ہیٹنگ اوون کے پاس اپنے آپ کو گرم کرنے لگا۔ اور اس نے کھڑکی کے شیشوں میں سے ٹیڑھی میڑھی گاڑی کو روانہ ہوتے ہوئے دیکھا۔ جب گاڑی کا شور شرابہ کہیں دور ڈوب گیا، تو اس نے جھکڑ کی آواز سنی، جسے سامنے رکنے والی گاڑی نے کسی قدر روک رکھا تھا، اور محسوس کیا کہ وہ کس طرح پوری طاقت کے ساتھ اسٹیشن کی عمارت پر حملہ آور ہو رہا تھا۔

پوستین کے اوور کوٹ میں ملبوس اور پوستین کے لانگ بوٹ پہنے اور سر پر پوستین کی ایک بڑی ٹوپی رکھے ہوئے اس کا ہمراہی اس کے لئے بھی ویسے ہی کپڑے تھامے ہوئے انتظار گاہ میں واپس لوٹا۔ اور جب وہ اپنے ہمراہی جیسے کپڑے پہن چکا، تو دونوں اس جھکڑ کے تھپیڑے کھاتے ہوئے سفید لینڈ اسکیپ میں باہر نکلے۔

جھکڑ اور چہروں کو کاٹتی ہوئی ٹھنڈ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے وہ اسٹیشن کے عقب میں ایک لامتناہی دکھائی دینے والے سفید میدان میں پہنچے۔ ایک عرصے تک اس پر چلنے کے بعد اس کو احساس ہوا کہ وہ کسی بے حد بڑی جھیل کا منجمد پانی تھا۔ شاید یہ بائیکال جھیل تھی، جس کے بارہ میں اس نے سن رکھا تھا یا شاید سائبیریا میں پائی جانے والی دوسری جھیلوں میں سے کوئی جھیل تھی۔

بعض اوقات اسے لگتا تھا کہ اترائی آ گئی تھی اور وہ تیز سے تیز تر چلنے لگتا تھا،

یہاں تک کہ اسے چکر آنے لگتے اور بوڑھے کو اسے تھوڑے عرصے کے لئے بازو سے پکڑ کر تھامنا پڑتا تھا۔ پھر اس نے مکانات کو اپنے سامنے دیکھا، جو جوں جوں وہ ان کی طرف بڑھتا چلا گیا، پیچھے ہٹتے اور بالآخر پتھروں میں تبدیل ہو جاتے تھے، جو ناقابل توجیہہ وجوہات کی بنا پر جمی ہوئی جھیل کی اوپری سطح پر پڑے تھے.... بشرطیکہ بوڑھا اور وہ سچ مچ کسی جھیل پر چل رہے تھے یا کسی جھیل پر انہوں نے قدم بھی رکھا تھا۔

دھند جیسی سفیدی، جو اس کے گرداگرد چھائی ہوئی تھی، اس کے اندر زمان و مکان کا احساس مٹائے دیتی تھی۔ اور جب سفیدی کے اندر سائے ابھرتے اور غائب ہوتے دکھائی دینے لگے، تو اس کے تخیئل میں بھیڑیوں اور برفانی ریچھوں کی تصویریں پیدا ہونے لگیں۔ مگر جب اس نے بوڑھے سے اس بارے میں استفسار کیا' تو اس نے صرف اس قدر کہا کہ وہ اپنے پوستین میں دھنسے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ اس رسی کو مضبوطی سے پکڑلے، جو اس نے اپنے گرد کئی بار لپیٹ رکھی تھی۔

اس نے ایسا ہی کیا۔ اگرچہ اس کے نتیجے میں وہ بوڑھے کے بہت قریب ہو گیا، اس کے اندر کھچاؤ بڑھتا چلا گیا۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ رات کی آمد، جس سے اسے ڈر لگتا تھا اور جس کی وہ راہ تکتا رہا تھا، مسلسل غائب رہی۔ اور دودی روشنی متواتر اور برابر قائم رہی۔

چہرے کو کاٹنے والی سردی کا احساس، جو جلد ہی ہاتھوں اور پاؤں میں بھی محسوس ہونے لگا تھا، تھوڑے عرصے کے بعد جاتا رہا تھا۔ مگر جب ایک بار اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا، تو گالوں، ماتھے اور ناک پر سے کھال ٹکڑوں کی صورت میں اترنے لگی۔

ستانے کے واحد وقفے کے دوران، جو انہوں نے کیا، بوڑھے نے ایک تھیلے میں سے، جسے وہ لٹکائے ہوئے تھا، ایک تھرموس بوتل، جما ہوا گوشت اور مچھلی نکالی۔ پھر انہوں نے چائے پی، جس میں بے تحاشا کھانڈ ڈالی گئی تھی۔ اور بوڑھے کے کاٹے ہوئے گوشت اور مچھلی کے ٹکڑوں کو چوستے رہے۔

پھر بوڑھے نے اس رسی کو کھولا، جسے اس نے اپنے گرد باندھ رکھا تھا اور اسے پہلے اس کے گرد، پھر تھوڑا سا ٹکڑا چھوڑتے ہوئے اپنے گرد باندھ لیا۔

اس طرح وہ ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے پہلو بہ پہلو اور آگے پیچھے چلتے گئے ۔ بعض اوقات جب وہ تھکاوٹ کے سبب لمحہ بھر کے لئے یا زیادہ وقت کے لئے ہوش و حواس کو کھو دینے کے قریب ہوتا تھا، تو بوڑھا اسے بس اپنے پیچھے گھسیٹتا ہوا چلا جاتا تھا۔یہاں تک کہ اسے دنوں تک چلتے رہنے کا احساس ہونے لگا۔ اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے فریب نظر چھانے لگا۔ اس نے اپنے سامنے جھیل کا دوسرا کنارہ ابھرتے ہوئے دیکھا۔ جہاں پر اونچے تختوں کا جنگلہ اور اڑتی ہوئے برف کے جھکڑ تلے ڈھکے ہوئے چوبی مکانات دبکے بیٹھے تھے ۔ اور وہیں پر رہے ، جب وہ ان کے قریب آن پہنچے ۔

کوئی مکان بھی کچھ ایسا بڑا نہ تھا۔ سب ایک منزلہ تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ ان میں ایک سے زیادہ کمرے نہ پائے جاتے تھے ۔ سبھی مکانوں کی کھڑکیوں کے پٹ بھڑے ہوئے تھے اور صرف پہلے مکان کی چھت پر سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

جب بوڑھا اور وہ اس پہلے مکان کے پاس پہنچے ، تو فوراً دروازہ کھول دیا گیا اور وہ اندر داخل ہوئے ۔

دھویں سے بھرے ہوئے گھر کے اندر ہر طرف سے آنکھیں ان کو گھور رہی تھیں ۔ ہر طرف پوستینوں یا دبیز کپڑوں اور اون میں ملبوس مرد ، عورتیں اور بچے کھڑے یا بیٹھے ہوئے تھے ۔ اور فرش پر مختلف قد و قامت اور نسلوں کے کتے لوٹ پوٹ رہے تھے ۔ کمرہ تاریک اور گرم تھا۔ کھڑکیوں کے سامنے اونی کمبل لٹک رہے تھے ۔ اور چھت سے کئی ایک کالک پھیلانے والے مگر کم روشنی دینے والے پٹرولیم کے لیمپ لٹک رہے تھے ۔ ایک کونے میں چولہے پر بڑی بڑی دیگچیاں چڑھی ہوئی تھیں جن میں سے بھاپ نکل رہی تھی ۔ اور ایک دوسرے کونے میں ایک بڑا ٹائیلوں والا آتش دان بنا ہوا تھا، جس کی سیڑھیوں پر چھت تک پہلو بہ پہلو چرٹ پیتے ہوئے بڈھے مرد اپنی جھریوں دار چہروں اور کئی ایک اپنی لمبی لمبی داڑھیوں سمیت بیٹھے ہوئے تھے ۔ ان کی آنکھیں دوسرے لوگوں کی طرح ، جو اس کمرے میں جمع تھے ، محزوطی تھیں ۔

ایک تین منزلہ پلنگ پر ، جو کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا ،

جھریوں بھرے چہرے اور چمڑے کے ٹکڑوں میں ملبوس بوڑھیوں کے پہلو میں نوجوان عورتیں بیٹھی تھیں، جنہوں نے اپنے بھاری بھرکم بھورے پستان کھول رکھے تھے اور بچوں کو دودھ پلا رہی تھیں۔ اور جہاں پر دیوار کے ساتھ خالی جگہ ہو سکتی تھی، وہاں پر کھالیں اور ہرنوں کے سینگ چھت تک ڈھیر لگے ہوئے تھے، جن کے گردا گرد نوکیلے کانوں اور مخروطی آنکھوں والے کتے ڈیرہ جمائے بیٹھے تھے۔

جب بوڑھا اور وہ کمرے میں داخل ہوئے، تو میز کے گرد بیٹھے ہوئے مرد اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے بوڑھے کو گھیرے میں لے کر اس کی پوستین کی چیزیں اتارنی شروع کر دیں، جن کے نیچے بوڑھا متعجبانہ طور پر اس کمرے والے لوگوں جیسے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ مرد بوڑھے کے ساتھ ایک بالکل اجنبی زبان میں باتیں کرنے لگے، جسے وہ بخوبی سمجھتا ہوا لگتا تھا۔ کیونکہ بہت جلد ان کے درمیان ایک مکالمہ شروع ہو گیا، جو اس وقت بھی جاری رہا، جب مرد بوڑھے کو میز کی طرف لے کر گئے اور اسے چائے پینے کو دی۔

وہ خود ابھی تک پوستین کی پوشاک پہنے، جس سے برف کی ڈلیاں لٹک رہی تھیں، دروازے کے پاس کھڑا تھا، جسے اس کے پیچھے بند کیا جا چکا تھا۔ اور اب اسے یکدم احساس ہو رہا تھا کہ وہ بوڑھے کو اتنی اچھی طرح نہیں جانتا تھا، جس کا اس نے ابتدا میں تصور کیا تھا۔

کلائی کی گھڑی، جسے اس نے پوستین کو ہٹاتے ہوئے باہر نکالا تھا، ابھی ساڑھے سات بجا رہی تھی.... مگر وہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آیا اس کا مطلب یہ تھا کہ بوڑھا اور وہ ڈیڑھ گھنٹے تک برف کے دشت میں سے گزرے تھے یا یہ کہ انہوں نے روشن قطب رات اور ایک پورا دن گزار دیا تھا اور اب اگلی صبح یا اگلی شام ہو چکی تھی

بوڑھے نے، جو اسے یہاں پر لایا تھا، کہا تو تھا کہ وہ اسی شام تک واپس گھر پہنچ جائیں گے۔ مگر یہاں پر کمرے کے دھندلکے میں، جو قطب دنوں اور راتوں کی روشنی کو کاٹ رہا تھا، اسے اس بات میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

جب کہ وہ بوڑھے کو اور مردوں کو میز پر بیٹھے ہوئے چائے پیتے ہوئے اور

باتیں کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا، اسے اپنے پوستین کے کوٹ کے نچلے حصے میں کئی بار ہلکا سا کچھاؤ محسوس ہوا۔ اور جب اس نے نیچے کی طرف نظر کی، تو اس نے دیکھا کہ برن (سوئیٹزرلینڈ) کے چرواہوں کے دو کتے، جن کا اس نے اب تک کوئی نوٹس نہ لیا تھا، اس کو سونگھ اور چاٹ رہے تھے۔ اور جب اس نے لوٹ کر بوڑھے کی طرف دیکھا، تو اگرچہ بوڑھے نے مسکراہٹ سے جواب دیا، وہ اسے کمرے میں موجود دوسرے تمام لوگوں کی طرح بالکل اجنبی لگا۔

گیرڈ ہولٹز ہائیمر
Gerd Holzheimer

جس سال کارل نے ریچھ کو گولی ماری

کارل ستر سے اوپر ہے۔ ستر برس سے زیادہ عرصے سے کارل مین میں رہتا ہے اور دھواں اس کی جھونپڑی سے اٹھتا ہے۔ اس نے اس گوشے کو کبھی نہیں چھوڑا۔ اوپر شمال کی جانب کالی چوٹیوں اور پہاڑوں کے پیچھے کینیڈا شروع ہوتا ہے۔

گزشتہ سردیوں میں ایک ایسا طوفان آیا کہ کارل اپنے ہی فارم میں رستہ بھول گیا۔ اسے پتہ نہ چلتا تھا کہ وہ اوپر کو جا رہا ہے یا نیچے کو، اس قدر برف باری ہوئی۔ دو بارہ وہ گول دائرے کی صورت میں گھوم گیا۔ دو بار اپنے پڑوسی کے پاس سے گزرا۔ اور پڑوسی دور رہتا ہے۔ مین بہت وسیع ہے۔ وہ پتھروں اور سلوں کی بنی ہوئی دیوار کے ساتھ ساتھ ٹٹولتا ہوا چلتا رہا۔ مگر دیوار نے اسے اس کے گھر تک نہ پہنچایا۔ اس نے سمجھا کہ وہ کسی دوسرے جگہ پر تھا، جب کہ کارل کبھی کسی دوسری جگہ پر نہیں گیا۔ برفانی طوفان میں وہ اپنا چشمہ کھو بیٹھا۔ اسے وہ عینک پھر نہیں ملی۔ وہ کہیں اس کی زینوں میں پڑی ہو گی۔

کارل ہمیشہ سے یہیں پر رہتا ہے۔ وہ کبھی برف سے ڈھکے ہوئے شوگر لوف موٹین پر نہیں چڑھا۔ بس کبھی کبھی اپنے ہاتھ سے آنکھوں پر سایہ کرتے ہوئے کہا کرتا ہے: اوہ، شوگر لوف موٹین، سخت ٹھنڈ ہے وہاں پر۔ اس نے کبھی سرد پورٹر جھیل میں پیراکی نہیں کی۔ پتہ نہیں کیوں، کارل کہتا ہے اور ہنستا ہے۔ مگر وہ وہاں جانے والے سارے رستوں کو جانتا ہے۔ پہلے وقتوں میں وہ کبھی کبھی مچھلی کا شکار کرنے ندی پر جایا کرتا تھا۔ مگر اس نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ کارل کہتا ہے: پتہ نہیں کیوں اور ہنستا ہے۔ مچھلیاں ہی نہیں رہیں۔

رستوں کے کیچڑ میں ریچھ کے پنجے اپنا نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ ہتھیلی کی جگہ پر

گھیرے اور سامنے کی طرف پھیلتی ہوئی انگلیوں کے نوکیلے نشان ۔ ریچھ اکیلا رہتا ہے، مگر تجسس کا مادہ رکھتا ہے ۔ خود اپنی ذات کی تفتیش اور سوچ بچار کا ماہر ہے ۔

کارل کے پاس گائیں تھیں ۔ کارل کے پاس بھیڑیں تھیں ۔ کارل نے ریچھ کو درخت پر سے شکار کیا ۔ اب کارل کے پاس شہد کی مکھیاں ہیں، بلیاں ہیں اور ایک کتا ہے ۔ کتے کا نام ہرسوگ ہے ۔

کم از کم دو بھیڑیں کارل کی ہر ماہ شکار ہو جاتی تھیں ۔ ریچھ ہر ماہ دو بھیڑیں لے جاتا تھا ۔ اس کی روک تھام کے لئے کچھ کرنا چاہیئے، کارل نے اپنے ہمسائے سے کہا ۔ پھر انہوں نے سب سے پہلے دو درختوں کے درمیان گوشت لٹکایا ۔ اس کے نیچے ایک گڑھا کھودا اور اسے شاخوں سے ڈھانپ دیا اور انتظار کرتے رہے ۔ لمبی راتوں کے پہرے ۔ مین میں مردوں کو ایسی چیزیں بھاتی ہیں ۔ مگر ریچھ کا کوئی نام و نشان نہیں، یا تو تم ریچھ کو پالیتے ہو یا ریچھ تم کو پالیتا ہے ۔ پھر انہوں نے ماہرین کو بلوایا، ان کے کتوں سمیت ٹرکوں پر ۔ چالیس کتے دو راہبروں کے ساتھ ۔ مگر کیا ہوا ۔ یہ لوگ راتوں کو کتوں کو بھونکتے ہوئے سنتے رہے ۔ مین بہت وسیع ہے ۔ ایک رات ہرسوگ کی باری آجاتی ہے ۔ کارل کا کتا، جو اتنا بوڑھا ہے، جتنا خود اس کا مالک ۔ اگر اس کا حساب کتوں کی عمر کے حساب سے لگایا جائے ۔ ہرسوگ سخت بے چین ہے، باہر جانا چاہتا ہے ۔ کارل اپنی بیٹری اٹھالیتا ہے، جسکو ٹھونکا دینا پڑتا ہے، تا کہ وہ روشنی دے ۔ بس ہلکا سا ٹھونکا ۔ اور وہ اپنی بندوق اٹھالیتا ہے، جب اس نے کبھی نہیں چلایا ۔ ہرسوگ درخت کے گرداگرد بھاگتا ہے، جو جھونپڑی کے سامنے کھڑا ہے، اور درخت پر ریچھ بیٹھا ہے ۔

کارل نے اپنی زندگی میں بندوق نہیں چلائی، مگر اب وہ گولی چلاتا ہے اور ریچھ درخت پر سے گرتا ہے ۔ کارل بہت پر امن انسان ہے، مگر یہ ریچھ اس کے گلہ کو کھا رہا تھا ۔ وہ ریچھ کی طرف جاتا ہے اور اس کو مار دیتا ہے ۔ مگر اس سے زیادہ وہ ریچھ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا ۔ اس کی کھال نہیں چاہتا ۔ اس کا گوشت نہیں چاہتا ۔ اس کے پنجے نہیں چاہتا ۔ دوسرے روز ڈیلی آتا ہے، کارل کا دوست اور ریچھ کو گاڑ دیتا ہے ۔ بل ڈوزر والا ڈیلی ۔

اس وقت سے مین میں لوگ ایک اور کیلنڈر استعمال کرتے ہیں۔ تین برس اس برس سے جب کارل نے ریچھ کو گولی ماری تھی، بجائے ایک ہزار نو سو اسی برس حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے وقت سے لے کر۔

کارل کے ہاں پانی کا نل نہیں ہے۔ عمر بھر بجلی کے بغیر رہا... آئے ہوئے دو برس ہوئے ہیں۔ کارل نے اپنی زندگی گیس کے شعلے کے نیچے گزار دی ہے۔ اور ایک قابل مرمت بیٹری کے ساتھ۔ کارل کی کوئی بیوی نہیں ہے۔ پتہ نہیں کیوں، وہ کہتا ہے اور ہنستا ہے۔ اس کی قمیصیں صاف ستھری ہیں، اس کی پتلون، اس کی جیکٹ۔ پھٹی ہوئی جگہیں سلی ہوئی ہیں۔ پتہ نہیں کیوں، کارل کہتا ہے۔ بہت پرانے چیتھڑے۔ کارل کے پاس کئی کھیت ہیں۔ مزید دو جھونپڑیاں جانوروں کے لئے چھپروں سمیت.... ہوا کی تندی سے اکھڑ گئی ہیں۔ ٹوٹے ہوئے پیانو کی طرح مکانوں کے تختے اور لٹھے گرے ہوئے ہیں ہوا میں، جو اس ملک کا واحد نغمہ اکثر گاتی ہے۔ پچھلے برس تک اس نے ٹماٹر لگائے۔ آلو اور قسم قسم کی سبزیاں۔ بالخصوص پارسنس، پارسنس دیکھنے میں مولی کی طرح ہے، مگر میٹھی ہوتی ہے۔ یخ پڑنے تک اسے زمین میں رہنا چاہیئے، اس وجہ سے اس کا میٹھا پن۔ کارل پارسنس کو ایک بڑی دیگچی میں ابالتا ہے۔ پتہ نہیں کیوں، وہ کہتا ہے۔ اس کا کوئی مزہ نہیں ہے۔ مگر وہ نرم ہوتی ہے اور کارل کے دانت نہیں ہیں۔

امسال وہ پارسنس نہیں اگائے گا۔ ٹماٹر بھی نہیں۔ وہ کوئی چیز نہیں اگانی چاہتا۔ اب وہ بوڑھا ہو چکا ہے۔ کارل کہتا ہے۔ مچھلیاں باقی نہیں رہیں۔ سردیوں میں لوگ کاروں سمیت یخ بستہ جھیل پر جاتے ہیں۔ یخ میں سوراخ کرتے ہیں۔ ان پر جھونپڑیاں بناتے ہیں اور مچھلی کا شکار کرتے ہیں۔ جھونپڑیوں میں آگ جلاتے ہیں۔ شراب پیتے ہیں اور مچھلیاں بھونتے ہیں۔ سردیوں میں مچھلیاں! اس وجہ سے مچھلیاں ختم ہو چلی ہیں۔ پچھلی سردیوں میں ایک شکاری اپنی کار سمیت یخ کو توڑ کر دھنس گیا تھا، جھیل میں ڈوب گیا۔

اور پرندے۔ کارل کہتا ہے۔ پتہ نہیں کیوں۔ ہر سال ان کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ کارل بھی ڈی ڈی ٹی ڈالتا ہے۔

سٹرونگ والی سڑک پر ایک ریڈ انڈین کی جھونپڑی تھی ۔ نوک ووڈ جو ۔ سردیوں میں ٹوکریاں بناتا تھا اور گرمیوں میں ٹورسٹوں کے پاس بیچتا تھا۔ لوگ اس سے بہت تنگ تھے ، کیونکہ وہ اپنی ٹوکریوں کے لئے شاخیں جہاں کہیں ملتی تھیں کاٹ لیا کرتا تھا۔ موسم بہار میں وہ کچھ نہیں کرتا تھا۔ مگر دس ڈالر اپنی جھونپڑی کے وہ ہمیشہ وقت پر ادا کرتا تھا ۔ جھونپڑی کارل کے باپ کی ملکیت تھی ۔ خزاں میں نوک ووڈ جو شکاریوں کا گائیڈ ہوتا تھا ۔ پھر اس نے ڈیلی کی خالہ سے شادی کر لی ۔ ڈیلی مقامی مکینک ہے ۔ کارل کا پکا یار ۔ ڈیلی اس قدر موٹا ہے کہ برآمدے والا دروازہ اتارنا پڑتا ہے ، وگرنہ وہ اندر نہیں آسکتا۔ اس کی خالہ کی کسی کو خبر نہیں ۔ اور ایک روز نوک ووڈ جو بھی غائب ہو گیا تھا۔ آخری ریڈ انڈین ۔

دو سالوں سے کارل کے پاس ٹیلی ویژن ہے ۔ وہ اسے تین برس اس سال کے بعد ملا تھا ، جب کارل نے ریچھ کو گولی ماری تھی ۔ اس کے پسندیدہ پروگرام کھیلوں کی فلمیں ہیں اور میوزیکل ۔ پتہ نہیں کیوں ۔ وہ کہتا ہے ، کھیلیں اور میوزیکل۔

پاگل پن ۔ باولا پن ۔ میوزیکل میں بوب کو سوزن سے محبت ہے ، مگر سوزن جنیک سے پیار کرتی ہے ۔ اور جنیک کو کیرول پسند ہے اور کیرول بوب کو چاہتی ہے اور ان کے بیچوں بیچ ایک باولا ، ایک بھٹکا ہوا ، جو بوب سے محبت کرتا ہے اور سوزن سے اور جنیک سے اور کیرول سے ۔ باولا پن ۔ پاگل پن ۔ کچھ نہیں کر سکتے. میوزیکل میں نہیں اور نہ ہی زندگی میں ۔ ہر جگہ آدمی کو سخت سرما درپیش ہے ۔

باہر کھڑکیوں کے سامنے کوئی پرندہ نہیں ، جو اڑتا ہو ۔ ہوا معطل ہے ۔ کوئی جھکڑ نہیں. کچھ نہیں ۔ جھونکا تک نہیں ، جو ایک پتے کو کھڑکنے دے ، ایک ٹہنی کو چٹخنے دے ۔ پانی نے بھی چپ سادھ رکھی ہے ۔ کائی اور فرن کے پودوں کو ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہنا ہے ۔ یوں لگتا ہے ، جیسے ہر زمینی چیز نے منہ موڑ لیا ہے ۔ خدا تک خبر نہیں لیتا ۔ تین برس اس سال کے بعد ، جب کارل نے ریچھ کو گولی ماری تھی ۔

لٹز راتھے نو

Lutz Rathenow

ایک قتل اور سات اقراری مجرم

ایسا واقعہ کبھی پیش نہ آیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ عقل جواب دے رہی تھی۔ آخر کیوں یکبارگی سات۔ بری فال کا ہندسہ۔ سرکاری وکیل نے کیوں سب کو مقدمے میں ملوث ہونے کی اجازت دے دی تھی۔ جج نے دل میں سوچا۔

ملزمان نے اس تیسویں پیشی میں بھی اپنے اقرار جرم کے بیانات کو یکسانی کے ساتھ دہرایا۔ پہلی پیشیوں میں کم از کم اقرار جرم کے بیانات میں کچھ فرق ہوتا تھا، پھر ہر ایک نے دوسروں کے بیانوں سے اتنا کچھ اپنا لیا تھا کہ اس کے اپنے بیان کا درجہ اعتبار بڑھ گیا تھا۔ پندرھویں پیشی میں ہر کسی کو اتنی تفصیلات یاد آگئی تھیں کہ اس دن کے بعد سے ان کے بیانات ایک جیسے ہو گئے تھے۔

رہی میڈیکل رپورٹ، تو عدالت کے طبی ماہر نے بیان دیا تھا کہ جرم بہت ہوشیاری کے ساتھ کیا گیا تھا۔ کیونکہ لاش کے معائینے سے خودکشی کا نتیجہ بھی نکالا جا سکتا تھا۔ ساتوں کے ساتوں، جنہوں نے اپنے آپ کو بطور قاتل پولیس کے حوالے کیا تھا، یہ دعویٰ کرتے تھے کہ انہوں نے جرم کا ارتکاب بلا شرکت غیرے کیا تھا۔

اس تیسویں پیشی کے روز ملزمان کے وکیلوں نے ہوشیاری کے ساتھ اپنے موکلوں کے جرم کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔

سرکاری وکیل نے ملزمان کے بیانات میں تضاد پیدا کرنے کے لئے جتن لگائے، مگر اسے بہر صورت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، کیونکہ جب بھی ملزمان سے ایسی باتوں کے کہلوانے کی کوشش کی جاتی تھی، جو ان کی بریت کے حق میں جاتی تھی، تو ہر کوئی جواب دینے سے انکاری ہو جاتا تھا۔

جج پسینہ پسینہ تھا۔ اس سارے ناٹک کا کیا مطلب تھا؟ اسے مزید کتنی بار

عدالت کی کاروائی کو ملتوی کرنا پڑے گا؟ وہ کیا چاہتے تھے؟ آخر سالوں کی قید و بند کا سؤال تھا۔ ایک امیر آدمی قتل ہوا تھا، مگر اچنبہ اس بات پر تھا کہ روپے پیسے چوری نہ ہوئے تھے۔ یہ کچھ سوچتا رہا وہ شخص، جو اس مقدمے کو جاری نہ رکھنا چاہتا تھا۔

اس نے مقدمے کو کسی دوسرے جج کے سپرد کیئے جانے کی درخواست دی۔ نامنظور۔ ہر کوئی کام کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ جج نے شواہد کی کمی کے سبب تفتیش کو نئے سرے سے کئے جانے کے لئے کہا۔ نامنظور۔ تفتیش بہت باریک بینی کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو جانبداری کے الزام کے تحت مقدمے سے ہٹائے جانے کی درخواست دی۔ نامنظور۔ اس کے ساتھی ججوں میں سے کوئی بھی ان تفصیلات کو جانتے ہوئے، جو مشہور ہو چکی تھیں، اس سے کم جانبدار نہیں ہو سکتا تھا' اس نے نالائقی کے باعث اپنے آپ کو ڈسمس کئے جانے کی درخواست دی، جو واپس کر دی گئی۔ اس کی لیاقت مسلمہ تھی۔

تیسویں پیشی میں عدالت کی کاروائی سابقہ پیشیوں کی طرح سست روی سے جاری تھی کہ جج کی طاقت برداشت جواب دے گئی۔ اس نے وکیل کی بات کو کاٹا اور کہا کہ قتل کا ارتکاب خود اس نے کیا تھا۔ شاید اس نے یہ بات محض مذاق میں کہی تھی۔ مگر ایک بار کہہ دینے کے بعد اسے یہ بات بھانے لگی اور وہ خود الزامی بیان پر اڑ گیا۔

دوسرے ملزمان ہکا بکا رہ گئے۔ خود جج کے ہم پیشہ بھی۔ واضح ہے کہ اسے اپنی بلند مسند سے اتر کر ملزموں کے بینچ پر جگہ لینی پڑی۔ اس سے پہلے نفسیاتی رپورٹ، جس میں دماغی مرض کا کوئی شائبہ تک نہ نکلا۔

مقدمہ چلتا رہا۔ جج نے ذمہ داری سے عاری ہونے کا ذائقہ چکھا، جسے وہ اس سے قبل نہ جانتا تھا۔ رہا جھوٹ بولنا، تو یہ اس کی روزمرہ کی زندگی کا حصہ تھا۔ اس نے وہی بیان دیا، جو دوسروں نے دیا تھا۔ یہ بات ساتوں کو ذرہ بھر نہ بھائی۔ جب کبھی سپاہی ادھر نہ دیکھتا تھا، وہ باری باری اور پورے زور سے اس کی ٹانگوں کو ٹھڈے مارتے تھے۔

نئے جج نے عدالتی کاروائی کو جلد اختتام تک پہنچایا۔ ایک جیسی نوعیت کے

بیانات کی موجودگی میں ضروری تھا کہ شخصی اعتباری حیثیت کو اور بیان دہندگان کے معاشرتی مقام اور ان کی عام شہرت کو دیکھا جائے۔ واضح ہے کہ اس پہلو سے ایک جج دوسروں سے بڑھ کر قابل اعتبار تھا۔ بالخصوص اس وجہ سے اس کا مجرم ہونا ثابت ہوتا تھا کہ اس نے اپنی ملازمت کے دوران کبھی کسی ہیری پھیری کا ارتکاب نہ کیا تھا' جس سے اس کے ناقابل اعتبار ہونے کا شبہ پیدا ہو سکتا۔ یوں لکھا تھا فیصلے میں۔

عمر قید۔ اس کو بلا تاخیر جیل بھیج دیا گیا۔

تین دنوں کے بعد وہ دولت میں نہا رہا تھا۔ کیونکہ ایک پبلک نوٹری نے اس پر انکشاف کیا کہ وہ اس شخص کی جائیداد کا وارث تھا، جس کا وہ قاتل سمجھا جاتا تھا' پبلک نوٹری نے اس شخص کی، جو مر چکا تھا، تحریر پڑھ کر سنائی، جس میں اس نے اپنی خودکشی کا ذکر کیا تھا۔ کروڑ پتی نے لکھا تھا کہ وہ خودکشی ایک ایسے طریق سے کرے گا، جو اسے پر اسرار بنا دے گا۔ اس کا واحد وارث وہ شخص ہو گا، جسے اپنے آپ کو اس کے قاتل کے طور پر سزا حاصل کرنے میں کامیابی ہو جائے گی۔ صرف اس صورت میں اس کی وصیت پر عمل کیا جا سکتا تھا۔

سابق جج بہت مسرور ہوا اور قید خانے میں بند رہا۔ البتہ ابھی اسے مقدموں کا سامنا کرنا تھا، جھوٹی قسم اٹھانے کے سبب اور اپنے عہدے کے غلط استعمال کے باعث اور ایسے دوسرے الزامات کے تحت۔ دولت البتہ اس سے کوئی نہ چھین سکتا تھا۔ جج وہ اب کبھی نہیں بن سکتا تھا، مگر اسے اس بات کی پرواہ نہ تھی، کیونکہ وہ کروڑ پتی بن چکا تھا۔

قید خانے میں بند ہونے کے کچھ مثبت پہلو بھی تھے۔ یہ چیز اس کا باقی ملزمان سے بچاؤ کرتی تھی، جو سارے کے سارے مقتول کے دوست تھے اور جن کا غیض و غضب ان کے دھمکیوں سے بھرے ہوئے خطوط سے عیاں تھا۔

آخر انہوں نے کیوں ایک شخص پر سمجھوتہ نہ کیا اور رقم کو آپس میں تقسیم کر لیا؟ حسد؟ بے اعتباری؟ واضح ہے کہ مرنے والے کو یہ سوچ کر خوب مزہ آیا ہو گا کہ اس کے دوست، جنہیں اس نے فرداً فرداً اپنی وصیت سے آگاہ کیا تھا، ایک دوسرے کے خلاف لڑیں گے۔ پبلک نوٹری واقع میں بہت قابل اعتبار آدمی نکلا، جس نے اس

قضیئے میں دخل دینا پسند نہ کیا۔

ایسے خیالات اس شخص کے دماغ میں اٹھتے رہے، جو اڑھائی ملین نقد رقم اور بانڈز کا مالک تھا۔ اس نے جیل کے کارندے کو حسب معمول رشوت دی تاکہ اسے شام کے کھانے کے ساتھ پودینے کی چائے کی بجائے شراب دیا کرے۔

سابق جج اس چیز کو سمجھنے سے کہ اسی ہفتے پبلک نوٹری کی لاش ملی، اسی طرح قاصر تھا، جس طرح وہ اخبار، جس میں اس نے یہ خبر پڑھی تھی۔

پیٹر ایبنر
Peter Ebner

قسمت کا فیصلہ استنبول میں

وہ استنبول آیا تھا بالآخر ایک قرار واقعی چانس کی خاطر۔ وہ لاپروائی سے تعمیر کردہ ہوائی اڈے کو، جس کے ہال کی اونچائی بمشکل تین میٹر تھی، اور خط استوا کی گرمی کو اپنے پیچھے چھوڑتے ہوئے ایک کھڑکھڑاتے ہوئے اور چنگاڑتے ہوئے عفریت میں، جو معجزانہ طور پر حرکت کر رہا تھا اور یقیناً بے تحاشا پٹرول پھونک رہا تھا، شہر میں پہنچا اور پیرا کی طرف چل دیا۔ اس نے قدیم پیلس ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لیا اور اپنا سوٹ کیس وہاں پر چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

گلاتا پر پہنچا، تو سب سے پہلے تو اسے بھاری ٹریفک نے مرعوب کیا، جو تقسیم میدان کی سمت میں جا رہا تھا۔ لمبی چوڑی سوچ بچار کے بغیر اس نے فوراً اس کام کو عمل میں لانا چاہا، جس کی خاطر وہ آیا تھا۔ قدم فٹ پاتھ سے نیچے دھرا اور بغیر دائیں یا بائیں طرف دیکھنے کے کشادہ سڑک کو عبور کرنے لگا۔ مگر لا حاصل۔ بریکیں لگیں، پہیے جام ہوئے، کاروں کی کھڑکیوں میں سے باہر ڈھلکتے ہوئے مردوں نے برا بھلا کہا اور بس۔ دوسری طرف کے فٹ پاتھ پر اس نے سوچا کہ اس کو پھر ایک بار ناکامی کا منہ دیکھنے پڑا تھا۔ ترکوں کے رد عمل کی سرعت کو مد نظر نہ رکھنا اس کی بیوقوفی تھی، وہ وہاں سے آگے نکل گیا۔

دائیں ہاتھ کی تنگ گلیوں میں سے گزرتا ہوا، جہاں پر قدیم چوبی مکانوں کی پہلی منزل کی بڑی کھڑکیوں میں لکڑی کی جالیاں بنی ہوئی تھیں، وہ بوسپورس کی طرف نیچے اترتا گیا اور ساحلی سڑک پر شہر کی سمت میں چلتا اور اپنے آپ پر غصہ کھاتا رہا۔ کیونکہ سمندر کی تنگ رود بار پر نظر پڑنے پر اسے یاد آیا کہ اسے پیرا کی آتی تھی اور اس

کو پتہ تھا کہ وہ پانی کے کنارے اپنا وقت محض ضائع کر رہا تھا۔

مگر مینار ؟ اسے یاد آیا کہ دائیں ہاتھ کی طرف مڑ کر اوپر کی جانب یقیناً وہ موٹا مینار مل جائیگا۔ اس نے دائیں ہاتھ کا رخ کیا اور یونانیوں کے قدیم محلے کی بے حد تنگ اور گندی گلیوں میں سے گزرتا ہوا اوپر کو چڑھتا گیا۔ داخلے کا ٹکٹ خرید کر وہ مشہور عالم گلاتا مینار پر چڑھ گیا۔ مگر بے سود۔ ان بے وقوفوں نے ایک کئی میٹر اونچا جنگلہ بنا ڈالا تھا، جس پر انسان چڑھ ہی نہیں سکتا۔ جنگلہ مینار کے نیچے سے دکھائی نہیں دیتا تھا۔ واضح طور پر ان کے لئے ہر روز وہاں نیچے امید کا دامن کھو دینے والوں کو اٹھانا ایک بوجھ تھا۔ اور پھر ہر بار کی صفائی۔

شہر کے اس خوش نما منظر پر، جو سرائے سے لے کر ایوب تک پھیلا ہوا ہے، ایک نظر ڈالنے یا ایک منٹ کے لئے بھی اس کی طرف توجہ کرنے کے بغیر وہ مینار سے نیچے اتر گیا۔ اور وہاں سے تھوڑے فاصلے پر نچلی طرف واقع کشتیوں کے پل کی طرف گیا۔ وہاں پر فیری بوٹ، جو جزیرے سے آتی ہیں، آن کر کھڑی ہوتی ہیں۔ تھوڑی دیر میں وہ چھوٹی سی گودی پر کھڑا تھا۔ اور لکڑی کے جنگلے کے پیچھے یقیناً ایک سو سے زیادہ لوگ اگلی کشتی کے انتظار میں کھڑے تھے۔

جہاز کی آمد میں پندرہ منٹ لگ گئے۔ اب وہ گودی کے پشتے سے صرف چند میٹر دور تھا۔ اس نے باڑ کو پھلانگا اور جہاز کی طرف دوڑا۔ مگر دوسرے ہی لمحے جہاز کی کمپنی کے ایک ملازم نے اسے گلے سے پکڑا، پیچھے کی طرف کھینچا اور قابو میں کر لیا۔ لوگ شور مچانے لگے، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وہ دوسروں سے آگے نکلنا چاہتا تھا، جب کہ اس نے ہر چیز کی پلاننگ کی تھی۔ اگر وہ ایک بار گودی کے پشتے اور جہاز کے درمیان کود جاتا، تو یقیناً پس کر مارا جاتا۔ جب جہاز کے ملازم نے اس کو چھوڑا، تو وہ بغلی دروازے سے باہر نکل کر پل پر سے گزرتا ہوا پرانے استنبول میں داخل ہوا۔ ریلوے اسٹیشن ؟ اور وہ سوچنے لگا کہ کیا اسے وہاں پر قسمت آزمائی کرنی چاہیئے۔ ہاں، مگر میں اس شہر میں کیوں آیا ہوں۔ گاڑی کے سامنے انسان اپنے آپ کو دنیا کے ہر ملک میں پھینک سکتا ہے۔ جہاز کی ناکامی کے بعد اس کے اعصاب اور پھر اس کا حافظہ اب جا کر کام کرنے لگے تھے۔

واضح ہے کہ نام نہاد عیسائی مغربی دنیا یا امریکہ میں ڈاکٹر آخری لمحے تک میری زندگی کو بچانے کے لئے جدوجہد کریں گے۔ اور بچاؤ کے سب سے آخری امکان تک اس سے ہاتھ اٹھانے کا نام نہ لیں گے۔ اگر میں یہاں پر سخت زخمی ہو جاؤں اور فوراً نہ مروں، جس کا امکان موجود ہے، کیونکہ علم شماریات کا کہنا ہے کہ ہر تیسری یا چوتھی کوشش کامیاب رہتی ہے۔ تو یہاں کے ڈاکٹر یقیناً قسمت کہہ کر مجھے مرنے دیں گے۔ خوب، تو پھر چلتے ہیں۔ اور وہ ریلوے اسٹیشن کے پاس سے گزرتا ہوا آیا صوفیا تک چلتا گیا۔ اس نے معبد کو بائیں ہاتھ پر چھوڑا اور بڑے بازار میں داخل ہو گیا۔

دوکانداروں اور ان کے گاہکوں کی گہما گہمی وہاں کی دھیمی روشنی کے باعث بہت حد تک دبی ہوئی لگ رہی تھی۔ اور قدیمی ہالوں میں باہر سڑکوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ خاموشی محسوس ہو رہی تھی۔ خراماخراما وہ کپڑوں کی دوکانوں کے پاس سے گذرا۔ پھر شیشے کی دوکانوں اور مسالے والوں کے پاس سے، یہاں تک کہ وہ بازار کے درمیان میں پہنچ کر جوہریوں کے کوچہ میں کھڑا تھا۔

مجھے دنیا کی آسان ترین بات اس سے پہلے کیوں نہ سوجھی! واضح ہے کہ یہ لوگ مسلح ہیں۔ جو کچھ مجھے کرنا ہو گا، وہ اتنا مشکل نہیں ہو سکتا۔ میں ایک بڑی دوکان میں داخل ہوں گا۔ کونٹر کے شیشے کو توڑ ڈالوں گا، قیمتی ترین چیزوں میں سے مٹھی بھر اٹھاؤں گا، بد دلی کے ساتھ بھاگوں گا اور چند ہی لمحوں میں مجھے ایک گولی پچھاڑ کر رکھ دے گی۔

اس کے بعد اس نے بالکل تردد نہ کیا۔ اعلیٰ ترین دوکان جو اسے نظر آئی، اس میں داخل ہوا۔ شیشے کو توڑنے کی ضرورت پیش نہ آئی، کیونکہ اتفاقاً ایک گاہک کے سامنے کونٹر پر ایک طشتری رکھی تھی، جس پر سونے کے وزنی ہار، جن میں بہترین زمرد جڑے ہوئے تھے، بڑی بڑی ڈائمنڈوں سے مرصع انگوٹھیاں، یاقوت اور لعل سے مزین بازو بند پڑے تھے۔ اس کے پیچھے صرف ایک سیلز مین کھڑا تھا۔ جس نے نئے آدمی کو اندر آتا دیکھ کر طشتری کو مضبوطی سے پکڑ لیا، مگر اس پر رکھے ہوئے مال کو نہ سنبھالا۔

اگلے ہی لمحے میں ہمارے دوست نے ایک بنجہ بھر کر اپنے کوٹ کی بائیں جیب میں ٹھونس لیا۔ دوسرا بھرا ہوا بنجہ دائیں جیب میں غائب ہو گیا۔ اور پھر ایک بار اس نے بنجہ مارا، مگر اگلے ہی لمحے وہ باہر کی طرف لپکا اور قالین بافوں کے کوچہ میں سے بھاگتا ہوا... کچھ ایسا تیز بھی نہیں... بازار کے نچلے گیٹ کی طرف نکل گیا۔ پھر اس نے ایک گولی چلنے کی آواز سنی، جس کے وہ انتظار میں تھا۔ اس کے بعد دوسری اور تیسری گولی۔ وہ بھاگتا چلا گیا، رستے میں یہاں اور وہاں زیورات گراتا ہوا جنہیں وہ اپنے ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے تھا۔ باقی ماندہ کو اس نے جیبوں میں ٹھونس لیا۔ اسے یہ احساس ہوا کہ لوگوں نے دیکھا تھا کہ بھاگتے ہوئے اس سے بعض اشیاء گر گئی تھیں اور یہ کہ وہ قالینوں والی دوکانوں میں سے جھپٹ کر نکلے تھے، ڈھونڈنے لگ گئے تھے، زمین پر ادھر ادھر کھسک رہے تھے اور اس طرح پیچھا کرنے والوں کے رستے میں روک بن رہے تھے، یہاں تک کہ آخر میں انسانوں کے ایک گچھے نے قالین بافوں کے کوچہ کو مکمل طور پر جام کر دیا تھا۔

وہ رک گیا۔ جھگڑنے، شور مچانے والوں اور گالیاں بکنے والوں کو کچھ دیر تک تکتا رہا۔ ایک اور فائر... اب، کے شاید رستہ بنانے کے لئے... پھر اس کا پیچھا کرنے والوں نے رستہ بنا لیا اور اس کے پاس سے دوڑتے ہوئے بازار کے نچلے گیٹ کی طرف نکل گئے، جب کہ اس نے خراماخراما اور کچھ سوچتے ہوئے اوپر والے گیٹ کا رخ کیا۔

گیٹ کے پاس، جس میں سے وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اندر داخل ہوا تھا، تھکے ماندے گاہکوں کے لئے رکھے ہوئے بنچوں میں سے ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ کوٹ کی جیبوں کو اسے تھامنا پڑا، جو کم و بیش ایک ایک کلوگرام بوجھ کے سبب نمایاں طور پر لٹک رہی تھیں۔

چند لمحوں کے لئے اس نے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ اور جب دوبارہ کھولیں، تو اس نے دیکھا کہ ایک معزز دکھائی دینے والا بوڑھا مسلمان امام اس کے پاس آن بیٹھا تھا۔ لمبے سفید بال اس کے سر بند میں سے، جو پگڑی، ترکی ٹوپی اور یورپین ہیٹ کے بین بین لگتا تھا، جھانک رہے تھے۔ مگر ہمارے دوست نے دیکھا کہ وہ

شخص اسے اپنی زمین تک لٹکتی ہوئی کالی چادر کو سامنے کی طرف ہاتھ سے تھامے ہوئے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ پہلو سے تک رہا تھا اور شریک جرم بھیدی کی مانند سر کو ہلا رہا تھا۔ وہ چھلانگ لگا کر اٹھنا اور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ مگر نہیں، اس نے سوچا، شاید میری قسمت میں ایک آخری موقعہ لکھا ہوا ہے۔ بوڑھا پولیس کو بلائے گا اور مجھے بعد میں فرار ہوتے ہوئے پھر ایک چانس ملے گا۔

مگر وہ بے حد حیران ہوا، جب امام نے، جسے وہ اس عرصے میں لپنے خیالات میں یہ نام دے چکا تھا، اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھا اور بہترین فرانسیسی میں کہنے لگا: ڈریں نہیں میرے دوست۔ میں ابھی بازار میں سے گزر رہا تھا اور میں نے سب کچھ دیکھا ہے۔ اس کے باوجود ڈریں نہیں میرے دوست۔ اب آپ امیر آدمی ہیں اور میں آپ کے ساتھ اس بات پر خوش ہوں۔ کیونکہ جوہری، جس کے پاس آپ گئے تھے، وہ نہ صرف بے حد حریص ہے، بلکہ ایک نہایت رذیل بد معاش ہے۔ دیکھیں اس کی یہاں پر قریب ہی ورکشاپ ہے، جہاں پر وہ لپنے مزدوروں کا استحصال خون پینے تک کرتا ہے۔ وہ اس کے علاوہ تین نائٹ کلبوں کا مالک ہے، جہاں پر دیہات کی معصوم دوشیزاؤں کو برائے نام کپڑوں میں یا بالکل ننگی ہو کر مردوں کے سامنے ناچنے پر مجبور کرتا ہے۔ پھر کہا جاتا ہے کہ شاہراہ استقلال کے سرے پر چکلہ بھی اس کا ہے۔ ہاں، جو کچھ اس کے ساتھ بیتا ہے، میں اس پر خوش ہوں۔

اور جہاں تک آپ کا تعلق ہے میرے دوست۔ بوڑھے نے تھوڑے وقفے کے بعد کہا۔ آپ نے ابھی ابھی بہت بڑا رسک لیا تھا۔ اس لئے آپ یقیناً بے حد نا امیدی کا شکار ہوں گے۔ ہاں، میرا خیال ہے کہ قسمت نے آپ کے ساتھ پہلے وقتوں میں بہت بے دردی کا سلوک کیا ہوگا۔ وگرنہ آپ اتنی جرأت مندی کا قدم نہ اٹھاتے۔ مگر اب آپ امیر ہیں۔ اور دیکھیں، جہاں تک جوہری کا اور آپ کا تعلق ہے، ہم اسے بس قسمت کا نام دیتے ہیں۔ اور اس میں اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ ایک کافر کی قسمت جاگ اٹھے۔ آخر کیوں نہیں؟ پھر بوڑھا اٹھا اور بغیر مڑ کے دیکھنے کے سڑک کی طرف گیا اور جلد ہی آنے جانے والے لوگوں میں گم ہو گیا۔

پندرہ منٹوں کے بعد ہمارا دوست بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ بازار کو اپنی پشت پر

چھوڑتے ہوئے سڑک پر تھوڑا اوپر جا کر بائیں ہاتھ پہ گھوم گیا اور خراماں خراماں گیا صوفیا کی طرف گیا۔ اس بات پر افسوس کرتا ہوا کہ یہ پرانا کھنڈر آج کل نہ تو گرجا گھر ہے اور نہ ہی مسجد بلکہ صرف میوزیم۔ اس کے باوجود وہ اندر چلا گیا۔ ایک کرسی ڈھونڈ لی اور اس پر بیٹھ گیا۔ محافظ کو بڑی سی ٹپ دی اور بیٹھے رہنے کی اجازت مل گئی۔ اس نے تھوڑے عرصے تک خدائی حکمت پر غور کیا، جو بعض اوقات انسان کی قسمت کو چلاتی اور اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ پھر اس نے فیصلہ کیا اس چیز کو قبول کرنے کا جو اسے تحفے میں ملی تھی، بیک وقت اس قدر فراوانی سے... زندگی اور امارت ایک ساتھ... مگر وہ کیوں کر اس سے بھاگے، اس نے سوچا۔ اس قابل تعظیم عمارت سے باہر نکلا۔ محل کے پاس سے گزرا اور سیدھی سڑک لے کر اسٹیشن جا پہنچا۔

اس نے اپنے سوٹ کیس کو پیلس ہوٹل میں چھوڑ جانے کا فیصلہ کیا۔ ٹکٹ خریدا اور ریل گاڑی میں اپنے وطن کے لئے روانہ ہو گیا۔ یوں بھی یہ بات غیر اہم تھی کہ وہ کیسے سفر کرتا ہے۔ استنبول بھی تو وہ ہوائی جہاز میں واپسی ٹکٹ کے بغیر آیا تھا' آخر میں صرف یہ بتانا باقی رہ جاتا ہے کہ وطن میں وہ اپنی قسمت کو قبول کرنے لگا، جیسی بھی وہ تھی اور اس طرح اپنی زندگی کے سفر پر بہتر سے بہترین کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے خوشی اور مسرت کے ساتھ اپنی ارضی زندگی کے خاتمے تک جیتا رہا۔

افسانہ نگاروں کا تعارف

۱۔ فرانز کافکا (Franz Kafka) (۱۸۸۳ء ۔ ۱۹۲۴ء) پراگ میں پیدا ہوا جو اس زمانے میں آسٹریا کا حصہ تھا اور جہاں پر جرمن زبان بولی جاتی تھی ۔ یہی کافکا کی مادری زبان تھی ۔ اس نے پراگ یونیورسٹی سے جرمن ادبیات اور قانون کی تعلیم حاصل کی اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری پائی ۔ نوکری اسے پنشن فنڈ کے محکمہ میں ملی ، جہاں پر وہ ٹی بی سے بیمار ہونے تک کام کرتا رہا ۔ ۱۹۱۷ء کے بعد کئی برسوں تک اسے مختلف جگہوں پر سینی ٹوریم میں علاج کے لئے رہنا پڑا ۔ ادب کو کل وقتی پیشہ کے طور پر اختیار کرنے کے صرف ایک سال بعد اس نے ۱۹۲۴ء کو ویانا کے سینی ٹوریم میں وفات پائی ۔ کافکا کی زندگی میں اس کے بہت کم ادب پارے شائع ہوئے ۔ مرنے سے قبل اس نے وصیت کی تھی کہ اس کی تحریروں کو جلا دیا جائے ۔ مگر اس کے دوست نے اس پر عمل نہ کر کے ادبی دنیا پر احسان کیا ۔ کافکا کا شمار بیسویں صدی کے اہم ترین قلمکاروں میں ہوتا ہے ۔ جس کی پیروی بے شمار ادیبوں نے کی ہے ۔ اس کا اثر آج دنیا کی اکثر زبانوں کے ادب پر نظر آتا ہے ۔

۲ ۔ ب ۔ ٹراون (B. Traven) سن پیدائش بلکہ اس کی شناخت کے بارہ میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا ۔ قیاساً وہ ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوا تھا ۔ اور اس نے ۱۹۶۹ء کو میکسیکو میں وفات پائی ، جہاں پر اس نے اپنی نصف سے زیادہ زندگی بسر کی تھی ۔ اس نے اپنی شناخت کو آخری وقت تک پوشیدہ رکھا ۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اس کا تعلق بائیں اشتراکی مزدوروں سے تھا ، جنہوں نے پہلی عالمگیر جنگ کے بعد میونخ میں ایک ریاست قائم کی تھی ، جس کو جبراً ختم کیا گیا اور بیشتر انقلابیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ۔ ٹراون کو ملک سے فرار ہونے میں کامیابی ہوئی ۔ آخر دم تک اس کی کتابیں مزدوروں کے لئے قائم کردہ بک کلب میں چھپتی رہیں ، جس کے مقاصد میں یہ شامل تھا کہ مزدوروں کے لئے مناسب ادب پیدا کیا جائے ۔ اس کی کتابوں کے تراجم اس کی زندگی میں پچیس زبانوں میں ہوئے اور وہ لاکھوں کی تعداد میں بکیں ۔ اس کے باوجود آج تک جرمن ادبیات کی تاریخ میں اس کا نام شامل نہیں کیا جاتا ۔ میرے نزدیک وہ جرمن ادب کے اہم ترین افسانہ اور ناول نگاروں میں سے تھا ۔

۳ - برتھولٹ بریشٹ (Bertolt Brecht) (۱۸۹۸ء - ۱۹۵۶ء) تعلیم اس نے میڈیکل کی حاصل کی - مگر ابتداء سے ہی شعر و شاعری اور ڈرامہ نگاری اس کا محبوب مشغلہ تھا - ۱۹۳۳ء میں ہٹلر کے بر سر اقتدار آنے پر ملک سے جلا وطنی - یورپ کے مختلف ملکوں میں قیام کے بعد بالآخر امریکہ میں ہالی وڈ میں قسمت آزمائی کے لئے پہنچا - سینیٹر میکارتھی کی کمیونسٹوں کے خلاف چلائی جانے مہم کا شکار ہو کر وہ جنگ کے بعد یورپ واپس لوٹا اور کمیونسٹ مشرقی جرمنی کو اپنا وطن بنایا - بریشٹ اس صدی کے جرمن ادب کے ستونوں میں سے ہے - اس نے شاعری میں نیا رنگ پیدا کیا اور ڈرامہ نگاری میں انقلاب برپا کیا - افسانہ نگاری کی طرف اس نے کم توجہ کی - تاہم اس کی کہانیاں اسے اس صنف میں بھی صف اول کے ادیبوں میں شمار کروانے کے لئے کافی ہیں -

۴ - انا زیگرس (Anna Seghers) (۱۹۰۰ء - ۱۹۸۳ء) جرمنی کے شہر مائنز میں پیدا ہوئی - تاریخ، آرٹ اور چینی ثقافت کی تعلیم حاصل کی اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری پائی - ۱۹۲۸ء میں جرمن کمیونسٹ پارٹی کی ممبر بنی - نازی پارٹی کے بر سر اقتدار آنے پر ۱۹۳۳ء میں ملک کو چھوڑنا پڑا - ۱۹۴۱ء تک فرانس میں، اس کے بعد جنگ کے خاتمے تک میکسیکو میں جلا وطنی کی زندگی بسر کی - جنگ کے بعد ۱۹۴۷ء میں واپسی پر مشرقی جرمنی کو اپنا وطن بنایا، جہاں پر ۱۹۵۲ء سے اپنی وفات تک وہ ادیبوں کی تنظیم کی صدر رہی - مرنے سے تھوڑا پہلے سال ہا سال کی بحث و تمحیص کے بعد اس کی جنم بھومی مائنز نے، جو مغربی جرمنی میں واقع تھی، اس کو اعزازی شہریت کا شرف بخشا - مگر انا زیگرس کو اپنا شہر دوبارہ دیکھنے کی مہلت نہ ملی - اس کا شمار جرمن ادب کی اہم ترین شخصیات میں ہوتا ہے -

۵ - ماری لوئیزے کاشنز (Marie Luise Kaschnitz) (۱۹۰۱ء - ۱۹۷۴ء) شاعر، افسانہ، ناول، ڈرامہ اور انشائیہ نگار تھی اور اپنی طرز کی واحد نمائندہ سمجھی جاتی تھی - نقادوں نے اس پر تحسین کے ڈونگرے برسائے - آخری برسوں میں روم میں مقیم تھی، جہاں پر اس نے وفات پائی - دوسری عالمگیر جنگ کے بعد جرمن معاشرے کے اندر پھیلے ہوئے خوف و ہراس کی اس سے بہتر نقشہ کشی اور کسی نے نہیں کی - مگر اس کی تحریروں میں عام طور سے مایوسی سے بڑھ کر رجائیت کا پیغام ملتا ہے -

۶ - ایلیاس کانیتی (Elias Canetti) (۱۹۰۵ء - ۱۹۹۴ء) اس کی پیدائش بلگاریہ کی تھی، جو اس زمانے میں عثمانی حکومت کے تحت تھا - کانیتی کی، جو اصلا اسپین سے نکالے گئے یہودیوں کی نسل سے تھا، ابتدائی تعلیم و تربیت جرمن ماحول میں ویانا میں ہوئی -

اگرچہ اس کی زندگی کا بیشتر حصہ انگلستان میں گذرا، اس نے لکھنے کے لئے ہمیشہ جرمن زبان کو ترجیح دی۔ اور اس زبان میں لافانی تخلیقات اپنی یادگار چھوڑی ہیں، جس کی بناء پر اس کو 1981ء میں نوبل پرائز برائے ادب ملا۔

۷۔ شٹیفان اندرس (Stefan Anders) (۱۹۰۶ء ۔ ۱۹۷۰ء) جرمن ادبیات کی تعلیم کولون، ییناا ور برلن یونیورسٹیوں میں حاصل کرنے کے بعد اپنی وفات تک اٹلی میں مقیم رہا۔ اس کا شمار جرمن ادب کے ممتاز ناول اور افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

۸۔ ہانس بینڈر (Hans Bender) (پیدائش ۱۹۱۹ء) شاعر، افسانہ، ناول اور انشائیہ نگار ہے۔ جرمن افسانوں پر ایک کتاب کا مصنف ہے۔ خود اس کا شمار جرمن ادب کے بہترین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ جنگ کے بارے میں لکھے جانے والے افسانوں میں، جن کا ایک مجموعہ اس نے خود ترتیب دیا ہے، اس کے ادب پارے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

۹۔ یواخیم زائیپل (Joachim Seyppel) (پیدائش ۱۹۱۹ء) ادبیات میں ڈاکٹریٹ۔ عیسائی تصوف اور فلسفے پر تحقیقی مقالہ جات۔ جنگی قیدی رہا، جہاں سے رہائی کے بعد ہارورڈ یونیورسٹی میں سیاسیات کے کورس میں شمولیت۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۰ء تک امریکہ میں جرمن ادبیات کا پروفیسر رہا۔ جرمنی واپسی پر مغربی برلن میں، ۱۹۷۳ء سے مشرقی برلن میں رہائش اختیار کی۔ ۱۹۷۹ء میں مشرقی جرمنی کے ادیبوں کی تنظیم سے تنقید کرنے کی وجہ سے نکالا گیا اور تین سالوں کے ویزے پر ہمبرگ میں آن بسا، جہاں پر ہماری دوستی کا آغاز ہوا۔ بیس کتابوں کا مصنف ہے، جس میں سے ایک درجن ناول ہیں۔ متعدد امریکی ناولوں کا ترجمہ اس کے قلم کا مرہون منت ہے۔

۱۰۔ وولف ڈیٹریش شنرے (Wolfdietrich Schnurre) (۱۹۲۰ء ۔ ۱۹۸۸ء) جرمن ادب کے افسانہ نگاروں کی صف اول میں سے تھا۔ مجھے اس کے ہمراہ ایک سیمینار میں اکتوبر ۱۹۸۸ء کو تقریر کرنے کی دعوت ملی تھی۔ مگر بدقسمتی سے شنرے اس تقریب سے تھوڑا پہلے اچانک وفات پا گیا اور میری اس سے ملاقات کی حسرت دل ہی دل میں رہ گئی۔ اس سے زیادہ شاید کسی دوسرے جرمن ادیب نے افسانہ نگاری کی صنف پر توجہ نہیں دی۔

۱۱۔ ایریش فریڈ (Erich Fried) (۱۹۲۱ء ۔ ۱۹۸۸ء) ویانا (آسٹریا) میں پیدا ہوا۔ سترہ برس کی عمر میں نازیوں کی بربریت کی وجہ سے ملک سے ہجرت کرنی پڑی۔ باقی

زندگی اس نے لندن میں گذاری، جہاں پر وہ ایک عرصے تک بی، بی، سی کے جرمن پروگرام سے وابستہ رہا۔ فریڈ بنیادی طور پر شاعر اور مترجم تھا۔ اس نے شیکسپیر کے سترہ ڈراموں کو اور تھوماس ڈلن کی شاعری کو جرمن میں ڈھالا۔ میں نے اس کی نظموں کے تراجم اردو میں کئے ہیں۔ "جیون سائے: جرمن شاعر ایریش فریڈ کی ایک سو نظمیں" (۱۹۹۳ء)۔

۱۲۔ ہا(نس) ک(ارل) آرٹمن (H. C. Artmann) (پیدائش ۱۹۲۱ء، ویانا آسٹریا) وہ شاعر، افسانہ، ڈرامہ نگار اور مترجم ہے۔ اس کو جرمن ادب میں ایک منفرد حیثیت حاصل ہے۔ اس کی کہانیاں اس کے سدا جوان تخیل کی پیداوار ہیں، جن کے پیچھے کچھ بھی نہیں پایا جاتا یا جہان آباد ہیں، کون جانتا ہے؟ وہ بہت سی زبانیں جانتا ہے، بالخصوص چھوٹی زبانیں، جن کی طرف عام طور سے لوگ توجہ نہیں دیتے۔ ان زبانوں سے اس نے تراجم بھی کئے ہیں۔ زبان کے نت نئے تجربے کرنا اس کا مرغوب مشغلہ ہے۔

۱۳۔ وولف گانگ بورشرٹ (Wolfgang Borchert) (۱۹۲۱ء - ۱۹۴۷ء) دوسری عالمگیر جنگ کے بعد کے جرمن ادب کا اولین افسانہ اور ڈرامہ نگار تھا۔ صرف بیس برس کی عمر میں جنگ میں جھونک دیا گیا اور روس کے محاذ پر زخمی ہوا۔ اپنے خطوں میں ہٹلر اور نازی جرمنی پر تنقیدی تبصروں کے سبب قید ہوا اور موت کا سزاوار قرار پایا، مگر معافی پائی۔ دوسری بار روس کے محاذ پر بھیجا گیا۔ اب کے کمزور صحت آڑے آئی اور فوج سے نجات ملی۔ جنگ کے خاتمے پر ٹی، بی کا مریض بن چکا تھا۔ اب فاقہ کشی نے صحت بالکل برباد کر دی۔ موت آنکھوں کے سامنے تھی، مگر اس نے ہار ماننے سے انکار کرتے ہوئے دن رات ایک کر کے لکھنا شروع کیا، جیسے موت کے ساتھ شرط لگا رکھی ہو۔ صرف دو برسوں کی تخلیقات کے سبب، جن کا موضوع جنگ اور بے انصافی ہے، اسے جرمن ادب میں عزت کی جگہ ملی۔ جرمنی میں پہنچنے کے بعد جرمن ادب سے میرا سب سے پہلا تعارف اس کے افسانوں کے ذریعہ ہوا تھا اور اس کی شاہکار کہانی "اس منگل کے روز" اس زبان سے میرا پہلا ترجمہ تھا، جسے ہفتہ وار "قندیل" لاہور نے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا تھا۔

۱۴۔ والٹر ینز (Walter Jenz) (پیدائش ۱۹۲۳ء) ابتداء ناول نگاری اور داستانوں سے کی، مگر آہستہ آہستہ نقاد بنتا چلا گیا۔ اپنی ریٹائرمنٹ تک وہ ٹیوبنگن یونیورسٹی میں کلاسیک ادبیات پڑھاتا رہا۔ اس کے علاوہ وہ جرمن یونیورسٹیوں کی واحد پروفیسر شپ برائے بلاغت پر فائز تھا۔ اسے جرمن کلچر کی حدود میں اس موضوع پر اتھارٹی سمجھا جاتا ہے۔ جرمن پین کلب اور بہت سی دوسری انجمنوں اور اکادمیوں کی سربراہی کا اسے شرف حاصل ہے۔

۱۵ - ایوازلر (Eva Zeller) (پیدائش ۱۹۲۳ء) دوسری جنگ عظیم کے بعد ۱۹۵۶ء تک مشرقی جرمنی میں، پھر چھ برسوں تک جنوبی افریقہ میں قیام کے بعد ۱۹۶۲ء سے مغربی جرمنی میں رہائش اختیار کی ۔ ایوازلر ان محدودے چند خاتون افسانہ نگاروں میں سے ہے، جنہیں جرمن ادب کے ایوانوں میں اپنے لئے ایک مستقل جگہ پیدا کرنے میں کامیابی ہوئی ہے ۔

۱۶ - زیگفریڈ لینز (Siegfried Lenz) (پیدائش ۱۹۲۶ء) فلاسفی۔ تاریخ ادبیات اور انگریزی ادب کی تعلیم حاصل کی ۔ اس کی پیدائش اس علاقے کی ہے، جو آج کل پولینڈ میں شامل ہے ۔ جنگ کے بعد اس نے ہمبرگ کو اپنا وطن بنایا، جہاں پر ہماری پہلی ملاقات ۱۹۶۴ء میں ہوئی، جب اس نے اپنی کہانی "لاپرواہ" یونیورسٹی کے اس ہوسٹل میں پڑھ کر سنائی، جہاں پر میں اس زمانے میں مقیم تھا ۔ لینز کا شمار جرمن ادب کے مشہور ترین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے ۔ اس کو جرمن زبان کا صاحب طرز ادیب مانا جاتا ہے ۔

۱۷ - ہائنر مولر (Heinar Müller) (پیدائش ۱۹۲۹ء) بنیادی طور پر ڈرامہ نگار اور ڈرامہ ڈائرکٹر ہے اور اس فن میں لاثانی گنا جاتا ہے ۔ اس کے افسانے بھی ڈرامائی تیکنیک کے مرہون منت ہوتے ہیں ۔ وہ اپنے اختصار اور سادگی بیان کے باوصف گہرائی اور گیرائی کے حامل ہوتے ہیں ۔

۱۸ - ماریو سینیشی (Mario Szenessy) (۱۹۳۰ء - ۱۹۷۶ء) یوگوسلاویہ میں پیدا ہوا، مگر ماں باپ ہنگری کے رہنے والے تھے ۔ تعلیم اس نے سلاوین اور جرمن ادبیات کی حاصل کی، جس کے بعد دیہات میں مدرس رہا ۔ پھر سیگیڈ یونیورسٹی میں روسی زبان پڑھانے پر مامور ہوا ۔ ۱۹۶۳ء میں تھوماس من پر اپنے تحقیقی مقالہ کی تکمیل کے لئے وظیفے پر جرمنی آیا اور یہاں کا ہی ہو رہا ۔ اتفاق ایسا تھا کہ وہ چار برسوں تک ہمارا ہمسایہ تھا وہ اگرچہ غیر ملکی تھا اور آخر تک جرمن زبان کا صحیح لہجہ نہ اپنا سکا، مگر اس کا شمار جرمن ادب کے اہم معاصر ادیبوں میں ہوتا ہے ۔

۱۹ - ہربرٹ ہیکمن (Herbert Heckmann) (پیدائش ۱۹۳۰ء) فلاسفی، تاریخ اور جرمن ادبیات میں ڈاکٹریٹ ۔ جرمنی اور امریکہ میں ادبیات کا پروفیسر رہا ۔ اب "آزاد ادیب" ہے، گویا کل وقتی ادب لکھنے کا پیشہ اپنائے ہوئے ہے ۔ ناول نگاری کے ساتھ ساتھ اس نے ہمیشہ افسانہ نگاری کو بھی اہمیت دی ہے ۔

۲۰۔ روزالی یگی (Rosali Jäggi) (پیدائش ۱۹۳۱ء۔ برن، سوئیٹزر لینڈ) تعلیم بازل یونیورسٹی میں پائی۔ پیشے کے اعتبار سے مدرسہ کی استانی ہے۔

۲۱۔ گنتھر سوئیرن (Günter Seuren) (پیدائش ۱۹۳۲ء) سکول چھوڑنے کے بعد صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ ۱۹۵۵ء سے "آزاد ادیب" ہے۔ شاعر اور ناول نگار ہے۔ اس کے علاوہ ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے لئے ڈرامے لکھتا ہے۔

۲۲۔ ایکارٹ کلیسمن (Eckart Klessmann) (پیدائش ۱۹۳۳ء) بنیادی طور پر شاعر اور سوانح نگار ہے۔ افسانے بہت کم لکھے ہیں۔ اب تک صرف ایک ناول لکھا ہے، جو ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ انیسویں صدی پر بہت سی تاریخی کتابوں کا مصنف ہے۔ میری طرح ہمبرگ کا باسی اور میرے دوستوں میں سے ہے۔

۲۳۔ پیٹر بخسل (Peter Bichsel) (پیدائش ۱۹۳۵ء۔ لوتسرن، سوئیٹزر لینڈ) پہلا پیشہ مدرسی تھا، جسے عرصہ ہوا چھوڑ کر ادیب اور صحافی بن چکا ہے۔ کوتاہ نویس ہے، مگر جو چیز بھی لکھتا ہے، اس کو بہت قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ افسانہ نگاروں میں خاص مقام رکھتا ہے۔ ناول اب تک صرف ایک لکھا ہے۔ انشائیے، مضامین، ریڈیو ڈرامے اور فلم سکرپٹ۔ اس کے فرانکفورٹ یونیورسٹی میں دیئے ہوئے "خطبات بوطیقا" کو میں نے اردو میں ڈھالا ہے۔ "پیٹر بخسل: خطبات بوطیقا، افسانے" (۱۹۹۴ء)

۲۴۔ کرسٹوف میکل (Christoph Meckel) (پیدائش ۱۹۳۵ء) گرافک آرٹ اور مصوری کی تعلیم حاصل کی۔ لمبے عرصے تک فرانس اور کورسیکا میں مقیم رہا، اب برلن میں رہائش پذیر ہے۔ نظمیں، کہانیاں اور ریڈیائی ڈرامے لکھتا ہے۔ اس کی تحریروں پر ایکسپریشن ازم اور سریلزم کا نمایاں اثر ہے۔ معاصر جرمن ادب میں اسے اہم مقام حاصل ہے۔

۲۵۔ والٹر کاپاخر (Walter Kappacher) (پیدائش ۱۹۳۸ء۔ زالزبرگ آسٹریا) اس کی کہانیوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک منجھا ہوا افسانہ نگار ہے۔

۲۶۔ راحل ہوٹ ماخر (Rahel Hutmacher) (پیدائش ۱۹۴۴ء۔ زیورچ۔ سوئیٹزر لینڈ) یہ سریلسٹ افسانہ نگار خاتون اب جرمنی میں مقیم ہے۔

۲۷۔ ا۔ ی۔ مائیر (W.Y.Meyer) (پیدائش ۱۹۴۶ء لیز تھال۔ سوئیزر لینڈ) افسانہ نگار اور انشائیہ پرداز ہے۔ اب تک اس کے تین ناول چھپ چکے ہیں۔ اپنی کہانیوں میں ایک غیر مرئی دنیا میں اس قدر بے تکلفی سے داخل ہوتا ہے کہ قاری کو ذرہ بھر اچنبھا نہیں ہوتا۔

۲۸۔ گرڈ ہولٹز ہائمر (Gerd Holzheimer) (پیدائش ۱۹۵۰ء) پیشہ کے اعتبار سے جمنازیم کا استاد ہے۔ اس کی تیکنیک رپورتاژ سے مستعار ہے۔

۲۹۔ لٹز راتھے نو (Lutz Rathenow) (پیدائش ۱۹۵۳ء۔ ینا۔ مشرقی جرمنی) اس کا شمار کمیونسٹ حکومت کے مخالفوں میں ہوتا تھا۔ وہ اس حکومت کے خاتمے تک مشرقی جرمنی میں مقیم رہا۔ اس کی کہانیاں اور نظمیں اس ملک میں شائع نہ ہو سکتی تھیں اور صرف مغربی جرمنی میں چھپتی تھیں۔ مزاحمتی ادب کے زمرے میں اس کی تحریریں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

۳۰۔ پیٹر ایبنر (Peter Ebner) اس کی اس کہانی کے سوا میری نظر سے اس کی کوئی دوسری تحریر نہیں گذری، نہ ہی مجھے اس کی ذات کے بارے میں کچھ پتہ ہے۔



مترجم

منیر الدین احمد - پیدائش ۱۹۳۴ء، راولپنڈی - تعلیم پنجاب یونیورسٹی لاہور اور ہمبرگ یونیورسٹی (جرمنی) - ۱۹۶۰ء سے جرمنی میں مقیم - تحقیقاتی ادارہ "جرمن اورینٹ انسٹی ٹیوٹ" کے ریسرچ فیلو اور ہمبرگ یونیورسٹی کے استاد -

تصانیف :

تحقیق: اسلامی نظام تعلیم (انگریزی)

نہاد آموزش اسلامی (فارسی)

مولوی محمد فضل خان - ایک عالم ربانی کی سوانح حیات (زیر طبع)

خاتم الاولیاء محی الدین ابن عربیؒ (زیر طبع)

افسانے: زرد ستارہ (اردو)

شجر ممنوعہ (اردو)

تراجم: پاکستانی ادب (جرمن)

معاصر جرمن ادب (اردو)

جیون سائے - جرمن شاعر ایریش فریڈ کی ایک سو نظمیں (اردو)

منتخب جرمن افسانے (اردو)

منتخب جرمن نظمیں (زیر طبع)

پیٹر بخسل: خطبات بوطیقا، افسانے (اردو)

تراجم

پس پردہ گڑیا	(ایرانی افسانے)	ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی
محبت کی کہانی	(جرمن کہانیاں)	رتی سجاد
ایک عورت	(ترکی کے افسانے)	ڈاکٹر نثار احمد اسرار
گھاس کے میدانوں میں	(ناول انتون چیخوف)	انتظار حسین
ابن جبیر کا سفر	(سفرنامہ)	محمد خالد اختر
حوا کی بیٹی	(ناول پیرلوئی)	آغا بابر
آدمی جس نے اپنے آپ کو بھلا دیا	(جرمن کہانیاں)	منیر احمد
راکا داستان گو	(سفرنامہ ارلنگ کٹلسن)	جمشید مسرور

ISBN - 969 - 35 - 0584 - 0

Rs. 250.00